يرفع الله الذين امنوا منكم والذين اوتوا العلم درجت

مضامینِ قرآن

قلمی تخلیقات

پروفیسر حافظ احمد یار

ترتیب و تدوین

ڈاکٹر جمیلہ شوکت

الائیڈ بک سنٹر

34۔ اُردو بازار۔ لاہور

Marfat.com

15932
DATA ENTERED

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ

مضامینِ قرآن

قلمی تخلیقات

پروفیسر حافظ احمد یار رحمہ اللہ
سابق صدر شعبہ علوم اسلامیہ
پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور

ترتیب و تدوین

ڈاکٹر جمیلہ شوکت
ڈین کلیہ علوم اسلامیہ و شرقیہ
پنجاب یونیورسٹی، لاہور

الائیڈ بُک سنٹر
34۔ اُردو بازار۔ لاہور

Marfat.com

297.77
AHM
297.104
297
۷۳۲۹
۲ء
102

ناشر : الائیڈ بک سنٹر ' لاہور
فون : 7312346
مطبع : معراج دین پرنٹرز ' لاہور
فون : 7310070 - 7237013
کمپوزر: علی شیر ساجد ' محمد الیاس ' حافظ تنویر احمد حمزہ (حافظ کمپوزنگ سنٹر '
مین بازار فیصل پارک شاہدرہ ' لاہور)۔
تعداد : 500
اشاعت : نومبر 1999
باہتمام : مجلس فاضلین علوم اسلامیہ
اسلامک سنٹر ' قائد اعظم کیمپس
پنجاب یونیورسٹی ' لاہور۔

قیمت ----------
Rs 100

Marfat.com

فہرست

ابتدائیہ

مقدمہ

قرآنیات

۱- تعارف قرآن	۵
۲- سورۃ آل عمران	۲۶
☆ محکمات و متشابہات کی بحث	۵۱
☆ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت، معجزات، تعلیمات و وفات سے متعلق مباحث	۵۵
☆ مسلمانوں کی انفرادی اجتماعی کامرانی کے چند اصول	۶۶
۳- سورۃ النساء	۶۸
☆ تخلیق انسان	۸۴
☆ تعدد ازدواج	۸۹
☆ ملک یمین	۹۳
☆ اسلام کا قانون وصیت	۹۹
☆ مرد کی قوامیت	۱۱۲
☆ اطاعت رسولؐ	۱۲۶
☆ صلوٰۃ قصر	۱۳۵
☆ تدبر قرآن	۱۴۴
۴- تعارف سورۃ محمد	۱۵۱
۵- تعارف سورۃ الفتح	۱۵۵

Marfat.com

٦- تعارف سورۃ الحجرات ۱٦۴

۷- مشاہدہ کائنات ۱٦۷

۸- امر بالمعروف و نہی عن المنکر ۱۹۱

عقائد و عبادات

۱۲- عقائد ۲۱۸

☆ توحید ۲۱۹

☆ رسالت و آخرت ۲۴۵

۱۳- عبادات ۲٦۵

☆ نماز ۲٦۸

☆ زکوٰۃ ۲۷٦

☆ روزہ ۲۸۱

☆ حج ۲۸۵

☆ جہاد ۲۹۱

سیرت النبی ﷺ

۹- سیرت طیبہ کے ماخذ اور پاکستانی زبانوں میں تالیفات سیرت ۲۹٦

۱۰- عصر حاضر میں سیرت طیبہ کی اہمیت ۳۲۹

۱۱- عصر حاضر میں سیرت طیبہ کا مطالعہ اس کی ضرورت ۳۴۲

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائیہ

" مضامین قرآن " کا انتخاب استادِ محترم حافظ احمد یار صاحب کی ان درسی کتب سے کیا گیا ہے جو آپ نے ایف اے اور بی اے اسلامیات (Elective) اور (Optional) کے طلبہ کے لیے تحریر فرمائیں۔ اس اخذ و انتخاب کا بنیادی مقصد طلبہ اور عام قاری کو مختصر وقت میں دین اسلام کے بارے میں بعض بنیادی معلومات فراہم کرنا ہیں۔ موضوع کی مناسبت سے ان مضامین کو تین عنوانات کے تحت پیش کیا گیا ہے۔

حصہ اوّل قرآنیات پر مشتمل ہے۔ اس کا اولین مآخذ " دین و ادب" ہے۔ یہ کتاب موجودہ صدی کے ساتویں عشرہ میں مروج بی اے اسلامیات کے نصاب سے متعلق ہے۔ اس کتاب سے قرآن حکیم کی تدوین و حفاظت، سورۃ آل عمران کا تعارف اور اس سورۃ میں مذکور چند اہم مباحث کا انتخاب کیا گیا ہے۔

اسی حصے کا دوسرا مآخذ "دستور حیاء" ہے جو سورۃ النساء کے ترجمے اور تشریح و تفسیر پر مشتمل ہے۔ اس کتاب سے سورۃ النساء کا تعارف اور اس سورۃ میں مذکور چند اہم معاشرتی و اجتماعی مسائل مثلاً احکام وراثت، مرد کی قوامیت، اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ ایسے اہم مباحث کو اخذ کیا گیا ہے۔

حصہ اول کا تیسرا مآخذ "تفہیم آیات" ہے جو حافظ صاحب نے بی اے / بی ایس سی اسلامیات (اختیاری) کے طلبہ کے لیے استادِ مکرم ابو بکر غزنویؒ کے ساتھ بطور شریک مؤلف ۱۹۶۲ء میں شائع کی۔ اس کتاب سے سورۃ الفتح، سورۃ محمد اور سورۃ الحجرات کا تعارف ہدیہ ناظرین ہے۔

اس حصے کے آخری دو اہم موضوعات مشاہدۂ کائنات اور امر بالمعروف اور

Marfat.com

نہی عن المنکر ہیں جو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے ایف اے کے طلبہ کے لیے تحریر کردہ یونٹوں میں سے ہیں۔

حصہ دوم عقائد و عبادات سے متعلق ہے۔ یہ وہ یونٹ ہیں جو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی (اسلام آباد) نے حافظ صاحب محترم سے بی اے کے طلبہ کے لیے لکھوائے۔ اس میں سے تین بنیادی عقائد یعنی توحید، رسالت اور آخرت اور عبادات میں سے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد کو منتخب کیا گیا ہے۔

حصہ سوم سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہے۔ یہ وہ یونٹ ہیں جو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے حافظ صاحب سے بی اے اسلامیات (لازمی) کے طلبہ کے لیے لکھوائے۔

قبلہ حافظ صاحب کی کتب اور تحریروں کے علمی و فنی محاسن کے بارے میں استاذ محترم حافظ ادریس صاحب (سابق پرنسپل شالیمار کالج لاہور) نے "مقدمہ" میں معلومات فراہم کی ہیں۔ میں جناب حافظ ادریس صاحب کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری درخواست پر نہ صرف اس کتاب کا مقدمہ تحریر فرمایا بلکہ اس کی ترتیب و تسوید سے متعلق اپنے قیمتی مشوروں سے بھی نوازا۔

اس کتاب کے کمپوزر اور ناشرین میرے شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے کتاب قاری تک پہنچانے میں بھرپور تعاون کیا۔ اللہ کریم ان تمام قابل احترام بہنوں (بالخصوص حافظ صاحب کی چھوٹی صاحبزادی) اور بھائیوں کو بھی بہترین اجر سے نوازے جو اس منصوبے میں کسی نہ کسی طرح ہمارے ساتھ رہے۔

رب رحیم و کریم اس کتاب کو قاری کے لیے نافع اور استاد الاساتذہ حافظ صاحب علیہ الرحمہ کے لیے صدقہ جاریہ بنائے (آمین)۔

جمیلہ شوکت

Marfat.com

پیش لفظ

جناب پروفیسر حافظ احمد یارؒ سابق چیئرمین شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور، جن کی قلمی تخلیقات کو "مضامین قرآن" کے نام سے شائع کرنے کی سعادت حاصل کی جا رہی ہے، اپنے علم و فضل، محققانہ انداز تحریر، بلندی کردار اور گوناگوں اوصاف کی وجہ سے اپنے معاصرین میں امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔ انہیں دینی اور علمی حلقوں میں بہت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کے ہم عصر اساتذہ و علماء، رفقاء اور شاگرد ان کی زندگی میں ان کے علم و فضل سے فیض یاب ہوتے رہے۔ حافظ صاحب کا شاگرد ہونا بڑا اعزاز تصور کیا جاتا تھا کیونکہ ان سے فیض یافتہ ہونا اس بات کی سند تھی کہ وہ عربی اور علوم اسلامی پر حاوی ہے۔ مایہ ناز استاد کے مایہ ناز شاگرد ملک کی جامعات اور درس گاہوں میں نوجوانونان قوم کے قلوب و اذہان کو نور علم سے منور کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے قابل فخر استاد کے نام کو روشن کر رہے ہیں۔

حافظ صاحب موصوف آج ہمارے درمیان موجود نہیں مگر ان کی محققانہ، عالمانہ فاضلانہ تصانیف اور علمی و تحقیقی مقالات کے ذریعہ ان کا فیضان جاری و ساری ہے۔ "مضامین قرآن" ان کی پانچ ایسی نصابی کتب سے منتخب کئے گئے، میں جن میں سے تین نایاب ہو چکی ہیں۔ بظاہر یہ نصابی کتب ہیں مگر بہت بڑا علمی ذخیرہ ان میں محفوظ ہے۔ موصوف نے ان میں سے ہر ایک کتاب پر اتنی محنت کی جتنی آج پی ایچ. ڈی کے مقالے کے لیے بھی شاید نہ کی جاتی ہو۔ وہ اپنی کتاب دین و ادب کے دیباچے میں خود لکھتے ہیں کہ "کچھ لوگ مجھے کہتے ہیں کہ آپ کام

Marfat.com

چوروں کے لیے آسانیاں پیدا کرتے ہیں ۔ معیاری کتب تصنیف کرنے کا مقصد ہے نالائق کو لائق اور لائق کو لائق تر بنانا ہے"۔

ان کا انداز تحریر مسحور کن اور دل میں فوری اتر جانے والا ہے ۔ مشکل سے مشکل بات کو عام فہم اور سادہ ترین زبان میں بیان کرنے پر انہیں خاص ملکہ حاصل ہے ۔ لغوی اور نحوی تشریحات کو بھی خوبصورت سادہ زبان میں بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا ذرا بھر گرانی یا اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔ وہ آسان سے مشکل کی طرف جانے کے اسلوب کو اختیار کرتے ہیں ۔ مثلاً وہ لغوی معانی بتا کر پھر مادہ / مآخذ ' واحد و جمع اور تذکیر و تانیث کی طرف جاتے ہیں ۔ قرآنی آیات کا ترجمہ کرتے وقت وہ تمام رائج الوقت تراجم اور تفاسیر کو پیش نظر رکھتے ہیں اور ان سب کے محاسن کو یکجا کرنے میں کما حقہ کامیاب ہو جاتے ہیں ۔ حافظ صاحب کی علوم جدیدہ پر بھی گہری نظر تھی وہ قرآنی آیات کی تشریح میں حیاتیات ' طبیعات' فلکیات اور نفسیات کے مسلمات کے حوالہ جات پیش کرتے ہیں ۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جن کتب سے یہ مضامین منتخب کئے گئے ہیں ان کا مختصر تعارف کرا دیا جائے ۔

۱- دستور حیاء

یہ پنجاب یونیورسٹی کے بی اے اسلامیات اختیاری کے نصاب کی کتاب ہے جو سورۃ النساء کے ترجمے ' تفسیر اور مرکزی مضامین پر حاوی ہے ۔ پہلی مرتبہ ۱۹۶۴ء میں رفیق مطبوعات اردو بازار سے شائع ہوئی ۔ نصاب سے خارج ہونے کے بعد اس کی طباعت بند ہو چکی ہے ۔ اس میں تمام رائج الوقت تراجم و تفاسیر کی خوبیوں کو یکجا کرنے کے لئے ایک نیا انداز اختیار کیا گیا ہے ۔ سورہ کے مضامین کو بہت محققانہ و عالمانہ انداز میں عام فہم اور سادہ زبان میں تحریر کیا ہے۔

Marfat.com

۲- دین و ادب

یہ کتاب بھی پنجاب یونیورسٹی کے بی- اے اسلامیات اختیاری کے نصاب (۶۸-۱۹۶۷ء) پر مشتمل ہے - اس میں سورۃ آل عمران کا ترجمہ ' تفسیر اور مرکزی مضامین کے علاوہ " الملل و النحل " کے باب "آراء العرب فی الجاهلیة " اور معلقہ زہیرین ابی سلمی کے متن کی صحت و تحقیق اور معانی و مطالب سے متعلق مشکلات کی صحیح عقدہ کشائی میں اس کتاب کو شرف سبقت حاصل ہے - یہ پہلی مرتبہ ۱۹۶۳ء میں رفیق مطبوعات اردو بازار سے شائع ہوئی - نصاب تبدیل ہونے کے بعد اس کی طباعت بھی بند ہو چکی ہے -

۳- تفہیم آیات

سورۃ محمدؐ ' سورۃ فتح اور سورۃ حجرات کے تراجم ' تفسیر اور مضامین پر مشتمل بی-اے آپشنل کی کتاب ہے جس کی طباعت اب بوجوہ نہیں ہو رہی ہے -

۴- اسلامیات (اختیاری) برائے بی-اے ' علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

یہ سورۃ آل عمران کی تفسیر ہے جسے پانچ یونٹوں میں تقسیم کیا گیا ہے ترجمے لفظی اور بامحاورہ دونوں دیئے ہوئے ہیں ' خود آزمائی کے لیے سوالات ہر یونٹ کے بعد دیئے گئے ہیں - یہ کتاب ۱۹۸۹ء میں پہلی بار شائع ہوئی اور ابھی تک شائع ہو رہی ہے-

۵- اسلامیات (لازمی) برائے ڈگری کلاسز علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

اس کتاب میں حافظ احمد یار کے تحریر کردہ تین یونٹ اسلام کے بنیادی عقائد اور عبادات پر مشتمل مضامین ' دین اسلام کے عنوان سے شامل ہیں- یہ کتاب ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی -

مذکورہ بالا کتب کے انتہائی مختصر تعارف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ علمی سرمایہ شامل نصاب نہ ہونے کی وجہ سے طباعت سے محروم ہے اور اس کے

Marfat.com

تلف ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس علمی سرمائے کو محفوظ کرنے کی ایک ادنی کوشش "مضامین قرآن" کی اشاعت ہے۔

امید ہے نہ صرف اساتذہ و طلباء ان مضامین سے استفادہ کریں گے بلکہ ہر پڑھا لکھا انسان ، قرآنی آیات کے نور سے اپنے قلوب کو منور کر سکے گا کیونکہ حافظ صاحب مرحوم نے قرآن کی ابدی تعلیمات کو اپنے علمی انداز بیان سے آسان فہم اور پر تاثیر بنا دیا ہے۔ اللہ تعالی ان کی علمی خدمات کو ان کی بخشش اور بلندی درجات کا سبب بنائے۔ آمین

اس کار خیر کا موجب حافظ احمد یارؒ مرحوم کے رفیق محترم جناب ڈاکٹر شیر زمان صاحب چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل کی وہ خواہش ہے جس کا اظہار انہوں نے علم دوست شخصیت محترمہ ڈاکٹر جمیلہ شوکت صاحبہ ڈین کلیہ علوم اسلامیہ و شرقیہ پنجاب یونیورسٹی سے کیا تھا۔

محترمہ ڈاکٹر صاحبہ کی مساعیٔ جمیلہ کے نتیجے میں "مضامین قرآن" کی طباعت ممکن ہوئی۔ انہوں نے نایاب کتب کو حاصل کیا ، مضامین کا انتخاب فرمایا ، کمپوزنگ کرائی اور پروف ریڈنگ کی۔ انہی کی تحریک پر اراکین فاضلین علوم اسلامیہ اس کار خیر میں شریک ہوئے۔ اللہ تعالی انہیں اجر عظیم عطا فرمائے اور ہم سب کو حافظ احمد یارؒ کی صفات میں سے کچھ حصہ عطا فرمائے۔ آمین

خاک پائے ابرار

حافظ محمد ادریس

Marfat.com

قرآنیات

Marfat.com

تعارف قرآن

قرآن مجید وہ مقدس کتاب ہے جو خاتم النبین حضرت محمد ﷺ کو اللہ تعالی نے بذریعہ وحی انسانوں کو ہدایت کے لیے عطا فرمائی ۔ اسماء اللہ الحسنی کی طرح قرآن کریم کے نام بھی ۹۹ تک پہنچ گئے ہیں ۔ مگر سب سے زیادہ خاص نام اس کا ''کلام اللہ'' ہے اور سب سے زیادہ مشہور ''القرآن''۔

نزول قرآن

قرآن مجید آنحضرت ﷺ پر ایک دم (جملۃً واحدۃً) نازل نہیں ہوا ۔ بلکہ نجماً نجماً تئیس سال تک نازل ہوتا رہا ۔ سب سے آخری آیت الیوم اکملت لکم دینکم (المائدہ : ۳) بالاتفاق ۹ ذی الحجہ سن ۱۰ ہجری کو نازل ہوئی تھی ۔ سب سے پہلے اقرا باسم ربك الذی خلق ...(العلق : ۱) نازل ہوئی مگر اس کی تاریخ نزول صحت تعین کے ساتھ معلوم نہیں ۔ اتنا ضرور ہے کہ ربیع الاول ۴۱ ہجری ولادت نبوی سے رؤیائے صادقہ کا سلسلہ شروع ہو اور یہی بعثت کی ابتداء تھی ۔ چھ ماہ بعد غار حرا میں سورہ العلق کی پہلی آیات کے ساتھ نزول قرن اور وحی کا آغاز ہوا ۔ صحیح روایات اور خود قرآن کریم سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ نزول قرآن کی ابتداء ماہ رمضان میں ہوئی ۔ قرآن مجید (الانفال : ۴۱) سے اشارۃً یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنگ بدر اور (آغاز) نزول قرآن کا دن ایک ہی تھا ۔ اسی بنا پر بعض نے ۱۷ رمضان المبارک کو ہی نزول قرآن مجید کا آغاز قرار دیا ہے (۱)۔ اس صورت میں نزول قرآن کی کل مدت ۲۲ سال ۳ ماہ اور ۲۲ دن بنتی ہے ۔ جس میں سے ۱۲ سال ۵ ماہ

۱- تاریخ التشریع الاسلامی للخضری

Marfat.com

اور ۱۳ دن مکی دور کے اور ۹ سال ۹ ماہ ۹ دن (یکم ربیع الاول ۵۴ و لادت نبوی تا ۹ ذی الحجہ ۶۳ ولادت نبوی) مدنی دور کے ہیں۔

قرآن مجید وحی الٰہی ہے۔ وحی کے لغوی معنی "چھپا کر اطلاع دینا" ہیں۔ شرعی اصطلاح میں وحی سے مراد وہ خاص غیبی طریقہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کسی نبی تک کوئی بات پہنچاتا ہے۔ وحی کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں:-

۱- رؤیائے صادقہ یعنی سچے خواب کے ذریعے کوئی بات معلوم ہونا۔ ۲- کسی فرشتے وغیرہ کے دیکھے بغیر دل میں کوئی بات آجانا۔ ۳- فرشتے کا انسانی یا اپنی اصلی شکل میں آکر خدا کا پیغام دینا۔ ۴- ایک خاص کیفیت طاری ہونے کے بعد غیب سے کلام سننا (۱)۔ قرآن مجید زیادہ تر اسی آخری طریقے پر نازل ہوا۔ نزول وحی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اضطراب و استغراق کی ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ چہرۂ مبارک کا رنگ سرخ ہو جاتا اور سانس تیزی سے آنے لگتا تھا۔ سخت سے سخت سردی میں بھی پیشانی پر پسینہ پھوٹ نکلتا اور آپ سر جھکا لیتے تھے۔ ساتھ ہی آپ کو ایک بھاری بوجھ محسوس ہوتا۔ بلکہ اگر آپ نزول وحی کے وقت کسی اونٹنی وغیرہ پر سوار ہوتے تو جانور اس گراں وزن کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اور بیٹھ جاتا تھا۔ اس حالت میں آپ کو کلام الٰہی سنائی دیتا تھا۔ اور آپ اسے فوراً یاد کرنے کے لیے ساتھ ہی ساتھ جلدی جلدی دہراتے جاتے تھے۔ اس پر آپ کو یہ حکم دیا گیا کہ آپ قرآن سیکھنے میں جلدی کر کے زبان نہ ہلائیں بلکہ صرف متوجہ ہو کر تمام وحی سن لیا کریں۔ اس کے بعد آپ ایسا ہی کرتے اور وحی کی کیفیت ختم ہونے کے بعد آپ کو سب کچھ یاد ہو جاتا تھا (۲)۔

نزول وحی کے لیے کوئی وقت، جگہ یا مقدار وغیرہ مقرر نہیں تھی۔ سفر و حضر۔ دن رات میں جب اور جہاں حکم الٰہی ہوتا۔ جبرئیل حاضر ہو کر کلام الٰہی پہنچا دیتے۔ جو کبھی ایک

۱- دیکھیے الشوریٰ: ۵۱

۲- دیکھیے القیٰمۃ: ۱۶-۱۹ نیز طٰہٰ: ۱۱۴

Marfat.com

آدھ آیت ، کبھی پوری سورت اور کبھی متعدد سورتوں کی متعدد آیات ہوتی تھیں ۔ مختلف سورتیں اور آیات کسی واقعہ یا ضرورت کے مطابق نازل ہوتی رہتی تھیں ۔ اس واقعہ یا ضرورت کو ہی شان نزول کہتے ہیں ۔

قرآن کریم کی ترتیب نزول موجودہ ترتیب تلاوت سے مختلف تھی ۔ البتہ قرآن مجید کی تمام سورتوں کے نام اور آیتوں اور سورتوں کی موجودہ ترتیب توقیفی ہے یعنی خود آنحضرت ﷺ کی ہی بتلائی ہوئی ہے ۔ ہر نئی وحی کے بعد آپ صحابہ کو یہ بتا دیا کرتے تھے کہ ان آیات کو فلاں سورت کی فلاں آیت کے بعد پڑھنا ہے ۔ نمازوں میں سورتیں اور آیات آپ کی بتلائی ہوئی ترتیب کے مطابق پڑھی جاتی تھیں ۔ ہر سال رمضان کے مہینے میں آپؐ جبرئیلؑ کے ساتھ اس وقت تک کے نازل شدہ قرآن کا دورہ کرتے تھے ۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی کے آخری رمضان میں یہ دور دو دفعہ کیا گیا اسے عرضہ اخیرہ کہتے ہیں ۔ اس طرح حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی زندگی ہی میں قرآن کریم کی موجودہ ترتیب تلاوت مکمل ہو گئی تھی ۔ اگرچہ روایات میں قرآن کی ترتیب نزول کا بھی مکمل ریکارڈ موجود ہے ۔ اور تفسیر میں ہمیشہ اس ریکارڈ سے مدد لی جاتی رہی ہے ۔ مگر قرآن کی ترتیب تلاوت عہد رسالت سے لے کر آج تک وہی چلی آتی ہے جو آنحضورؐ نے خود مقرر فرما دی تھی ۔

حفاظت اور تدوین قرآن

قرآن کریم مع عربی الفاظ وحی الٰہی ہے ۔ جب بھی آنحضورؐ پر قرآن کا کچھ حصہ نازل ہوتا آپ کو وہ تمام عبارت حفظ ہو جاتی تھی۔ آپ نے ابتداء سے ہی اس بات کا اہتمام کیا کہ اس کلام الٰہی کو خود اپنی ہی عام بات چیت سے (کیونکہ وہ بھی تو عربی ہی میں تھی) الگ محفوظ اور ممتاز کر دیا جائے ۔ آپؐ خود امی تھے اس لیے نزول وحی کے بعد کسی لکھے پڑھے آدمی سے نازل شدہ کلام لکھوا لیا کرتے تھے ۔ اس زمانے میں عرب میں کاغذ کا رواج بہت کم تھا۔ لکھنے کے لیے کھجور کے چوڑے پتے (گابھے) شانے کی ہڈی۔ ہرن کی جھلی وغیرہ استعمال ہوتی تھی ۔ جو چیز بھی وقت پر دستیاب ہوتی اسی پر نازل شدہ آیات لکھ لی جاتی تھیں ۔ پھر

Marfat.com

آپؐ اس تحریر کو مسلمانوں میں پھیلاتے' وہ اس سے نقل کر کے اپنے پاس رکھتے ۔ اس طرح ابتدائی دور میں ہی مکے کے مسلمان گھروں میں قرآن کے لکھے ہوئے حصے موجود تھے ۔ حضرت عمرؓ کے اسلام کا واقعہ اس بات کا بین ثبوت ہے ۔ دراصل قرآن کی پہلی وحی میں ہی عَلَّمَ بِالقَلَم (العلق:۴) کہہ کر کتاب کی حفاظت بذریعہ تحریر کی طرف اشارہ کر دیا گیا تھا۔ کتابت وحی کا کام کسی مسلمان سے ہی کروایا جاتا تھا اور آگے چل کر یہ خاصہ معزز اور ذمہ دارانہ عہدہ بن گیا(۱)۔ مدینے میں یہ بندوبست بھی کیا گیا کہ قرآن کا ہر نیا نازل شدہ حصہ لکھوانے کے بعد مسجد نبوی کے اندر ایک صندوق میں رکھ دیا جاتا تھا اور تمام مسلمان اس سے اپنے لئے نقل کرتے رہتے تھے ۔ اس طرح آپؐ کی وفات ۱۱ ھ تک قرآن کا کوئی ایسا حصہ نہیں تھا جو تحریری صورت میں متعدد مسلمان گھروں میں موجود نہ ہو ۔ البتہ یہ باقاعدہ اور مسلسل کتاب کی شکل میں نہ تھا بلکہ بکھرے ہوئے مواد کی شکل میں تھا۔

تحریر کے بعد کسی کتاب کی حفاظت کا دوسرا بڑا ذریعہ اس کا حفظ کر لینا ہے ۔ یہ عجیب بات ہے کہ صحف سماویہ میں سے یہ اہتمام بھی صرف قرآن کریم کے لیے ہی کیا گیا۔ ابتداء ہی سے قرآن کریم کو حفظ کرنے پر زور دیا گیا ۔ اسی حفظ قرآن کے ذریعے قرآن کی ترتیب تلاوت کو متعین کیا گیا ۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ سورتوں اور آیتوں کا نزول ترتیب وار اور بطریق تسلسل نہیں ہوا ۔ اکثر ایسا ہوا کہ ابھی ایک سورت مکمل نہ ہونے پائی تھی کہ درمیان میں دوسری سورت نازل ہونی شروع ہو جاتی تھی ۔ بعض اوقات تین تین' چار چار مختلف سورتوں کی آیتیں بلا ترتیب ایک ہی وقت میں نازل ہو جاتی تھیں ۔ سلسلۂ نزول وحی چونکہ آنحضورؐ کی آخر عمر تک جاری رہا ۔ اس لیے آپ کی بتائی ہوئی اس ترتیب تلاوت کو

۱- کُتّاب وحی میں ابوبکرؓ - عثمانؓ - علیؓ - زبیرؓ - ابی ابن کعبؓ - عبداللہ بن رواحہؓ جیسے اصحاب فضل شامل تھے اور مدینے میں تو زیدؓ بن ثابت خاص طور پر اس خدمت پر متعین تھے ۔ خیال رہے کاتب وحی سے مراد وہ شخص ہے جس سے نئی وحی کی پہلی کتابت کا کام لیا گیا ہو ۔ ورنہ اپنے طور پر تو بیشمار صحابہ اپنے اور دوسروں کے لیے قرآن نقل کرتے ہی رہتے تھے ۔

Marfat.com

تحریر میں لانا ممکن نہ تھا۔ البتہ حافظے میں ترتیب کی یہ تقدیم و تاخیر بآسانی ضبط کی جا سکتی تھی ۔ اس طرح حفظ قرآن سے صرف قرآن کے الفاظ و آیات کی اندرونی ترتیب کی بھی حفاظت مقصود تھی ۔ مندرجہ ذیل امور نے مسلمانوں میں حفظ قرآن کا بے پناہ شوق پیدا کر دیا تھا ۔(۱) یہ اعتقاد کہ قرآن کا ایک ایک لفظ کلام اللہ ہے ۔ صحابہؓ کی نگاہیں ان متبرک کلمات کو حاصل کرنے کے لیے نزول وحی پر لگتی رہتی تھیں ۔ ہر ایک کے دل میں یہ آرزو تھی کہ تازہ وحی کو سب سے پہلے میں ہی حاصل کروں ۔

۲- قرآن کی فصاحت و بلاغت اور عربوں کا اعلیٰ ادبی ذوق محض اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے کفار تک قرآن سن کر محظوظ ہوتے تھے ۔

۳- نمازوں میں قرآن مجید پڑھنے کی فرضیت کے باعث بھی ہر مسلمان کو قرآن کا کچھ نہ کچھ حصہ یاد کرنا ضروری تھا ۔ اکثر صحابہؓ نمازوں میں بہت دیر تک قیام کرتے اور لمبی لمبی سورتیں پڑھتے تھے ۔

۴- صحابہ کرامؓ میں رسول اکرم ﷺ کے ہر قول و فعل کے اتباع کا شوق ۔ فرض نمازوں میں بھی آنحضور کا النساء اور آل عمران جیسی طویل سورتیں پڑھنا ثابت ہے ۔ اور قیام اللیل (تہجد) میں تو ایک ہی رکعت میں آٹھ نو پاروں کے قریب بھی پڑھا ہے ۔

۵-امامت نماز - تعلیم قرآن مجید اور بعض دفعہ سرکاری عہدوں کے لئے قراء کی قدر دانی اور ترجیح بھی حفظ قرآن کا محرک تھی ۔

۶- قرآن کریم کا نجماً نجماً آہستہ آہستہ ۲۲ ' ۲۳ سال کے عرصہ دراز میں نازل ہونا بھی حفظ میں سہولت کا باعث تھا ۔

۷- آنحضرتؐ کا مسلمانوں کو تعلیم وحفظ قرآن اور تلاوت پر مداومت کی ہمیشہ تلقین کرتے رہنا ۔ کتب احادیث میں صرف قرآن کے پڑھنے پڑھانے اور یاد کرنے کے متعلق اس قدر مواد موجود ہے کہ اس موضوع پر مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے ۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ حضور کی زندگی ہی میں سینکڑوں افراد قرآن کو مکمل حفظ کر چکے تھے ۔ ان میں سے بعض ہر رات میں قرآن ختم کرتے تھے ۔ اس حد سے بڑھے ہوئے شوق تلاوت

Marfat.com

کے پیش نظر حضورؐ کو پانچ یا تین دن سے کم میں قرآن ختم کرنے سے منع کرنا پڑا۔

اس طرح آنحضرت ﷺ کی وفات کے وقت پورے کا پورا قرآن مکتوب و محفوظ موجود تھا۔ البتہ ایک کتاب یا ایک جلد میں ترتیب وار اس کی سورتیں جمع نہ تھیں۔ بلکہ متفرق طور پر الگ الگ "پرچوں" پر لکھی ہوئی تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ آیتوں اور سورتوں کی اندرونی ترتیب و تہذیب کا ایسا مکمل انتظام ہو چکا تھا کہ یہ کہا جاسکتا تھا کہ فلاں سورت کی اتنی آیتیں ہیں اور فلاں آیت کا یہ نمبر ہے۔ اور یہ ساری ترتیب حفاظ و قراء کے سینوں میں محفوظ تھی۔

مصحف ابی بکرؓ

آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد ابو بکر صدیقؓ کے زمانہ خلافت میں مسیلمہ کذاب کے ساتھ جنگ میں بارہ سو کے قریب صحابہؓ شہید ہوئے جن میں سے سات سو قرآن دان اور ستر کے قریب خاص قاری تھے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے ابو بکرؓ کو مشورہ دیا کہ اب پورے قرآن کا ایک باترتیب کتاب کی شکل میں بھی لکھ لینا چاہیے۔ اب نزول وحی کا سلسلہ تو ختم ہو چکا تھا۔ خدشہ یہ تھا کہ اگر کسی وقت سارے قراء شہید ہو گئے (اور اس وقت مسلمان ہنگامی حالات سے گزر رہے تھے) تو آنحضرتؐ کی بتلائی ہوئی ترتیب میں ردو بدل کا پڑتال کرنے والا کون ہوگا؟ ضروری تھا کہ عہد نبوی کی ترتیب کے مطابق حفاظ و قراء کی مدد سے پورا قرآن ایک جلد میں مرتب کر لیا جائے۔ تاکہ ضرورت پڑنے پر اس سے کام لیا جاسکے۔

ابو بکر صدیقؓ نے زید بن ثابتؓ کو اس کام پر مامور کیا۔ زیدؓ نوجوان انصاری تھے۔ عہد نبوی میں کاتب وحی رہ چکے تھے اور عرصہ اخیرہ میں بھی آنحضورؐ کے ساتھ رہے تھے۔ اتنے ذہین تھے کہ آنحضرتؐ کے حکم پر صرف دو ہفتوں میں عبرانی زبان کی کتابت سیکھ لی تھی۔ حضرت ابو بکرؓ کے حکم سے زیدؓ کے پاس تمام وہ چیزیں جمع کرادی گئیں جن پر حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنے خاص اہتمام سے آیتیں اور سورتیں لکھوائی تھیں۔ اس کے بعد منادی کرا کر تمام وہ تحریریں بھی اکٹھی کر لی گئیں جو متفرق طور پر اکثر صحابہ کے پاس

Marfat.com

محفوظ تھیں ۔ حضرت زیدؓ کا طریق کار یہ تھا کہ کسی آیت کو لکھنے سے پہلے ان تحریری مجموعوں میں اسے دیکھتے ۔ اور پھر ترتیب کے لیے حفاظ کے سینوں سے مقابلہ کر کے لکھ لیتے تھے ۔ صرف حفاظ یا صرف تحریر کے اعتماد پر جمع نہیں کرتے تھے ' بلکہ دونوں کی تصدیق ضروری تھی ۔ اس طرح کمال احتیاط اور تصحیح و مقابلے کے ساتھ مصحف کا یہ نسخہ مکمل ہوا جو کیا بلحاظ عبارت اور کیا بلحاظ ترتیب آیات ' ہر طرح بعینہ وہی قرآن تھا جو آنحضورؐ پر نازل ہوا تھا ۔ یہ نسخہ قرآن مکمل کرنے کے بعد حضرت ابو بکرؓ کے پاس رکھ دیا گیا اور ان کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس رہا ۔ ان کے بعد یہ نسخہ ام المومنین حفصہؓ کے پاس رہا ۔

مصحف امام

فتح مکہ کے بعد جب عرب کے تقریباً کل قبائل مسلمان ہو گئے تو اس وقت قرآن کریم کے پڑھنے میں ایک دقت پیش آئی ۔ مختلف قبائل کی زبان اگرچہ عربی ہی تھی ۔ مگر ان کی بول چال لب و لہجے اور محاورۂ زبان میں اختلافات ضرور تھے ۔ قرآن کریم اس وقت تک قریش کے لہجے (Dialect) کے مطابق پڑھا جاتا رہا تھا لیکن اب جو ان مختلف لہجات رکھنے والے لوگوں کو قرآن پڑھنا ضروری ہوا (نمازوں میں قرآن پڑھنا لازمی تھا) تو یکایک انہیں اپنے بچپن کے پختہ لب و لہجے کو چھوڑ کر محاورۂ قرآن یعنی قریش کی لغت میں قرآن پڑھنا دشوار نظر آیا ۔ اس پر آنحضرتؐ نے بحکم الٰہی ہر قبیلے کو اپنی ہی زبان اور لہجے کے مطابق قرآن پڑھنے کی اجازت دی ۔ یہی "سبعہ احرف" کہلاتے ہیں ۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ قرآن کا ہر ہر لفظ سات مختلف طریقوں پر پڑھا جا سکتا تھا ۔ ہر ہر لفظ میں ہر ایک قبیلے کا اختلاف تلفظ وغیرہ ضروری بھی نہیں تھا ۔ بلکہ بیشتر الفاظ میں یکسانیت ہی تھی ۔ البتہ بعض الفاظ میں اختلاف ہوتا تھا ۔ گو اس سے معنوں میں قطعاً کوئی فرق نہیں پڑتا تھا ۔ مثلاً بنو ہذیل حتیٰ کو عتّی بولتے تھے ۔ بنو تمیم ہمزہ نہیں بولتے تھے ۔ بنو اسد کے لوگ مضارع کو زیر سے پڑھتے تھے یعنی تعلمون کو تِعلمون اور تسودّ کو تِسودّ ۔ بعض قبائل کے لوگ ماءٍ غیر آسن کو غیر یاسنٍ بولتے تھے وغیرہ وغیرہ ۔ آنحضرتؐ کی اجازت کے بعد تمام قبائل کے لوگ قرآن کو

Marfat.com

اپنے اپنے لہجے میں پڑھنے لگے ۔ پھر فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور مفتوحہ علاقوں میں مسلمانوں کی تعداد بھی بڑھی ۔ ہر نیا مسلمان قرآن ضرور سیکھتا تھا ۔ اب کسی کو بنو ہذیل کے شخص سے قرآن پڑھنے کا اتفاق ہوا ۔ دوسرے کو کسی اسدی یا قریشی سے اور ہر ایک لہجے میں اپنے ہی استاد کی پیروی کرتا تھا ۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ارمینیا کے محاذ پر ایک دفعہ بعض فوجیوں میں قرآن کے بعض الفاظ کے تلفظ پر سخت اختلاف بلکہ جھگڑا ہو گیا ۔ یہ صورت حال دیکھ کر ۲۵ ھ میں حذیفہؓ بن الیمان نے ' جو اس محاذ سے ہی حج پر گئے تھے ' حضرت عثمانؓ کو اس قسم کے اختلاف قراءات کو ختم کرنے کا مشورہ دیا ۔ حضرت عثمانؓ نے مشورے کے بعد یہ طے کیا کہ چونکہ آنحضرتؐ کی یہ اجازت خاص حالات کے باعث تھی اور اب عجمیوں کو بھی قرآن پڑھنا تھا اس لیے کیوں نہ کوئی یکساں طریق اختیار کیا جائے ؟ اور اگر یکسانیت برقرار رکھنا ہے تو وہ لہجہ قریش کے مطابق ہونی چاہیئے کیونکہ شروع میں قرآن اسی محاورے کے مطابق پڑھا جاتا رہا تھا ۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے مصحف ابی بکرؓ حضرت حفصہؓ کے ہاں سے منگایا اور زیدؓ بن ثابت اور تین اور آدمیوں پر مشتمل ایک بورڈ کو حکم دیا کہ وہ اس کی نقلیں کریں ۔ مصحف ابی بکرؓ پہلے ہی بیشتر لغت قریش کے مطابق تھا مگر پھر بھی کسی اختلاف کی صورت میں قریش کا لہجہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا گیا ۔ اس طرح حضرت عثمانؓ نے چھ نسخے تیار کرائے ۔ ان میں سے ایک تو خود پاس رکھا اسے " المصحف الامام " کہتے ہیں ۔ باقی نسخوں میں سے آپ نے ایک ایک مکہ ' مدینہ ' کوفہ ' بصرہ اور شام میں بھجوایا ۔ یہ کام ۳۰ھ میں مکمل ہوا تھا ۔ چونکہ اس زمانے تک عربی خط میں نقطے اور حرکات نہیں تھیں اس لئے پھر بھی بعض الفاظ کو مختلف طریقوں پر پڑھنے کا احتمال تھا ۔ لہذا حضرت عثمانؓ نے ہر نسخے کے ساتھ ایک خاص قاری بھی اس شہر میں بھیجا تاکہ لوگ اب اپنے قرآن صرف ان نئے نسخوں سے نقل کریں اور بذریعہ سماع اپنے شہر کے قاری (مقررہ) سے الفاظ کو درست پڑھنا سیکھ لیں ۔ اس کے ساتھ ہی حضرت عثمانؓ نے مختلف علاقوں سے قرآن کے وہ نسخے جمع کرا لئے جن میں بعض الفاظ دوسری قرائتوں کے ساتھ لکھے گئے تھے اور انہیں تلف کرا دیا ۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے آٹھ نسخے

Marfat.com

لکھوائے تھے اور یمن اور بحرین میں بھی ایک ایک کاپی بھجوائی تھی۔

حضرت عثمانؓ کا کام صرف اتنا ہی تھا کہ آپ نے مختلف قبائل کے لہجوں میں قرآن پڑھنے کی اجازت ختم کر دی۔ اور چونکہ پندرہ بیس سال تک اس اجازت کے رائج رہنے کے باعث قرآن کے مختلف نسخوں کی تحریر میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے آپ نے یکسانیت پیدا کر دی (۱)۔ اور اس یکسانیت کی بنیاد قریش کے لہجے کے مطابق پڑھا تھا۔ آج عالم اسلام میں قرآن کے جتنے بھی نسخے ہیں وہ انہی مصاحف عثمانی یا "مصحف امام" کے مطابق ہیں (۱)۔ اور خود یہ نسخے مصحف ابی بکرؓ کی نقل تھے۔ اور مصحف ابی بکرؓ خود آنحضرت ﷺ کے لکھائے اور یاد کرائے ہوئے قرآن کے عین مطابق تھا۔ اس طرح موجودہ قرآن بعینہ وہی قرآن ہے جو آنحضورؐ نے امت کو دیا تھا۔

خلاصہ

(۱) قرآن آنحضرتؐ پر نجماً نجماً تیئس سال میں نازل ہوا۔ (۲) نزول وحی کے وقت آپؐ پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ (۳) قرآن کی ترتیب نزول موجودہ ترتیب تلاوت سے مختلف تھی۔ (۴) موجودہ ترتیب تلاوت بھی توقیفی ہے (۵) آپ قرآن کے ہر نئے نازل ہونے والے حصے کو فوراً تحریر کروا لیتے تھے اور مسلمان اس سے نقل کرتے رہتے تھے (۶) شروع ہی سے قرآن کو حفظ کرنے نر زور دیا گیا۔ اس یاد کرنے میں حضورؐ کی ہی بتائی ترتیب کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ مختلف اسباب نے قرآن کے حفظ کرنے کا شوق پیدا کیا اور اس کام کو سہل بھی بنا دیا (۷) آپؐ کی وفات کے وقت پورا قرآن تحریر اور حافظے کے

۱۔ بعض صحابہ نے آنحضورؐ کی دی ہوئی اختلاف قرأت کی اس اجازت کو ختم کرنے پر حضرت عثمان سے اختلاف بھی کیا۔ مگر صحابہ کی بھاری اکثریت نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ یہی اختلاف قراءات آئندہ چل کر، خصوصاً عجمیوں کے لئے، تبدیلی اور تحریف کا زینہ بن سکتا تھا۔ اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ ایک مصدقہ سرکاری نسخہ شائع کر کے سب کو ایک قراءت اور ایک رسم الخط پر متحد کر دیا جائے۔

Marfat.com

ذریعے محفوظ کیا جا چکا تھا۔ (۸) ابو بکر صدیقؓ کے زمانے میں صرف ترتیب میں ردو بدل کے احتمال تک کو دور کرنے کے لئے ترتیب نبوی کے مطابق ایک نسخہ تیار کیا گیا (۹) عہد عثمانی میں مختلف قراء توں کی وقتی اجازت کو ختم کر کے تمام امت کو ایک قراء ت پر متحد کر دیا گیا اور آئندہ تمام قرآن حضرت عثمانؓ کے ایڈیشن کے مطابق لکھے جانے لگے۔

ترتیب سور

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ قرآن کی ترتیب نزول موجودہ ترتیب تلاوت سے مختلف تھی۔ لیکن آیتوں اور سورتوں کی موجودہ ترتیب (تلاوت) بھی توقیفی ہے۔ یعنی آنحضرت ﷺ کی بتائی ہوئی ہے اور یہ ترتیب آپ نے کسی اجتہاد یا مشورے کی بنا پر نہیں بلکہ حکم ربانی کے مطابق قرار دی تھی۔ سورتوں کے نام آپؐ نے خود ہی بتائے (بعض سورتوں کے ایک سے زائد نام بھی آپ ہی کے بتائے ہوئے ہیں) جب بھی کوئی آیت یا آیات نازل ہوتیں آپؐ ہدایات فرما دیتے کہ اس کو فلاں آیت کے ساتھ ملا کر پڑھو۔ مدینے میں آیات کو لکھ کر بھی اسی جگہ رکھا جاتا تھا جہاں اس سے پہلے تلاوت کی جانے والی آیات کی تحریر رکھی ہوتی تھی۔ روایت ہے کہ جب آیت وَاتقُوا یوماً ترجعون فِیہِ اِلی اللہ ... نازل ہوئی تو حضورؐ نے فرمایا کہ اسے سورہ البقرہ کی آیت نمبر ۲۸۰ کے بعد پڑھا جائے۔ اب بھی یہ آیت سورہ البقرہ کی ۲۸۱ ویں آیت ہے۔ اسی طرح تمام سورتوں کی اندرونی آیات کی ترتیب اور تعداد تک حضورؐ کی بتائی اور مقرر کی ہوئی ہے۔ سورتوں کے آغاز میں بسم اللہِ الرحمٰن الرحیم بھی اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ صرف سورہ التوبہ کے آغاز میں بسم اللہ نہیں ہے۔ سورتوں کی اندرونی (آیات کی) ترتیب کی طرح سارے قرآن میں سورتوں کی موجودہ ترتیب بھی خدا کے منشا و حکم کے مطابق آنحضورؐ کی بتائی ہوئی سات منزلوں (فمی بشوق) کی ترتیب بھی آنحضورؐ کی ہی بتائی ہوئی ہے۔ نمازوں میں مختلف سورتیں تو پڑھی ہی جاتی تھیں۔ حضرت عثمانؓ نے ایک دفعہ حرم بیت اللہ میں صرف دو رکعت میں پورا قرآن ختم کیا۔ اور کئی صحابہ کے متعلق بھی ایک رات میں پورا قرآن ختم کرنے کا ذکر آتا ہے۔

Marfat.com

بلکہ اسی لئے آپؐ کو شبینہ ختم سے منع کرنا پڑا۔ صاف ظاہر ہے یہ ختم قرآن کسی ترتیب کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اور یہ ناممکن ہے کہ ہر صحابی کی اپنی الگ ترتیب قرآن ہو۔ ہر صحابی نے اپنے سینے میں کلًا یا جزأً کلام مجید ضرور محفوظ کیا ہوا تھا۔ پورے قرآن کے حفاظ کی تعداد بھی سینکڑوں سے متجاوز تھی۔ ان سب کی ترتیب تلاوت کیا بلحاظ آیات اور کیا بلحاظ سور آنحضرتؐ کی بتائی ہوئی ترتیب تھی اور اس ترتیب آیات و سور کے مطابق آج تک قرآن پڑھا اور لکھا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ الحمدُ سے لے کر وَالنّاس تک سب ترتیب الہامی ہے۔

مکی و مدنی سورتیں:

قرآن کریم کی سورتوں کی کل تعداد ۱۱۴ ہے۔ اور ہر سورت کا الگ الگ مقرر نام ہے۔ ان سورتوں کی بلحاظ تعداد آیات و زمانۂ نزول مختلف قسمیں کی گئی ہیں۔ جس کا مقصد حوالے کی آسانی یا پس منظر کی وضاحت ہوتا ہے۔

تعداد آیات اور لمبا یا چھوٹا ہونے کے اعتبار سے سورتوں کی چار قسمیں ہیں۔

۱- سبع طوال (سات بڑی سورتیں) البقرہ سے التوبہ تک۔

۲- مئین (وہ سورتیں جن میں کم و بیش سو آیتیں ہیں) یونس سے فاطر تک۔

۳- مثانی (وہ سورتیں جن میں اکثر قصے اور نصائح مکرر بیان ہوئے ہیں) یٰس سے ق تک۔

۴- مفصل (جدا جدا اور علیحدہ علیحدہ مضمون والی سورتیں) ق سے آخر قرآن مجید تک۔

زمانہ نزول کے اعتبار سے قرآن مجید کی سورتوں کو مکی کہا جاتا ہے اور جو سورتیں ہجرت کے بعد نازل ہوئیں انہیں مدنی کہا جاتا ہے۔ بعض دفعہ کسی مکی سورت میں کچھ آیات مدنی اور مدنی سورت میں کچھ آیات مکی بھی ہوتی ہیں۔ ترتیب تلاوت کے لحاظ سے قرآن میں مکی مدنی ملی جلی سورتیں ہیں۔ بعض سورتوں کا زمانہ نزول سنہ اور تاریخ کے تعین کے ساتھ بھی محفوظ ہے۔ اور اسی طرح بعض آیات کا بھی۔ قرآن کی مکی سورتوں کی تعداد ۸۶ اور مدنی سورتوں کی تعداد ۲۸ ہے۔ مجموعی طور پر مکی حصہ قرآن ۱۹/۳۰ اور مدنی ۱۱/۳۰ ہے۔

Marfat.com

قرآن مجید میں ہر سورت کے نام کے ساتھ یہ لکھا ہوتا ہے کہ وہ "مکیہ" ہے یا "مدنیہ"۔ مکی و مدنی سورتوں پر غور کرنے سے ان کی بعض صوری و معنوی خصوصیات سامنے آتی ہیں جو مختصراً حسب ذیل ہیں :- صوری اعتبار سے مکی سورتوں میں آیات بالعموم چھوٹی چھوٹی اور مقفی و مسجع ہیں۔ لفظی حسن و جمال اور صوتی و نغماتی شان و شوکت نمایاں ہے۔ مجموعی طور پر کلام پر شعر کا رنگ غالب ہے۔ اور شاید کفار مکہ کے آنحضرتؐ کو شاعر کہنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ مکی سورتوں میں بالعموم "یاَیُّھا النَّاس" اور "یٰبَنِی ادم" کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔ قرآن کی قسمیں بھی بیشتر مکی دور کی سورتوں ہی میں ہیں۔

مدنی سورتیں زبان کے لحاظ سے نسبتاً سادہ اور آسان ہیں۔ ان میں آیات طویل ہیں۔ قافیہ اور وزن کا اتنا لحاظ نہیں رکھا گیا اور مجموعی طور پر کلام پر تقریر اور لیکچر کا رنگ غالب ہے۔

معنوی اعتبار سے مکی سورتوں میں زیادہ تر یہ مضامین ہیں :

۱- عقائد' توحید و رسالت - آخرت وغیرہ کا بیان

۲- مکارم اخلاق مثلاً عدل و احسان - ایفاء عہد - عفو وغیرہ کا حکم

۳- اخلاقی برائیوں مثلاً قتل - زنا - کاروباری بددیانتی سے نہی

۴- قصص انبیائے سابقین بغرض عبرت و تفکیر

۵- بعض احکام جن کا تعلق دراصل عقیدہ توحید سے ہی ہے مثلاً نماز کی تاکید یا ذبیحہ مشرکین کی ممانعت۔

مدنی دور کی سورتوں میں زیادہ تر شرعی قوانین اور زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق شرعی احکام دئے گئے ہیں اس دور کے مضامین کو اختصاراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے :

۱- تشریع اجتماعی مثلاً شادی و طلاق - حقوق معاشرت' والدین زوجین وغیرہ کی تفصیلات

۲- تشریع مدنی مثلاً بیع رہن - وراثت - وصیت وغیرہ مالی و دیوانی امور -

۳- تشریع سیاسی یعنی حکومت و امارت - معاہدات و مواثیق - اطاعت امیر وغیرہ سے متعلق احکام -

Marfat.com

۴- تشریع جنائی یعنی تعزیری قوانین مثلاً قصاص، حدود و زنا و سرقہ - قذف وغیرہ -

۵- عبادات نماز روزہ زکوٰۃ حج وغیرہ کی تفاصیل اور حلال و حرام کے احکام

الغرض مدنی دور میں اسلام کا مکمل قانون دیا گیا اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر سطح کے لئے احکام دیئے گئے ۔ اور یہیں آخر پر تکمیل دین اور اتمام نعمت کا مژدہ سنایا گیا۔

قرآن مبین کی زبان اور اسلوب بیان

زبان اور ادب زمانۂ جاہلیت کی عربی ثقافت کا ایک نمایاں مظہر تھا ۔ اہل عرب فصاحت و بلاغت کے شیدا تھے اور ان کا ادبی ذوق بہت بلند تھا ۔ ادبی انداز میں اظہار مافی الضمیر کے لئے نثر کی بجائے نظم کو ترجیح دی جاتی تھی اور فنی اعتبار سے قصیدہ شاعر کے زور بیان، قدرت کلام، ندرت الفاظ اور وسعت معانی کا معیار قرار دیا جاتا تھا ۔ ان حالات میں قرآن کریم نازل ہوا، جس میں رائج الوقت انداز نظم و نثر سے ہٹ کر ایک بالکل نیا اسلوب اختیار کیا گیا ۔ جس کی پہلے کوئی نظیر موجود نہیں تھی ۔ اس کتاب مبین کی زبان اور اسلوب بیان کی چند نمایاں خصوصیت یہ ہیں :-

۱- شعرائے جاہلیت مشکل زبان - غریب اور ثقیل (بھاری بھرکم) الفاظ، شاذ و نادر اور پیچیدہ تراکیب اور بعض دفعہ مبتذل اور سوقیانہ کلمات کو بھی زینت کلام سمجھتے تھے ۔ اس کے برعکس قرآن حکیم کی زبان سہل و سادہ، عبارت سلیس و رواں، الفاظ آسان و عام فہم مگر جچے تلے، کلمات شائستہ و متین اور جملے دلکش و ترنم آفرین ہیں ۔

۲- قرآن حکیم کا اسلوب تکلف و تصنع، حشو و زوائد اور تعقید لفظی و معنوی سے پاک ہے ۔ مضامین و الفاظ کی تکرار کے باوجود اسے بار بار پڑھنے میں لطف آتا ہے ۔

۳- قرآن مجید کے مضامین میں تبویب اور تقسیم کا لحاظ نہیں رکھا گیا ۔ اس کے باوجود عبارت بے ربط نہیں ۔ چونکہ منشائے ربانی کلام اللہ سے استفادہ کے علاوہ اس کا استحضار ہے جو تکرار سے بدرجہ اتم حاصل ہوتا ہے ۔ اس لئے مضامین قرآن کی یہ بظاہر غیر مرتب شکل

Marfat.com

پڑھنے والے کے لئے ایک دلکش تنوع پیدا کر دیتی ہے۔ مناظر فطرت اور مظاہر کائنات کی سیر کرنے والے کی طرح قرآن کا قاری بھی ہر ہر آیت کے ساتھ ایک نیا لطف اٹھاتا چلا جاتا ہے۔

۴۔ قرآن عزیز میں مختلف قسم کے مضامین ہیں - اخبار و قصص بھی ہیں اور احکام و قوانین بھی - مناظرہ و مخاصمہ بھی ہے اور دعوت و تبلیغ بھی - وعدہ و وعید بھی ہے اور ترغیب و ترہیب بھی - ہر موضوع کے لئے اس کے مناسب حال انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔ الفاظ کے صوتی و نغماتی اثرات تک پڑھنے والے پر مطلوبہ کیفیات طاری کرنے کا حیرت انگیز اثر رکھتے ہیں۔

اعجاز القرآن

قرآن حکیم اور آنحضرت ﷺ کا زندہ اور دائمی معجزہ ہے۔ تمام مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ آج تک کوئی انسان یا آسمانی کتاب قرآن کا جواب نہیں ہو سکی اور نہ آئندہ قیامت تک ہو سکے گی۔ اعجاز القرآن کا مطلب یہی ہے کہ اس لاجواب و لاثانی کتاب نے اپنے مقابلے پر سب کو عاجز کر دیا۔

قرآن کا معجزہ ہونا کئی اعتبار سے ہے :-

۱- اسلوب بدیع

یعنی نرالا اور اچھوتا انداز بیان): زمانہ جاہلیت میں اہل عرب اپنے اعلیٰ ادبی ذوق کے باوجود اظہار خیال کے چند مخصوص اسالیب کے پابند تھے۔ وہ صرف قصائد' خطبات' رسائل (خطوط) یا محاورات کے ذریعے ہی اپنے کمال فصاحت و بلاغت کا اظہار کرنا جانتے تھے اور ان چاروں صورتوں میں سے بھی قصیدہ اپنی مخصوص ادبی "تکنیک" کے باعث زبان آوری اور قادر الکلامی کا ثبوت دینے کا سب سے مقبول ذریعہ تھا۔ نبی امی ﷺ کا ایک کتاب کو ان تمام رائج الوقت اسالیب سے ہٹ کر ایک بالکل نرالے اسلوب سے پیش کرنا معجزہ نہیں تو کیا ہے؟ لطف کی بات یہ ہے کہ نیا نمونہ اور نیا اسلوب پیش کر دینے کے بعد قرآن نے مخالفوں کو اس

Marfat.com

کی کامیاب نقل کرنے کو ہی اپنے صدق و کذب کا معیار مقرر کر دیا گر اس چیلنج کا جواب آج تک کوئی نہ دے سکا۔

۲- فصاحت و بلاغت

اظہار خیال کے لئے نہایت عمدہ و پاکیزہ اور خالص و شستہ زبان کا استعمال فصاحت ہے اور زیادہ سے زیادہ مطالب کو کم سے کم الفاظ میں بیان کر دینے کا نام بلاغت ہے۔ اسلوب اور انداز بیان کی جدت کے علاوہ قرآن کریم اپنے متنوع مضامین کے باوصف الفاظ و کلمات کے انتخاب اور زبان و محاورے کی شیرینی کے اعتبار سے بھی معجزہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ نبوت کے دور اول (کم و بیش ۱۵ سال) میں جتنے بھی لوگ مسلمان ہوئے انہوں نے یا تو آنحضرتؐ کی شخصیت و سیرت سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا یا قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت سے مرعوب ہو کر۔

۳- حفاظت و صیانت

تمام صحف سماویہ میں سے قرآن مجید ہی واحد کتاب ہے جو اپنی اصلی حالت میں حرف بحرف موجود ہے۔ حفاظت قرآن کی داستان تاریخ عالم اور تاریخ مذاہب کا حیرت انگیز واقعہ ہے۔ قرآن کا صرف متن اور عبارات ہی محفوظ نہیں بلکہ اس کا عہد نبوی کا رسم الخط (لکھنے کا طریقہ) اور تلفظ و لہجہ تک بعینہٖ محفوظ ہے۔ قرآن بھیجنے والے نے خود: اِنّ عَلینا جَمعه و قرانه (القیامه ۱۷) اور انا نحن نَزلنا الذِکر و اِنا له لحفِظُون (الحجر: ۹) کہہ کر جو وعدہ کیا تھا۔ تیرہ سو سال اس کی صداقت پر شاہد ہیں۔ اور ان شاء اللہ قیامت تک قرآن مجید اپنی حفاظت کے اعتبار سے ایک زندہ معجزہ اور "آیہ بینہ" بن کر موجود رہے گا۔

۴- اخبار ماضی و مستقبل

ایک امی ﷺ کی زبان سے امم سابقہ کے حالات کا اس طرح بیان ہونا کہ بعض دفعہ خود ان امتوں کے اپنے موجود ریکارڈوں کی غلطیاں بھی سامنے آجائیں کیا کچھ کم معجزہ ہے؟ مستقبل کے متعلق قرآن نے جو کچھ بیان کیا۔ عہد رسالت سے لیکر آج تک اس میں

Marfat.com

سے بیسیوں باتیں سچی ثابت ہو چکی ہیں۔ طالب حق کے لئے قرآن اس لحاظ سے بھی یقیناً معجزہ ہے۔ زندہ اور جاری معجزہ (۱)۔

۵- احکام و قوانین

کتاب ربانی اپنے احکام و قوانین کے اعتبار سے بھی معجزہ ہے۔ قرآن عزیز نے جس موضوع پر بھی کچھ کہا ہے وہ "قول فصل" ہے۔ انسان کی مادی و روحانی ضروریات کی کفالت، انسانی فطرت سے مطابقت، اپنی افادیت، جامعیت، دوامیت، عالمگیریت، عمل پذیری اور باہمی ہم آہنگی کے اعتبار سے دنیا کا کوئی بھی وضعی یا سماوی قانون قرآنی قانون کے مقابلے پر نہیں ٹھہر سکتا۔ اور یہ بھی قرآن کے اعجاز کا ایک اہم پہلو ہے۔

در اصل کسی چیز کے اعجاز کا قائل ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ قائل میں معجزے کی نوعیت اور صفت اعجاز کو سمجھنے کی بھی پوری جسمانی، عقلی، عملی، فنی اور دیگر مطلوبہ اہلیت موجود ہو۔ کسی بہرے کے لئے کوئی آواز اور اندھے کے لئے کوئی نظارہ معجزہ نہیں ہو سکتا چاہے فی نفسہ وہ آواز اور وہ نظارہ فی الواقع ہی معجزہ کیوں نہ ہو۔ قرآن کریم کے اسلوب بدیع اور فصاحت و بلاغت کے اعجاز کا قائل در اصل وہی آدمی ہو سکتا ہے جسے عربی زبان و ادب اور اس کی تاریخ پر عبور حاصل ہو۔ قرآن حکیم کی حفاظت و صیانت کا مبہوت کن اثر اسی شخص پر ممکن ہے، جو دیگر صحف سماویہ کی تاریخ اور انتظامات حفاظت سے واقف ہونے کے بعد اس اہتمام پر نظر ڈالے جو اس کتاب کی حفاظت کے لئے اس کے لانے والے اور اس کے ماننے والوں نے کیا۔ اسی طرح قرآن حکیم کا تشریعی اعتبار سے معجزہ ہونا اسی پر واضح ہو گا جو سماوی اور وضعی قوانین کے تقابلی مطالعے کے بعد اس کتاب عزیز کا بغور مطالعہ کرے گا۔

۱- قرآن مجید کی بعض بشارتوں کے لئے رحمۃ للعالمین جلد سوم (قاضی محمد سلیمان منصور پوری) دیکھئے تحت عنوان خصائص القرآن۔

Marfat.com

اسلامی عقائد اور قوانین کی اساس

قرآن حکیم اسلامی عقائد اور تعلیمات کا پہلا ماخذ اور سرچشمہ اول ہے۔ اور یہی اسلامی قانون کا اصل الاصول ہے۔ اس میں شریعت کی بنیادی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ عقائد کے معاملے میں اس کے اندر پوری تفصیل وضاحت ہے اور عبادات اور حقوق و معاملات کا بیان اجمالاً ہے۔ اسلامی شریعت میں قرآن کی بالکل وہی حیثیت ہے جو ملکی قوانین میں دستور کی ہوتی ہے۔ بنیادی باتیں اور اجمالی اصول متعین کر دیئے گئے ہیں۔ اور چند گنے چنے احکام (مثلاً میراث نکاح - طلاق - چند حدود) کے علاوہ اس میں جزئیات و تفاصیل سے بحث نہیں کی گئی۔

قرآن اللہ کی کتاب ہے اور اس کی حاکمیت اور اہمیت غیر مشروط ہے۔ سنت، قیاس، اجماع وغیرہ، باقی مآخذ اس کے تابع ہیں اور مشروط ہیں۔ بلکہ دراصل بات یہ ہے کہ یہ مآخذ قرآن کے مفہوم و مراد کو سمجھنے کے بہترین ذریعے ہیں۔ اور اسی لحاظ سے قرآن کے بعد ان کی علی الترتیب اہمیت ہے۔ جس طرح ان ذرائع کو قرآن پر حاکم ٹھہرانا غلطی ہے۔ اسی طرح فہم قرآن کے ان اہم مآخذ سے بے نیاز ہو کر قرآن دانی کی ہر کوشش گمراہی ہے۔ انفرادی و اجتماعی زندگی کا کوئی گوشہ اور کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق اصولی طور پر قرآن حکیم میں براہ راست یا بالواسطہ رہنمائی موجود نہ ہو۔ قرآن حکیم کے کسی حکم یا اس کے کسی حصے کو اپنی انفرادی یا اجتماعی زندگی میں نافذ کرنے سے انکار دراصل اسلام سے انکار ہے۔

فن تفسیر اور دور اوّل کی تفاسیر پر سرسری نظر

لفظ تفسیر کے لغوی معنی "کھول کر بیان کر دینا" ہیں۔ اصطلاحاً اب یہ لفظ قرآن کریم کے مطلب اور مفہوم کی وضاحت کے لئے خاص ہو گیا ہے۔ اس سے ملتا جلتا ایک لفظ تاویل بھی ہے۔ تاویل کا لفظی معنی لوٹنا اور رجوع کرنا ہے، اور اصطلاح میں کسی آیت سے ایسا مطلب نکالنا جو سیاق و سباق کے موافق ہو اور کتاب و سنت کے خلاف نہ ہو۔ تفسیر میں

Marfat.com

تعین و وضاحت کا نقلی پہلو اور تاویل میں عقلی پہلو غالب ہے، اگرچہ بالعموم تفسیر کا لفظ دونوں معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔

قرآن کی تفسیر کا ایک پہلو ان احکام کی وضاحت ہے جو روز مرہ کی عملی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً حلال و حرام کی تمیز۔ نیکی اور بدی کی پہچان اور حقوق و فرائض سے آگاہی۔ اس پہلو سے قرآن حکیم بہت آسان کتاب ہے۔ اس کے احکام بآسانی سمجھے اور عمل میں لائے جا سکتے ہیں۔ اور اس قسم کے ضروری امور کی تعداد بھی اتنی کم ہے کہ ایک ان پڑھ آدمی بھی کسی پڑھے لکھے سے سن کر یاد کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ قرآن حکیم کی تفسیر کا ایک پہلو وہ بھی ہے جس میں مضامین قرآن سے اعلیٰ سطح پر بحث کی جاتی ہے۔ تفسیر میں تحقیق و تخصص کا یہ درجہ حاصل کرنا (کسی بھی دوسرے علم میں محققانہ مقام حاصل کرنے کی طرح) آسان نہیں ہے اور اس کے لئے یقیناً بعض بنیادی شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ عربی زبان و ادب میں مہارت تامہ۔ قدرتی ذوق او طبیعت کی مناسبت، اتقاء و طہارت اخلاق، احکام و آیات قرآنی میں گہری بصیرت (ا) مقاصد شریعت سے آگاہی اور اپنے زمانے کے علوم کے علاوہ تاریخ و تفسیر قرآن کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہونے کے بغیر معارف قرآن میں غواصی کا دعویٰ مضحکہ خیز بھی ہے اور گمراہ کن بھی۔ تفسیر قرآن کے اس محققانہ درجے پر فائز ہونا کسی خاص نسل یا طبقے کی اجارہ داری نہیں ہے مگر اس کے لئے علم و فضیلت کے ایک خاص معیار اور مشق و ممارست کی ضروری شرط کو بھی نظر انداز کر دینا نہ عقلمندی ہے نہ دیانت۔

قرآن کریم کے ایک پہلو سے آسان اور دوسرے پہلو سے مشکل ہونے کو اس مثال سے سمجھئے۔ ہر شخص کو اپنی روز مرہ زندگی میں "قانون کے مطابق رہنے" کے لئے بقدر ضرورت معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ عدالت اور پولیس، سڑک اور دفاتر، ڈاک خانہ اور ریل،

ا- قرآن میں جو جو لفظ یا حکم جتنے مواقع پر بیان کیا ہے سب کو ملحوظ رکھنا، ہر ایک موقع کے سیاق و سباق پر مبصرانہ نگاہ ڈال کر حکم کی اصل روح تک پہنچنا اور کوئی ایسے معنی نہ نکالنا جو قرآن کے دوسرے مقام پر بیان کردہ حکم کے خلاف ہوں۔

۲۳۲۹

Marfat.com

تجارت اور صنعت ' تعلیم اور صحت وغیرہ وغیرہ امور کے متعلق ملکی قوانین اور سرکاری ضوابط کا کچھ نہ کچھ حصہ ہر آدمی کو ضرور معلوم ہوتا ہے۔ یا کم از کم بوقت ضرورت کسی عام " جنتری یا ڈائری " سے ہی دیکھ کر اپنا " کام چلا سکتا " ہے۔ دوسری طرف ان میں سے ہر محکمے کے قوانین و ضوابط کا ایک ضخیم " دفتر " ہے۔ اور ایک ہی آدمی کا بیک وقت تمام شعبوں کے جملہ قواعد و ضوابط کا " ماہر کامل " ہونا دشوار ہے۔ اہم اور دقیق فنی (ٹکنیکل) امور کے لئے " جنتری اور ڈائری " کی بجائے کسی بلندتر حوالے اور سند (اتھارٹی) کی ضرورت ہوتی ہے۔عہد رسالت سے ہی تفسیر قرآن کی ابتداء - آسان اور مشکل دونوں پہلوؤں کے لحاظ سے - ہو چکی تھی۔ صحابہؓ اہل زبان تھے اور قرآن کا سمجھنا ان کے لئے باوجود کسی اجمال کی تفصیل یا کسی مشکل کے حل کے لئے انہیں بارگاہ نبوی کیطرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ حضورؐ کی زندگی میں ہی صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت قرآن حکیم کی نبوی تفسر و توضیح میں اختصاص پیدا کر چکی تھی۔ آپؐ کے بعد بھی یہی لوگ فہم قرآن اور تفسیر آیات کے لئے لوگوں کا مرجع بنے ۔ ان صحابہؓ میں سے خلفائے اربعہؓ - عبداللہ ابن مسعودؓ ۔ زید بن ثابتؓ اور عبداللہ بن عباسؓ خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ صحابہؓ ہمیشہ تفسیر قرآن میں پہلے آنحضرت ﷺ کا قول روایت کرتے۔ پھر عربی ادب ' جاہلی شاعری اور بعض دفعہ روایات اہل کتاب سے کام لیتے تھے ۔

صحابہؓ کے بعد تابعین اور تبع تابعین کے دور میں آہستہ آہستہ علم دین کی ایک ایک شاخ مستقل علم بننے لگی ۔ حدیث و فقہ کی طرح آیات قرآنیہ کی تفسیر بھی تخصص و تحقیق کا ایک خاص شعبہ بن گیا ۔ بہت سے لوگوں نے اپنی زندگیوں کا بیشتر حصہ زیادہ سے زیادہ آیات کے متعلق زیادہ سے زیادہ احادیث نبویہ اور اقوال صحابہ جمع کرنے میں لگا دیا ۔ دوسرے علوم اسلامیہ کی طرح علم تفسیر بھی بے شمار لوگوں کے سینوں سے نکل نکل کر چھوٹے چھوٹے کتابی مجموعوں میں اور پھر متعدد مجموعوں سے ضخیم اور مرتب کتب میں منتقل ہوتا رہا۔

سب سے پہلی تفسیر عبداللہ ابن عباسؓ (م ۶۸ھ) کی طرف منسوب کی جاتی ہے ۔ مصر کی پرانی لائبریوں میں اس کے قدیم نسخے بھی موجود ہیں اور شائع بھی ہو چکی ہے ۔ قیاس

Marfat.com

یہی ہے کہ یہ تفسیر خود انہوں نے باقاعدہ مدون نہیں کی ہوگی ۔ بلکہ باسناد ان سے مروی ہوتے ہوئے بعد کے کسی دور میں لکھی گئی ہو گی ۔ مشہور قول کے مطابق سب سے پہلے تفسیر کے مدون مجاہد (م ۱۰۴ھ) قرار دیئے جاتے ہیں ۔ ان کی تفسیر بھی ہم تک (بصورت کتاب) نہیں پہنچی (دوسری تفاسیر میں اس کے حوالے موجود ہیں)۔ شیعہ حضرات کی بھی ایک قدیم تفسیر ہے جسے وہ امام محمد الباقر بن علی بن حسینؒ سے منسوب کرتے ہیں ۔ دراصل جب آگے چل کر بڑی بڑی کتابیں ہر فن کی لکھی جانے لگیں تو ابتدائی دور کی تمام چھوٹی چھوٹی اور انفرادی تالیفات کو ان میں سمو دیا گیا ۔ کہیں حوالے کے ساتھ اور کہیں نام کا حوالہ دیئے بغیر ۔ اس طرح ان بڑے مجموعوں کی موجودگی میں چھوٹے چھوٹے مجموعوں کی افادیت بلکہ ضرورت ہی نہ رہی اور آہستہ آہستہ ان کا لکھنا لکھانا بھی متروک ہو گیا ۔ علم حدیث ہو یا علم تفسیر دونوں کے ارتقاء کی تاریخ میں یہ نکتہ نہایت اہم ہے ۔ اس کو نظر انداز کر دینے یا نہ سمجھنے سے ہی کئی غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں ۔

تفسیر کے بڑے مجموعوں میں قدیم ترین اور مشہور ترین تفسیر امام محمد ابن جریر الطبریؒ (م ۳۱۰ھ) کی ہے ۔ اس کا اصل نام " جامع البیان فی تفسیر القرآن " ہے ۔ مگر عام مشہور نام " تفسیر طبری " ہے ۔

اس میں مولفؒ نے اپنے زمانے تک کے تمام تفسیری مواد (احادیث ' آثار ' روایات ادبیہ وغیرہ) کو جمع کر دیا ہے ۔ یہ ضخیم تفسیر مصر سے دو مرتبہ شائع ہو چکی ہے ۔ اور اب تیسری دفعہ نہایت اعلیٰ طباعت اور صحت کے ساتھ دار المعارف (مصر) سے شائع ہو رہی ہے ۔

ابن جریرؒ کے بعد حافظ ابو الفدا اسماعیل ابن عمر المعروف بابن کثیر الدمشقیؒ (م ۷۷۴ھ) کی تفسیر قابل ذکر ہے ۔ یہ دراصل ابن جریر کا خلاصہ ہے ۔ البتہ جمع روایات کے ساتھ ساتھ محدثانہ تنقید سے بھی کام لیا گیا ہے ۔

تیسری اہم تفسیر " تفسیر کشاف " ہے جس کا اصل نام " الکشاف عن حقائق التنزیل " ہے ۔ اس کے مولف علامہ جار اللہ ابو القاسم محمود بن عمر الزمخشریؒ (م ۵۳۸ھ)

Marfat.com

تھے۔ لغت ' ادب اور نحو کے لحاظ سے یہ تفسیر ایک علمی خزانہ ہے ' مگر مولف معتزلی تھے۔

تفسیر کی چوتھی مشہور کتاب امام فخر الدین رازیؒ (م ۶۰۶ھ) کی تفسیر ہے۔ اس کا نام "مفاتیح الغیب" ہے اور عام طور پر تفسیر کبیر کے نام سے مشہور ہے۔ اس تفسیر میں روایات کے علاوہ عقلی علوم فلسفہ منطق وغیرہ سے کام لیا گیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چھٹی صدی ہجری تک کے علمی رجحانات اور کلامی مسائل کیا تھے۔

مذکورہ چار تفاسیر (طبری ' ابن کثیر ' کشاف اور کبیر) تمام تفسیری لٹریچر میں بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بعد کی تمام تفاسیر انہی کا چربہ یا خلاصہ ہیں۔ مولفین کے اپنے اپنے رجحانات کے مطابق مختلف تفاسیر میں حدیث ' لغت اور نحو ' فقہ ' کلام ' تصوف قصص وغیرہ میں سے کسی ایک یا متعدد علوم کا رنگ غالب پایا جاتا ہے۔

عربی زبان کے علاوہ فارسی ' ترکی ' اردو اور انگریزی وغیرہ زبانوں میں بھی بیشمار تفاسیر لکھی جا چکی ہیں۔ مگر ان سب کا ذکر اس مرحلے پر ضروری نہیں ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

سورہ آل عمران

تعارف:

اس سورت کا نام "آل عمران" ہے۔ یہ لفظ اس سورت کی ۳۳ ویں آیت میں آیا ہے۔ اس میں ۲۰ رکوع اور ۲۰۰ آیات ہیں۔ قرآن کریم کی سورتوں کے نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے منقول ہیں۔ یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ بالعموم قرآن مجید کی سورتوں کے نام ایسے عنوان یعنی (Heading) نہیں کہ ہر سورت کے تمام مضامین اس عنوان سے مترشح ہوتے ہوں۔ اکثر تو نام اسی سورت کا کوئی ایسا لفظ ہوتا ہے جو صرف اسی سورت میں آیا ہو اور قرآن میں دوسری جگہ نہ ہو۔ بعض دفعہ وہ نام اسی سورت کے اندر بیان کردہ کسی ایسے واقعہ سے متعلق ہوتا ہے جو صرف اسی سورت میں مذکور ہوتا ہے۔ سورتوں کے ناموں اور ان کے مضامین میں اور مناسبتیں بھی ملتی ہیں۔ ہر سورت کا جدا نام رکھنے کی اصل غرض غالباً اسے دوسری سورتوں سے متمیز کرنا ہی ہے۔ "آل عمران" کا لفظ قرآن کریم میں اس سورت کے علاوہ اور کسی جگہ نہیں آیا۔

سورت کا زمانۂ نزولؔ اور تاریخی پس منظر

یہ سورت ہجرت کے بعد مدینے میں نازل ہوئی۔ اور ترتیب نزول کے لحاظ سے قرآن کریم کی ۱۱۴ سورتوں میں سے اس کا نمبر ۸۹ ہے۔ مدنی سورتوں میں سے یہ تیسری سورت ہے۔ اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ پوری سورت ایک ہی دفعہ نازل نہیں ہوئی۔

آیات ۱۲۱ تا ۱۸۰ جنگ احد کے واقعات و نتائج سے متعلق ہیں اور یقیناً ۳ ھ یا ۴ ھ میں نازل ہوئیں۔ مستند روایات کے مطابق ابتدائی ۸۳ آیات وفدِ نجران کی آمد

Marfat.com

کے موقع پر ۱۰ھ میں نازل ہوئی تھیں۔ باقی آیات اپنے مضمون کے اعتبار سے جنگ بدر سے بعد کے قریبی زمانہ کی معلوم ہوتی ہیں۔

جنگ احد

یہاں اس جنگ کی پوری تفصیلات (۱) کی بجائے صرف وہ ضروری واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ جن کا سورت کے مضامین سے براہِ رسات تعلق ہے ' یا پورے واقعہ کو مختصر مگر مربوط طریقے پر بیان کرنے کے لیے جن کا ذکر ناگزیر ہے۔

۱- جنگ بدر (رمضان ۳ھ) میں اپنی رسوا کن شکست کا بدلہ لینے اور اپنی شام کی تجارتی شاہراہ کو (انگریزوں کے سویز کی طرح) بلاخطر اپنے ہی کنٹرول میں رکھنے کے لیے قریش مکہ کو ڈھائی لاکھ درہم کا چندہ جمع کرنا ذرا بھی بار نہ گزرا۔ عرب کے جنگجو قبائل پر اپنے زبردست رسوخ اور دوسرے تمام ذرائع سے کام لے کر ایک سال کی تیاری کے بعد کفار مکہ نے تین ہزار کا لشکر تیار کیا۔ جس میں سات سو زرہ پوش اور دو سو سوار بھی تھے یہ لشکر ابو سفیان کی قیادت میں اوائل شوال ۳ھ میں مدینے پر حملے کے لیے روانہ ہوا۔ قریش کی فوج نے پہنچتے ہی فوراً مدینہ پر حملہ نہیں کر دیا بلکہ ایک آدھ دن ستا کر اپنے نوجوانوں کو تازہ دم کرنے نیز اپنے جانوروں کے لیے گھاس اور پانی کی سہولت کے لیے اس فوج نے مدینے سے چند میل شمال مغرب میں کوہ احد کی مغربی جانب ایک موزوں چراگاہ میں ڈیرا ڈالا۔ انہیں اپنی کامیابی کا اتنا زعم تھا کہ اس "دم لے لینے" کو خلافِ مصلحت نہیں سمجھا۔

۲- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لشکر کی مکے سے روانگی کے ساتھ ہی اطلاع ہو چکی تھی۔ مدینے کے قریب مسلمانوں کے جاسوسوں نے دشمن میں شامل ہو کر ان کی

۱- اس جنگ کے حالات کے لیے طالب علم کو خاص طور پر ڈاکٹر حمیداللہ کی کتاب "عہد نبوی کے میدان جنگ" اور حفیظ کے شاہ نامۂ اسلام جلد سوم و چہارم کے متعلقہ حصے پڑھنے کی سفارش کی جاتی ہے۔

Marfat.com

تعداد وغیرہ کے متعلق رپورٹ حضورؐ تک پہنچا دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً ایک مجلس مشاورت بلائی اور اپنا یہ عندیہ بھی ظاہر فرمادیا کہ شہر کے اندر رہ کر دفاع کیا جائے۔ مشہور منافق عبداللہ بن ابی کی بھی یہی رائے تھی۔ مگر چند جوشیلے نوجوانوں کے اصرار پر باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ بعض فوجی مبصروں کا خیال ہے کہ آنحضرتؐ نے شروع میں ہی اپنی رائے کا اظہار عبداللہ بن ابی کی چال کو سمجھنے کے لیے کیا تھا۔ اگلے واقعات اس کی تائید بھی کرتے ہیں۔

۳۔ یہ مشورہ ۱۴ شوال (جمعہ) کی صبح کو ہوا تھا جمعہ کی نماز کے بعد آپ ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ مدینے سے نکلے۔ دشمن شمال میں مقیم تھا اور بظاہر آپ کو ادھر ہی چلنا چاہیے تھا۔ مگر آپ نے مدینے کے جنوب سے نکل کر مشرق اور پھر شمال مشرق کی طرف سے ایک لمبا چکر کاٹتے ہوئے کوہ احد کے سامنے شوط نامی ایک باغ کے قریب نماز فجر با جماعت ادا کرائی۔ یہاں پہنچ کر عبداللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں سمیت الگ ہو کر واپس ہو گیا۔ اس نے کہا کہ "جب میری بات (شہر میں رہ کر لڑنے کی) نہیں مانی گئی تو ہمیں خواہ مخواہ مرنے کی کیا ضرورت ہے؟ آخر ہمارا اتنا بھی اختیار نہیں ہے؟ ہمیں تو یہ ساری تدبیر فوجی سوجھ بوجھ کے خلاف اور جان بوجھ کر مرنے والی بات نظر آتی ہے" اور طنزاً یہ بھی کہا "بھئی ہم تو فنِ حرب سے نا آشنا ہیں ورنہ تمہارے ساتھ چلتے۔ بعض فوجی مبصروں کا یہ خیال ہے کہ عبداللہ بن ابی شروع میں تو اپنی رائے کے خلاف بھی مسلمانوں کے ساتھ نکل کھڑا ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ مسلمان سیدھے شمال کو چلیں گے اور احد اور مدینے کے درمیان کھلے میدان میں جنگ ہو گی۔ فوجی نقطہ نظر سے اس صورت میں قریش بہتر موقع پر ہوتے اور عبداللہ کی عین وقت پر غداری سے مسلمانوں کو بآسانی تباہ کیا جا سکتا۔ مگر آنحضرتؐ نے ایک ایسی چال اختیار کی جسے شروع میں تو یہ منافق سمجھ ہی نہ سکا۔ (حضورؐ نے یہ ساری نقل و حرکت نہایت غیر معروف اور دشوار گزار راستے سے کی تھی)۔ آخر پر جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس طرح تو مسلمان دامنِ احد میں بہتر مورچے پر قابض ہو جائیں گے تو اپنا سارا منصوبہ

Marfat.com

تباہ ہوتے دیکھ کر وہ الگ ہو گیا۔

۴- عبداللہ بن ابی کے اس طرح واپس ہونے کا نفسیاتی طور پر بہت برا اثر پڑا۔ مسلمان اب صرف سات سو رہ گئے تھے جن میں صرف دو سوار تھے۔ یہ صورت حال دیکھ کر بنو سلمہ (خزرج سے تھے) اور بنو حارثہ (اوس میں سے تھے) نے بھی دل میں لوٹنے کی ٹھیرائی۔ مگر اللہ نے انہیں اس لغزش سے بچا لیا۔ اور وہ اسلامی فوج میں شامل رہے۔ بہرحال دامن کوہ میں پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موزوں جگہ پر قبضہ کیا۔ مسلمانوں کی پشت پر پہاڑ تھا۔ دشمن صرف سامنے سے ہی حملہ کر سکتا تھا۔ البتہ جبل احد اور جبل رماۃ کے درمیانی میدانی راستے سے بھی مسلمانوں پر تقریباً پیچھے سے حملہ ہو سکتا تھا۔ آنحضرتؐ نے جبل رماۃ (۱) پر پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ عبداللہ بن جبیر کی کمان میں اس ناکے کی حفاظت کے لئے مقرر فرمایا اور انہیں تاکید کر دی کہ "اگر دیکھو کہ ہمیں پرندے اچک لے گئے ہیں (یعنی ہار رہے ہیں) تو بھی اپنی جگہ نہ چھوڑنا جب تک میرا حکم نہ پہنچے اور اگر تم دیکھو کہ ہم نے دشمن کو شکست دے کر پامال ہی کر دیا ہے تب بھی یہیں ڈٹے رہنا"۔ ان ضروری انتظامات کے بعد دشمن سے جنگ ہوئی۔ یہ ۱۵ شوال ۳ھ ہفتے کا دن اور صبح کا وقت تھا۔ مسلمانوں کی جانبازی سے بہت جلد لشکر قریش کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بھاگ نکلے۔ ان کا جھنڈا تک اٹھانے والا کوئی نہ تھا۔ مسلمان فاتحانہ قتل و غارت میں مشغول تھے۔ یہ صورت حال دیکھ کر پہاڑی والے تیراندازوں نے سوچا اب دشمن سے تو کوئی خطرہ نہیں ہمارے یہاں کھڑے رہنے کی کیا ضرورت ہے چنانچہ اپنے افسر کے منع کرنے کے باوجود ان میں سے اکثر نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور میدان کارزار میں پہنچ کر مال غنیمت جمع کرنے کے لیے ادھر ادھر پھیل گئے۔ قریش کے مایہ ناز جرنیل خالد بن ولید نے اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور اپنے سواروں کے دستے کے ساتھ فوراً اسی پہاڑی ناکے سے گزر کر مسلمان

۱- ایک چھوٹی سی پہاڑی جسے اس وقت جبل عینین اور اب جبل رماۃ کہتے ہیں۔

Marfat.com

پر پیچھے سے حملہ کر دیا۔ سات آٹھ تیرانداز جو موجود تھے وہ بھی خالد کے اس حملے میں مارے گئے۔ مسلمان اس اچانک حملے سے سراسیمہ ہو گئے۔ یہ خالد کے دستے کی طرف پلٹے تو پسپا ہونے والی فوج نے بھی پلٹ کر دوبارہ حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کی صفیں ٹوٹ چکی تھیں۔ وہ دو طرف سے گھر گئے تھے۔ فتح شکست میں بدل گئی۔

۵- کچھ مسلمان تو وہاں سے ایسے بھاگے کہ مدینے آ کر ہی دم لیا۔ اس اثناء میں یہ افواہ پھیل گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں۔ (دراصل آپ ایک گڑھے میں گر گئے تھے) بہت سے مسلمان یہ سن کر بھونچکے رہ گئے۔ ان میں سے جہاں کوئی تھا وہیں رہ گیا اور اپنی جان بچاتا رہا۔ مگر دو درجن کے قریب ایسے صحابہؓ تھے جنہوں نے اس کٹھن وقت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بچانے کے لیے ---- (اور دشمن کے حملے کا سارا زور اب اسی طرف تھا)۔ جاں نثاری و پامردی کا حیرت انگیز مظاہرہ کیا۔ حضورؐ کے پکارنے پر ہر صحابی نے آپ کے گرد پہنچنے کی کوشش کی۔ البتہ جو بھاگ نکلے تھے وہ نہیں آ سکے۔ اس ہنگامے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی زخمی ہوئے اور آپ کا نیچے کا ایک دانت مبارک شہید اور ہونٹ بھی زخمی ہوا۔ خود کی کڑیاں چہرے میں گھس گئیں۔ بڑی مشکل سے آپ صحابہؓ کی اس جماعت کے ساتھ پہاڑ کے ایک نسبتاً محفوظ حصے تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ اس عرصے میں مسلمانوں کے ستّر آدمی شہید ہو گئے۔ قریش کی عورتوں نے کئی شہداء کی لاشوں کے ناک کان کاٹ لیے ان میں سے ایک حضرت حمزہؓ بھی تھے۔ قریش دل کی بھڑاس نکال چکے تھے۔ ابو سفیان نے اپنی فوج کو واپسی کا حکم دے دیا۔ جانے سے پہلے اسے یہ معلوم ہو گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم زندہ موجود ہیں۔ مگر اس نے اب صرف یہ اعلان کیا کہ "یہ بدر کا بدلہ ہو گیا اور آئندہ سال پھر بدر میں ہی مقابلہ ہو گا"۔ حضورؐ کے فرمانے پر صحابہ نے اس چیلنج کو قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔

۶- آنحضرتؐ کو اب یہ خطرہ ہوا کہ کہیں لشکر قریش پلٹ کر مدینے پر حملہ نہ کر دے۔ مگر قریش کے سرداروں میں سے اس وقت کسی کو بھی مدینے پر حملے کا خیال

Marfat.com

نہیں آیا اور وہ مکے کی طرف ہی روانہ ہو گئے البتہ راستے میں ایک جگہ پہنچ کر انہوں نے ساری صورت حال کا جائزہ لیا تو انہیں مدینے پر حملہ نہ کرنے کا افسوس ہوا۔ اور وہ پلٹ کر دوبارہ حملے کرنے کے لئے رک گئے۔ مگر اس سے پہلے وہ کسی معتبر ذریعے سے مسلمانوں کے ردِ عمل اور "تازہ ترین" صورت حال سے آگاہ ہونا چاہتے تھے۔

۷- آنحضرتؐ کو لشکر قریش کے انداز روانگی سے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ مکے واپس جا رہے ہیں۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ نماز ظہر ادا کی۔ زخموں اور کمزوری کی وجہ سے یہ نماز سب نے بیٹھ کر ہی پڑھی۔ بعض لوگوں پر اس وقت اونگھ سی طاری ہو گئی اور اس اونگھ نے ہی ان کی تمام تکان وغیرہ دور کر دی۔ نماز کے بعد آپ نے شہداء کی لاشوں کو دفن کیا اور پھر مراجعت فرمائے مدینہ ہوئے۔

۸- جنگ میں حصہ لینے والے تمام مسلمانوں کو یہ رات (۱۵/۱۶ شوال) مسجد نبوی میں ہی رہنے کا حکم دیا گیا۔ وہیں عشاء کی نماز کے بعد آگ جلا کر زخمیوں کی مرہم پٹی کی جاتی رہی۔ بعض زخمیوں کو ان کے گھر والوں کی درخواست پر دیکھ بھال کی سہولت کے پیش نظر گھر جانے کی اجازت دی گئی۔ زخموں سے نڈھال مسلمان مسجد میں کراہ رہے تھے مگر سب کو اپنے زخموں سے زیادہ حضورؐ کے زخمی ہونے پر ندامت تھی۔ ادھر مدینے میں شہداء کے گھروں میں کہرام بپا تھا۔ اس حالت میں منافقین تعزیت کے بہانے مسلمان گھروں میں جا جا کر باتیں بناتے شماتت کرتے اور بددل کر کے آنحضرتؐ کا ساتھ چھوڑ دینے کی ترغیب دیتے۔ کبھی کہتے کہ " اگر ہماری بات مانی جاتی اور یہ لوگ بھی گھروں میں ہی بیٹھ رہتے تو یوں مارے جاتے؟ کسی سے کہتے "اگر پیغمبرؐ ہماری بات مانتے اور ہمیں کسی فیصلے کا اختیار ہوتا تو یہ نوبت کیوں آتی؟ ---- بعض کہتے " دیکھو جی ستر مرنے والوں میں صرف تین مہاجر اور باقی سب ہمارے بھائی بند (انصار) ہیں۔ ان لوگوں کا کیا گیا"۔ منافقین کی یہ شیطانی چال اور ابلیسانہ وسوسے جنگ کے صدمے اور تیروں کے زخموں سے بھی زیادہ خطرناک تھے۔

۹- فجر کی نماز ان سب لوگوں نے مسجد نبوی میں ہتھیاروں کے ساتھ ادا کی۔ نماز

Marfat.com

کے بعد حضورؐ نے حکم دیا کہ تمام وہ لوگ جو کل احد کے معرکے میں شریک تھے کفار کے تعاقب کے لیے ہمارے ہمراہ چلیں۔ زخموں سے چور مسلمان حکم نبوی کی تعمیل میں بلاچوں و چرا بلکہ تلافی مافات کے جذبے سے سرشار ہو کر نکل کھڑے ہوئے(۱)۔ حضور نے آٹھ دس میل دور پہنچ کر مقام حمراء الاسد میں قیام کیا۔ قریش اس سے چند میل جنوب کی طرف مقام روحا میں رک کر مدینے پر دوبارہ حملے کے مشورے کر رہے تھے۔ آنحضرتؐ کے ایک خیر خواہ معبد الخزاعی نے کفار کو مسلمانوں کے نئے ولولہ انتقام اور کفار کے تعاقب میں آنے کی خبر کچھ اس خوفناک طریقے پر سنائی کہ ابو سفیان اور اس کے ہمراہیوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ ادھر حضورؐ نے ہر مسلمان کو رات کے وقت اپنی اپنی جگہ آگ روشن کرنے کا حکم دیا دور سے آگ کی اتنے رقبے میں پھیلی ہوئی روشنی سے کفار نے مسلمانوں کی کثرت کا اندازہ کیا اور مکے کی طرف لوٹ جانے میں عافیت دیکھی۔ خدا نے کفار کے دلوں میں ایسا رعب ڈالا کہ انہیں یہ آگ اپنے پیچھے چلتی معلوم ہوتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے مکے سے ادھر دم نہیں لیا۔ آنحضرتؐ نے ۱۹ شوال بدھ کے دن تک یعنی تین دن حمراء الاسد میں قیام کیا۔ چوتھے دن حضورؐ اپنے جاں نثاروں کے ساتھ مدینے واپس تشریف لائے۔ کفار کے اس تعاقب کی وجہ سے مدینے کے منافق اور یہودی مسلمانوں کی جرات پر حیران رہ گئے۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ اہل ایمان کا بلند حوصلہ (Morale) ان کی تخریبی سازشوں سے کسی طرح متاثر نہیں ہو سکتا۔

۱۰۔ ابوسفیان احد میں اگلے سال "میلہ بدر" کے موقع پر مقابلے کا چیلنج دے آیا تھا۔ چنانچہ دوسرے سال ان ہی دنوں وہ مکہ سے روانہ ہوا۔ مرالظہران کے مقام پر پہنچا تو اس کے دل میں ایک خوف سا پیدا ہوا۔ چنانچہ وہیں سے واپس ہو گیا مگر ایک شخص ابو نعیم بن مسعود اشجعی کو معقول اجرت دے کر اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مدینے جا کر

۱۔ بعض زخمی صحابہ بغیر سواری کے لنگڑاتے ہوئے ہمراہ ہو لیے تھے۔

Marfat.com

قریش کی فوجی تیاریوں کے افسانے سنائے اور مسلمانوں کو مرعوب کرے۔ منافق تو یہ باتیں سن کر کانپنے لگے مگر مخلص مسلمانوں نے ان باتوں کی پرواہ نہیں کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ صحابہ کی ایک جماعت حسب وعدہ میدان بدر تک گئی۔ کافر تو وہاں کوئی پہنچا ہی نہیں تھا۔ دو چار دن ٹھیر کر ان لوگوں نے "میلہ بدر" میں کچھ خرید و فروخت کی جس سے دگنا نفع اٹھایا اور بخیریت مدینے واپس آئے۔ اس مہم کو "غزوۂ بدر صغریٰ" کہتے ہیں۔

سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے ان تمام واقعات پر تبصرہ کیا ہے۔

وفد نجران کا قصہ

۹ ھ کے آخر اور ۱۰ ھ کے شروع میں عرب سے قبائل کے وفود مدینے میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر رہے تھے۔ اسی موقع پر نجران کے کچھ عیسائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بات چیت اور مناظرہ کرنے کے لیے مدینے پہنچے۔ نجران، یمن کے علاقے میں ایک جگہ ہے، عیسائی حبشیوں کے یمن پر تسلط کے زمانے میں نجران سرکردہ عرب عیسائیوں کا ایک مرکز (Bishopric) بن گیا تھا۔ نجران کے عیسائیوں کا یہ وفد ساٹھ آدمیوں پر مشتمل تھا جس میں چودہ سوار تھے وفد میں نجران کے دو بڑے سیاسی لیڈروں عبدالمسیح اور ایہم کے علاوہ ان کا اسقف (Bishop) ابو حارثہ بن علقمہ بھی شامل تھا۔ اس پادری کی عیسائی بزنطینی دربار میں بڑی منزلت تھی۔ اور ایک طرح سے وہ کلیسائے عرب کا رئیس تھا۔ یہ لوگ اپنے لہراتے ہوئے ریشمی پادریانہ چغوں (Chasubles) پر لٹکتی ہوئی صلیبوں کے ساتھ ایک عجیب انداز سے مدینے میں داخل ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مسجد نبوی ہی کے ایک حصے میں ٹھیرایا اور مسجد ہی میں اپنے طریقے کے مطابق عبادت کرنے کی بھی اجازت عطا فرمائی۔ دوسرے دن سے انہوں نے بحث مباحثہ کا آغاز کیا۔ انہوں نے حضرت مسیحؑ کی الوہیت و ابنیت کے استدلال میں یہ کہا کہ "عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ بیماروں

Marfat.com

کو شفا دیتے تھے۔ غیب کی باتیں بتاتے تھے۔ مٹی کی مورتوں میں پھونک مار کر اڑتا ہوا زندہ پرندہ بنا دیتے تھے۔ نیز وہ باپ کے بغیر پیدا ہوئے تھے۔ اور انہوں نے گہوارہ میں کلام کیا - ان سب امور میں کوئی ان کا مدِّ مقابل نہیں لہٰذا وہ خدا کا اوتار اور ابن اللہ تھے"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام باتوں کو تسلیم کرتے ہوئے ان لوگوں کے سامنے حضرت مسیح علیہ السلام کی "بشریت" پر زور دیا۔ اور ان کے رحم مادر سے پیدا ہونے ' کھانے پینے ' رنج و غم کا احساس ہونے ' کائنات کا محافظ و نگران نہ ہونے ' بلکہ خود خدا کی حفاظت کا محتاج ہونے کے ان پہلوؤں سے استدلال کیا جس سے وہ پادری بھی انکار نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود یہ لوگ اپنے عقیدے پر قائم رہے۔ اس پر سورہ آل عمران کی ابتدائی ۸۳ آیات نازل ہوئیں۔ جن میں سے آیت نمبر ۶۱ میں مباہلہ کے ذریعے فیصلہ کر لینے کی تجویز تھی۔ پہلے تو یہ لوگ اس پر رضامند ہو گئے۔ چنانچہ دوسرے دن وفد کے تینوں بڑے سردار اور عبدالمسیح وایہم کا ایک ایک لڑکا زرق برق لباس میں ملبوس باہر آئے۔ ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ علیؓ اور حسنؓ و حسینؓ کو ہمراہ لیا اور مسجد میں آکر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئے اور دعا مانگنے کے لیے تیار ہوئے۔ عبدالمسیح نے اپنے اسقف ابو حارثہ سے کہا "پادری صاحب ! آپ آگے ہو کر مباہلہ (کی بد دعا) میں شامل ہوں"۔ ابو حارثہ گھبرا گیا اور کہنے لگا بخدا یہ شخص مباہلہ سے کسی طرح ٹلتا نظر نہیں آتا۔ اگر یہ سچا ہوا تو مباہلے کے ایک سال بعد تک کوئی عیسائی کہیں ڈھونڈے سے نہیں ملے گا' چنانچہ یہ لوگ مباہلہ کی بجائے جزیہ دینے پر رضامند ہو گئے اور ایک معاہدہ کر کے واپس چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر ان میں سے ایہم نے اسلام قبول کر لیا۔ باقی بدستور عیسائیت پر قائم رہے۔

سورت کے مضامین کا اجمالی خاکہ

اس سورت میں خصوصیت کے ساتھ دو گروہوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔

۱- اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) اور

Marfat.com

۲- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے مسلمان۔

کفار مکہ اور منافقین مدینہ کا ذکر بھی ضمناً اس میں موجود ہے مگر سورت کے اصل موضوع دو ہی ہیں۔

۱- اہل کتاب خصوصاً عیسائیوں کو دین ابراہیمی (اسلام) کی طرف دعوت دینا۔

۲- مسلمانوں کو "مسائل حاضرہ" کے متعلق ہدایات دینا مجموعی طور پر سورت کے جملہ مضامین کو مندرجہ ذیل ضمنی عنوانات کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے:-

۱- عقیدۂ توحید اور صفات باری تعالیٰ

عیسائیوں بلکہ تمام مشرکوں نے صفات الٰہی کو ہی نہ سمجھ کر ٹھوکر کھائی ہے۔ اس سورت میں اس موضوع پر جو کچھ کہا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

۱- اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

۲- وہ حیّ و قیوم ہے۔

۳- اس سے زمین و آسمان کی کوئی شے پوشیدہ نہیں

۴- وہی رحم مادر میں ہر ایک کو اپنی مرضی سے صورت دیتا ہے

۵- اس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے کتابیں نازل کی ہیں

۶- وہ وہاب اور داتا ہے

۷- وہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا

۸- اس کی سزا بڑی سخت ہے اور وہ سزا دینے پر پوری طرح قادر ہے۔

۹- وہ بندوں پر بے حد مہربان ہے

۱۰- وہ سمیع و علیم اور غفور رحیم ہے

۱۱- ہر چیز پر قادر ہے

۱۲- بندوں کی فطرت پر نظر رکھتا ہے

Marfat.com

۱۳- جو چاہتا ہے کرتا ہے اور بناتا ہے

۱۴- جسے چاہے بے حساب روزی دیتا ہے

۱۵- جس بات کا حکم دے فوراً ہو جاتی ہے (کن فیکون)

۱۶- وہ دشمنان حق کے مقابلے پر بہترین چال چلنے والا ہے

۱۷- وہ سینوں میں چھپے ہوئے بھیدوں سے آگاہ ہے

۱۸- وہ جہاں والوں پر ظلم نہیں کرتا

۱۹- وہ سارے جہاں سے بے نیاز ہے کسی کا محتاج نہیں

۲۰- وہ مومنوں پر بڑی نوازشیں کرتا ہے۔

۲۱- تمام اختیارات اکیلے اسی کے ہاتھ میں ہیں

۲۲- وہ کسی کی محنت ضائع نہیں کرنا

۲۳- وہ جلد حساب لے لیتا ہے

۲۴- اس نے یہ کائنات بے مقصد نہیں بنائی۔

۲- انبیاء اور منصب نبوت کے متعلق چند حقائق

۱- تمام انبیاء میثاق ربانی کے پابند تھے۔ (آیت ۸۱)

۲- کسی نبی نے شرک اور اپنی عبادت کی تعلیم نہیں دی بلکہ وہ اللہ کی طرف بلانے والے تھے (آیت ۷۹-۸۰)

۳- نبی کو کسی کی توبہ و بخشش کا اختیار نہیں ہوتا (آیت ۱۲۸)

۴- مخالفتیں اور ناکامیاں نبی کے عزم پر اثرانداز نہیں ہوتیں۔ (آیت ۱۴۶، ۱۴۷)

۵- کوئی نبی خیانت نہیں کرتا (آیت ۱۶۱)

۶- انبیاء ہمیشہ جھٹلائے جاتے رہے (آیت ۱۸۴)

۷- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت خدا کا ایک بہت بڑا احسان ہے (آیت ۱۶۴)

Marfat.com

۸- آنحضور کا نرم مزاج اور خوش خو ہونا بھی اللہ کی رحمت ہے(آیت ۱۶۶)

۹- آنحضورؐ کی پیروی اور اطاعت کئے بغیر خدا کی محبت کا دعوی بے بنیاد ہے (آیت ۳۱)

۱۰- دین ابراہیمی ہی اصل دین اسلام ہے اور یہ دین اب صرف آنحضورؐ کے ذریعے حاصل اور معلوم ہو سکتا ہے (آیت ۶۸)

۳- قرآن کریم

۱- اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب ہے۔

۲- اس کی آیات میں محکمات بھی ہیں اور متشابہات بھی۔

۳- یہ لوگوں کے لیے واضح ہدایت اور پرہیزگاروں کے لیے نصیحت ہے (آیت ۱۳۸)

۴- اس کی تلاوت کفر و گمراہی سے بچاتی ہے (آیت ۱۰۱)

۴- آخرت اور جزائے اعمال

۱- ہر شخص نے مرنا ہے اور اپنے اعمال کا ٹھیک بدلا پانا ہے (آیت ۱۸۵)۔

۲- بلاشبہ ایک دن سب لوگوں کو خدا کے سامنے اکٹھے ہونا ہے (آیت ۹) اور جمع ہو کر اعمال کا ٹھیک بدلا پانا ہے (آیت ۲۵)

۳- آخرت کے انعامات دنیوی مال و متاع سے کہیں زیادہ بہتر چیز ہیں (آیت ۱۵)

۴- انکار کرنے والوں کے لیے آگ کی سزا ہو گی (آیت ۱۳ اور ۱۸۲)

۵- سب گناہ لکھ لیے جائیں گے اور انسان کو اپنی ہی کرتوتوں کا بدلہ ملے گا۔ (آیت ۱۸۱-۱۸۲)

۶- خدا کسی محنت کرنے والے کی محنت ضائع نہیں کرے گا (آیت ۱۹۵)

Marfat.com

۷- قیامت کو ہر شخص اپنی ہر نیکی و بدی کو سامنے موجود پائے گا (آیت ۳۰)

۸- قیامت میں نیک لوگ سرخرو ہوں گے اور بدکار و فاسق روسیاہ (آیت ۱۰۶)

۵- دین اسلام اور اس کی اہمیت

۱- اسلام خدا کے آگے جھک جانے کا نام ہے (آیت ۲۰)

۲- اللہ کے ہاں مقبول دین صرف اسلام ہے (آیت ۱۹)

۳- جو اسلام کو چھوڑ کر اور دین تلاش کر لے گا اس کا وہ دین ہر گز قبول نہ ہو گا (آیت ۸۵)۔

۴- زمین و آسمان کی ہر چیز خدا کی فرماں بردار ہے لہٰذا "اللہ کا دین" یہی ہے کہ اس کی فرماں برداری کی جائے (اور یہی اسلام ہے) (آیت ۸۳)۔

۵- اصلی دین ابراہیمی (جس کے مدعی یہودی عیسائی اور مشرکین عرب سب ہی تھے) وہ یہی دین اسلام ہے(آیت ۶۷، ۶۸، ۸۴، ۹۵)

۶- اسلام کا سب سے پہلا مرکز خانہ کعبہ ہے (آیت ۹۶)

۷- تمہارا خاتمہ اسلام پر ہی ہونا چاہیے یعنی ہر لمحہ اپنے اسلام پر نگاہ رکھو (آیت ۱۰۲)

۶- اہل ایمان اور سچے مسلمانوں کے اخلاق و صفات

۱- مومن خدا سے ہدایت کا طالب ہوتا ہے اور اس کا دعا پر یقین ہوتا ہے (آیت ۸)

۲- وہ ثابت قدم، صابر، خدا کا فرماں بردار، راستباز اور راہ خدا میں مال خرچ کرنے والا ہوتا ہے (آیت ۱۷)

Marfat.com

۳- وہ پچھلی رات کو خدا سے اپنی لغزشوں کی معافی مانگتا ہے یعنی اسے پتہ ہے کہ "کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی" (آیت ۱۷)

۴- مومن کی فیاضی، معاشی خوشحالی یا بدحالی کے تابع نہیں ہوتی (آیت ۱۳۴)

۵- وہ غصے میں اپنے آپ پر قابو رکھتا ہے اور ہمیشہ درگزر سے کام لیتا ہے (آیت ۱۳۴)

۶- وہ کسی بے حیائی یا گناہ کا مرتکب ہو بیٹھنے پر فوراً خدا کو یاد کرتا، اپنی اصلاح کرتا اور خدا سے معافی کا طلبگار ہوتا ہے۔ وہ کبھی گناہ پر دانستہ اصرار نہیں کرتا (آیت ۱۳۵)

۷- مومن کائنات میں غوروفکر کرتا ہے اور عذاب دوزخ سے پناہ مانگتا ہے (آیت ۱۹۱)

۸- مومن راہِ خدا میں پست ہمتی اور کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرتا (آیت ۱۴۶)

۷- مسلمانوں کی اجتماعی و ملی زندگی سے متعلق احکام

۱- ملی زندگی میں مسلمانوں کو چھوڑ کر غیر مسلموں کی دوستی اور "امداد" پر بھروسہ مت کرو (آیت ۲۸)

۲- دعویٰ ایمان کے بعد (عملاً) کفر کا رویہ اختیار کرنے سے "منزل مراد" کبھی نہیں ملے گی (آیت ۸۶)۔

۳- سب مل کر اللہ کی رسی کو اتحاد کا ذریعہ بناؤ (اتحاد کی باقی بنیادیں ہی باطل ہیں) اور تفرقہ میں مت پڑو (آیت ۱۰۲)

۴- امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور دعوت الی الخیر سے کبھی غافل نہ ہونا۔ تمہاری ملی زندگی میں اس کام کو کرنے کے لیے ایک مستقل "ادارہ" ہونا چاہیے (آیت ۱۰۴)

Marfat.com

۵- کبھی بھی غیر مسلموں کو اپنا رازدار نہ بناؤ (آیت ۱۱۸)

۶- حوصلے پست نہ ہونے دو اور دل شکستہ نہ ہو جاؤ بلکہ اپنے غلبہ کا یقین رکھو (آیت ۱۳۹)

۷- ہمیشہ اللہ کو اپنا حقیقی مددگار سمجھو اور اتنے بے غیرت یا بے وقوف نہ بنو کہ کافروں کی ہر بات ماننے لگو ورنہ تمہاری اپنی ملی زندگی ختم ہو جائے گی (آیت ۱۴۹-۱۵۰)

۸- راہ خدا میں مرنے کو حیات جاوید سمجھو (آیت ۱۶۹)

۸- "مشکلات لا الہ" :-

۱- جہاد و ثابت قدمی کا امتحان دئے بغیر بہشت نہیں ملے گا (آیت ۱۴۲)

۲- "گردش ایام" کے ذریعے بھی آزمایا جائے گا (آیت ۱۴۰)

۳- خدا تمہاری اس طرح پرکھ کریگا کہ سینوں اور دلوں کی بات عیاں ہو جائے گی (آیت ۱۵۴)

۴- خدا نیک و بد میں فرق ظاہر کیے بغیر نہ چھوڑے گا (آیت ۱۷۹)

۵- مال و جان میں آزمائش کے علاوہ لوگوں کی بدگوئی اور طعن و تشنیع کا نشانہ بھی بننا پڑے گا (آیت ۱۸۶)

۶- گھروں سے نکالے جانے۔ ستائے جانے اور مرنے مارنے کی نوبت بھی آ سکتی ہے (آیت ۱۹۶)

۷- دنیوی زندگی کی آسائشیں اور حبِّ جاہ و مال پہلی کٹھن منزل ہے جہاں اکثر "راہی" بھٹک کر رہ جاتے ہیں (آیت ۱۴)۔

۸- یاد رہے یہ دنیا "نقلی مال" اور دھوکے کی جنس ہے (آیت ۱۸۵)

۹- لوگوں سے اپنی تعریف سننے کا چسکا اور فرضی کاروائیوں پر داد پانے کی خواہش ہلاکت و عذاب کا راستہ ہے (آیت ۱۸۸)

Marfat.com

۱۰- اپنی عزیز ترین چیزیں قربان کئے بغیر نیکی کا کوئی بلند درجہ حاصل نہیں ہو گا (آیت ۹۲)

۹- فقہی احکام :-

اس سورت میں صرف دو فقہی حکم ہیں:

۱- فرضیت حج (آیت ۹۷)

۲- ممانعت سود (آیت ۱۳۰)

۱۰- جنگ احد کے واقعات کی طرف اشارے

اس سورت میں جنگ احد کے ان واقعات کی طرف اشارے کئے گئے ہیں (جن کی ضروری تفصیلات ' تعارفِ سورت میں بیان ہو چکی ہے)۔

۱- صف آرائی صبح کو ہوئی تھی (آیت۱۲۱)

۲- قبیلوں (بنو سلمہ وحارثہ) کی طرف سے بزدلی کا اظہار (آیت ۱۲۱)

۳- بدر سے غیر حاضر جوشیلے نوجوانوں کا ولولۂ جہاد (آیت ۱۴۰)۔

۴- فتح ہوئی مگر اسی وقت شکست میں بدل گئی کیونکہ ایک سبق سکھانا مقصود تھا (آیت ۱۵۲-۱۵۴)

۵- آنحضرتؐ کی وفات کی افواہ (آیت ۱۴۴)

۶- کافروں پر رعب طاری ہونا اور ان کا مدینے کا رخ نہ کرنا (آیت۱۵۱)

۷- تیر اندازوں کی نافرمانی اور لالچ شکست کا باعث ہوئے (آیت ۱۵۲)

۸- بعض مسلمانوں کا بھاگ کھڑے ہونا (آیت ۱۵۳ اور آیت۱۵۵)

۹- حضورؐ کا لوگوں کو پکارنا (آیت ۱۵۳)

۱۰- منافقوں کا باتیں بنانا اور مسلمانوں میں بد دلی پھیلانا (آیت ۱۵۴ ' ۱۵۶ ' ۱۶۸)۔

۱۱- واقعہ حمراء الاسد (آیت ۱۷۲ تا ۱۷۵)

Marfat.com

۱۲- مسلمانوں کو نقصان ضرور پہنچا (آیت ۱۴۰ ' ۱۶۵)

۱۳- غزوۂ بدر صغریٰ کی طرف اشارہ (آیت ۱۷۳ تا ۱۷۵)۔

۱۱- کفر اور اس کے نتائج

۱- کافروں کو سخت سزا ہو گی اور مال وغیرہ کام نہ آئے گا (آیت ۴-۱۰)

۲- کافر آخرکار مغلوب ہی ہوں گے (آیت ۱۲)

۳- کفر بعض دفعہ "قتل انبیاء و مصلحین" جیسے فعل شنیع کا مرتکب بنا دیتا ہے (آیت ۱۲)۔

۴- کفر پر اصرار اور اسی حالت میں موت بدبختی کی آخری منزل ہے (آیت ۲۱)

۵- کافر کی "نیکیاں (مثلاً فیاضی و سخاوت وغیرہ) بھی برباد ہوں گی (آیت ۱۱۷)

۶- کافروں کی "ترقی" یا ان کا دندناتے پھرنا ۔ بس تھوڑی دیر کی بات ہے (آیت ۱۹۶)

۷- کافر مہلت کو "اصلاح کا موقع" سمجھنے کی بجائے "فرصت گناہ" ہی سمجھتا ہے (آیت ۱۷۸)۔

۸- کافر خدا کا کچھ نہیں بگاڑتے ' اپنا ہی نقصان کرتے ہیں (آیت ۱۷۶)۔

۱۲- منافقوں کا کردار

۱- جنگ احد میں نقصان کی "عقلی توجیہات" کرتے تھے (جس کا اصل مقصد بددلی پھیلانا تھا) (آیت ۱۵۴)

۲- اپنے ساتھیوں کو مسلمانوں کے ساتھ مل کر لڑنے سے بددل کرتے اور کہتے "گھر بہرحال محفوظ جگہ ہے" (آیت ۱۵۶)

Marfat.com

۳- جنگ احد میں آنحضرتؐ کے فیصلے کو ہدف تنقید بناتے تھے (آیت ۱۶۷ ' ۱۶۸)

۴- دشمن کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر گھبرا جاتے تھے۔

۱۳- اہل کتاب کی خرابیاں

۱- محض باہمی ضد سے دین کے ٹکڑے کئے اور اختلاف میں پڑے (آیت ۱۹)

۲- کہتے تھے ہمیں عذاب بھی ہو گا تو چار دن اور اسی طرح کی خود ساختہ غلط فہمیوں میں مبتلا تھے (آیت ۲۴)

۳- چاہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کو راہ حق سے بھٹکا دیں (آیت ۶۹)

۴- سچ کو چھپاتے تھے اور حق پر بھی باطل کا رنگ چڑھا دیتے تھے (آیت ۷۱)۔

۵- بددیانتی ان کی قومی خصوصیت بن گئی تھی اور غیر یہودیوں سے بددیانتی و برائی کو قابل مواخذہ نہیں سمجھتے تھے (آیت ۷۵)۔

۶- خدا کے عہد کو بہت کم قیمت پر بیچ دیتے تھے یعنی معمولی نفع کی خاطر بھی احکامِ الٰہی کی پروا نہ کرتے تھے (آیت ۷۷)

۷- زبان چبا کر بات کرنے کے عادی تھے اور خدا کی کتاب تک میں زبان کے الٹ پھیر سے باز نہیں آتے تھے (آیت ۷۸)۔

۸- اپنے مخصوص مفادات کی بنا پر لوگوں کو راہ خدا سے بھی باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے (آیت ۹۹)

۹- اللہ کے احکام کی عمداً خلاف ورزی ' نافرمانی اور قتل انبیاء ان کا مشغلہ بن گیا تھا (آیت ۱۱۲)

۱۰- شامتِ اعمال سے ان پر مفلسی و محتاجی مسلط کی گئی۔ اور خدا کا غضب نازل ہوا (آیت ۱۱۲)۔

Marfat.com

۱۱- کلماتِ کفر بکنے سے باز نہیں آتے تھے (آیت۱۸۱)

۱۲- میثاق ربانی (دربارۂ تبلیغ و توضیح کتاب) کو پس پشت ڈال دیا تھا (آیت۱۹۷)

۱۴- مسلمانوں سے اہل کتاب کا رویّہ

۱- دعوت اسلام سے روگردانی کرتے بلکہ احکام خداوندی قبول کرنے کو ہی تیار نہ تھے(آیت۲۳)

۲- لوگوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے بڑی خطرناک اور فاسد تدابیر سوچتے تھے (آیت۷۲)۔

۳- بعض فروعی مسائل (مثلاً حرمت لحوم ابل) کو دین ابراہیمی کی "اصل" کہہ کر اسلام کو "خلافِ دین ابراہیمؑ" قرار دیتے تھے (آیت۹۳)۔

۴- قرآن نے پیشگوئی فرما دی کہ یہ لوگ مسلمانوں کو کوئی (بڑا) نقصان نہیں پہنچا سکیں گے اور فوجی مقابلے میں بھی بھاگ جائیں گے (آیت ۱۱۱)

۵- مسلمانوں کے خلاف ان کے اندر سخت اور شدید کینہ بھرا ہوا تھا (آیت ۱۱۸' ۱۱۹)

۶- مسلمانوں کو تکلیف پہنچنے پر خوش ہوتے تھے اور ان کی کامیابیوں پر منہ بسور لیتے تھے (آیت ۱۲۰)

۷- آنحضرتؐ سے عجیب عجیب معجزات کا مطالبہ کرتے تھے (آیت ۱۸۳'۱۸۴)

۱۵- اہل کتاب میں اسلام کیلئے بہترین "خام مال" کی نشاندہی

اس سورت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ سب اہل کتاب برابر نہیں ۔ ان میں

Marfat.com

نیکو کار اور صحیح قسم کے "مذہبی" (Religious Minded) موجود ہیں ' جو نیکی و بھلائی خدا ترسی ' عبادت گزاری ' ایمانداری ' دیانت و امانت ' جیسے اوصاف سے متصف ہیں وہ برائی سے نفرت کرتے اور اس سے روکتے ہیں اور مذہب کو دنیاداری کے لیے استعمال نہیں کرتے آیات ۷۵' ۱۱۰' ۱۱۳' ۱۱۴ اور ۱۹۹۔ اس قسم کے لوگوں میں تبلیغ اسلام ہونی چاہیے۔

۱۶۔ اہلِ کتاب کو دعوت و تبلیغ

۱۔ اہل کتاب کو اسلام کی طرف بلاؤ (آیت ' ۲۰)

۲۔ انہیں توحید خالص کی طرف دعوت دو۔ دین ابراہیمی کی اصل تو یہی ہے(آیت ۶۴)

۳۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی "مسلم" تھے۔ اور اب آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی دین ابراہیمی کو اصل شکل میں پیش کیا ہے۔ (آیت ۶۵' ۶۸)

۴۔ اے اہل کتاب ! تمہاری اپنی کتابوں سے آنخضرتؐ کی صداقت ثابت ہوتی ہے۔ تم جان بوجھ کر حق کو چھپانے ' اس پر باطل کی رنگ آمیزی کرنے' لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنے اور غلط راستے پر ڈالنے کے مرتکب نہ بنو آیت ۱۱۷' ۱۱۸)۔

۵۔ اہلِ کتاب سے کہو کہ ہم ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے تمام انبیاء اور ان کی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور خدا ہی کے سامنے جھکتے ہیں۔ (آیت ۸۴)

۶۔ نبی کی صداقت کو اس کے معجزات کی بجائے اس کی روشن نشانیوں میں تلاش کرو گے تو حقیقت پا جاؤ گے(۱۸۳'۱۸۴)۔

Marfat.com

۱۷- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق چند حقائق اور عیسائیوں پر اتمام حجت

۱- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ مریم علیہا السلام نہایت پاکباز خاتون تھیں۔

۲- حضرت عیسیٰؑ کنواری مریمؑ سے بغیر باپ کے، اللہ کی قدرت کاملہ سے پیدا ہوئے۔اور حضرت مریمؑ کو پہلے ہی اس کی خبر دے دی گئی تھی۔

۳- حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نبی بنایا اور انہیں تورات کا مکمل علم بخشا اور نئی کتاب (انجیل) عطا فرمائی۔

۴- حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھوں بعض خارق عادت امور (معجزات) اللہ کے حکم سے سرزد ہوئے۔

۵- حضرت عیسیٰؑ بہرحال فانی انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ضرور وفات دے گا۔ آخر فنا ہونے والا معبود نہیں ہو سکتا۔

۶- حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام اللہ ہی کو اپنا پروردگار مانتے تھے اور صرف اسی کی عبادت کی طرف دعوت دیتے تھے۔

۷- حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ پیدائش (اور معجزات) سے ان کی الوہیت و ابنیت کا نتیجہ نکالنا بڑی گمراہی ہے ۔ انسان اوّل (حضرت آدمؑ) کی پیدائش تو پھر اس سے بھی بڑا معجزہ ہے۔ (آیات ۳۶ تا ۶۰)۔

نوٹ: سورت آل عمران کی ان آیات کا خلاصہ دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ جس طرح ان معجزات کی وجہ سے مسیحؑ خدا کے اوتار اور ابن اللہ نہیں بن جاتے۔ اسی طرح ان کو الوہیت و ابنیت کے عقیدے کی تردید کے لیے ان تمام معجزات کا انکار ضروری نہیں ہے۔ قرآن کریم صرف حقائق بیان کرتا ہے۔ اور حضرت عیسیٰؑ کے

Marfat.com

متعلق افراط و تفریط کا شکار تو لوگ ہمیشہ سے رہے ہیں۔

۱۸- سورت کی دعائیں

اس سورت میں چند بڑی ایمان افروز دعائیں ہیں۔

ایک اچھے مسلمان کو یہ دعائیں یاد ہونی چاہئیں۔ بلکہ اس کی دعا اسی طرح ہونی چاہیے یہ دعائیں اہل ایمان کے رب کے ساتھ تعلق اور ان کی دوسری مومنانہ صفات کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہ دعائیں بالواسطہ یہ سکھاتی ہیں کہ:

۱- مومن اپنے پروردگار سے ہی ہدایت طلب کرتا ہے اور جانتا ہے کہ یہ اس کی رحمت سے ملتی ہے (آیت ۸)

۲- اسے مر کر اپنے رب کے ہاں حاضر ہونے کا یقین ہوتا ہے(آیت ۹)

۳- اسے یقین ہوتا ہے کہ دنیوی نفع و نقصان۔ عزت و دولت۔ حکومت و غلامی۔ زندگی و موت اور رزق و معاش سب اللہ کے اختیار میں ہیں(آیت ۲۶'۲۷)

۴- وہ جانتا ہے کہ نسلوں کا ختم کرنا یا برقرار رکھنا اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے(آیت ۳۸)۔

۵- وہ آسمانی ہدایت کو ماننا اور خدا کے پیغمبروں کی پیروی کرتا ہے(آیت ۵۳)۔

۶- مومن مشکلات اور دشمن سے مقابلے کے وقت اپنی کمزوریوں اور لغزشوں پر نظر رکھتا ہے اور پروردگار سے ثبات و نصرت طلب کرتا (آیت ۱۴۸)

۷- مومن کائنات میں غوروفکر کر کے صحیح نتائج پر پہنچتا ہے۔ وہ آخرت کی رسوائی سے بچنے کی کوشش کرتا ہے وہ دعوت الی الحق پر لبیک کہتا ہے۔ وہ گناہوں اور برائیوں سے بچتا ہے اور جو برائی ہو چکی ہے اس کی بخشش چاہتا اور تلافی کرتا ہے۔ وہ مرتے دم تک نیکو کاروں

Marfat.com

اور راستبازوں کا ساتھ دیتا ہے۔ اسے انبیاء کی تعلیم اور آنے والی زندگی کے متعلق ان کے وعدوں پر یقین ہوتا ہے آیات ۱۹۱ تا ۱۹۴

نوٹ:- تمام وہ آیات جن میں یہ دعائیں آئی ہیں نمبر کے حوالے کے ساتھ اوپر بیان کر دی گئی ہیں۔ کوشش کیجیے کہ آپ ان سب کو یا اکثر کو یاد کر لیں اور اپنی نمازوں میں مفہوم کو ذہن میں رکھ کر یہی دعائیں مانگا کریں۔

۱۹- سورت سے حکمت و دانش ' بلاغت اور اسلامی ثقافت سیکھنے کا ایک طریقہ

اس سورت میں متعدد ایسے چھوٹے چھوٹے جملے ہیں جن کا یاد کر لینا بہت آسان ہے اور جو اپنے مطالب و معانی کے اعتبار سے مختلف موقعوں پر بولے اور لکھے جا سکتے ہیں۔ اس سے تقریر و تحریر میں نہ صرف حسن پیدا ہو گا بلکہ ان کے استعمال سے ذہن اسلامی سانچے میں ڈھلے گا۔ ذیل میں اس قسم کے "جامع کلمات" درج کیے جاتے ہیں۔ ساتھ آیت کا حوالہ نمبر لکھ دیا ہے۔ جب آپ ان آیات اور ان کلمات کے ترجمے اور معانی سے آگاہ ہو جائیں گے تو ان کا موقع استعمال بھی معلوم ہو جائے گا۔ مجلسی اور امتحانی ہر دو نقطہ نظر سے ان کلمات کا یاد کر لینا مفید ثابت ہو گا۔

وما يذّكر الا اولوا الالباب (آيت٧) ان فى ذالك لعبرة لاولى الابصار (آيت١٣)۔ ذالك متاع الحيوة الدنيا (آيت١٤)۔ ان الدين عند الله الاسلام (آيت١٩) والله على كل شىء قدير (آيت٢٩) يقول له كن فيكون (آيت٤٧) هذا صراط مستقيم (آيت٥١)۔ والله خير الماكرين (آيت ٥٤)۔ والله يعلم وانتم لا تعلمون (آيت٦٦)۔ والله لا يهدى القوم الظّلمين(آيت٨٦)۔ ولا تموتن الا وانتم مسلمون (آيت١٠٢)۔ واعتصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا (آيت١٠٣)۔ ولا تكونوا كالّذين تفرقوا واختلفوا (آيت١٠٥)۔ والله ولى المؤمنين (آيت٦٨)۔ لن تنالوا البرّ حتّىٰ تنفقوا (آيت٩٢) ولا تهنوا ولا تحزنوا (آيت١٣٩) فاذا عزمت

Marfat.com

فتوکل علی اللہ (آیت۱۵۹)۔ ان ینصرکم اللہ فلا غالب لکم (آیت۱۶۰)۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل(آیت۱۷۳)۔ وللہ میراث السّموت والارض (آیت۱۸۰) کل نفس ذائقة الموت (آیت۱۸۵) وما الحیوة الدنیا الا متاع الغرور (آیت۱۸۵)۔ ذالک من عزم الامور (آیت۱۸۶)۔ ربنا ما خلقت ھذا باطلا (آیت۱۹۱)۔ وما للظلمین من انصار (آیت۱۹۲)۔ وما عنداللہ خیر للأبرار (آیت۱۹۸)۔

۲۰- پاکستان کے بعض مسائل اور سورت آل عمران

قرآن کریم ہر زمانے میں ہدایت مہیا کرتا ہے۔ ہمارے آج کل کے بعض مسائل کے متعلق بھی سورت آل عمران میں یقیناً ہدایات موجود ہیں۔ کم از کم دو باتیں بالکل واضح ہیں۔

۱- عیسائیت سے "خطرہ"

سورت میں بتایا گیا ہے کہ اصل خطرہ "حب جاہ و مال" ہے۔ جہاں تک عیسائیوں کے عقائد کا تعلق ہے۔ اس میں عقل و دانش کو اپیل کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ الوہیت و ابنیتِ مسیح کے مقابلے پر حضرت مسیحؑ کو "عبدہ ورسولہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) نے وفد نجران کو مسیحؑ کے بارے میں سوال پر یہی جواب دیا تھا) کہنا ' زیادہ عقل کی بات ہے اور اس معاملے میں عیسائیوں پر مسلمانوں کو اتمام حجت کرنا چاہیے۔ عیسائیت اپنے عقائد کی "برتری" کے زور پر کبھی نہیں پھیل سکتی ہاں "حب الشھوات" کی حوصلہ افزائی کے بل بوتے پر پنپتی نظر آتی ہے اور پاکستان میں "عیسائیت" نہیں بلکہ "حب الشھوات" پھیل رہی ہے۔ اور اس کا تدارک "مباہلہ" و"مناظرہ" کی بجائے دوسرے ذرائع سے ہی ہو سکتا ہے۔

۲- ہمارے دفاعی مسائل

سورت میں غیر پر بھروسہ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ غیر مسلموں کو اپنا رازدار بنا کر ان سے خیر خواہی کو توقع رکھنے کو نادانی کہا گیا ہے۔ بتا دیا گیا ہے کہ "یک

Marfat.com

طرفہ" دوستی قومی بے غیرتی یا حماقت ہے۔ دنیا کو مقصد بنا لینا ' فتح کو بھی شکست میں بدل دیتا ہے۔ اپنے اندرونی دشمنوں (منافقوں) کی سازشوں سے خبردار رہنا چاہیے۔ اس کے ساتھ یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ پاکستان عصر حاضر میں پہلا ملک ہے ہے جو اسلام اور لا الہ الا اللہ کا نعرہ لے کر آیا ہے۔ یہ نعرہ نہ کفار (ہندوؤں) کو پسند ہے نہ اہل کتاب (عیسائیوں اور یہودیوں) کو ۔ لہٰذا وہ اگر برداشت بھی کریں گے تو اس "پاکستان" کو جو اسلام کا نعرہ ترک کر دے جس نعرے کے بغیر ہمارا ملی وجود ختم ہو جاتا ہے۔ دوست نما دشمن کو پہچاننا اصل دفاع ہے۔ اور اپنے مستقل ملی وجود پر اصرار ہی بقاء کی ضمانت ہے الغرض جنگ احد کے سلسلے میں اس سورت میں بہت سے اشارات ایسے موجود ہیں جو پاکستان کے دفاعی مسائل میں اہل ایمان کے لیے مشعل راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

بل اللہ مولکم وھو خیر النّاصرین (آیت ۱۵۰)۔

☆☆☆

Marfat.com

محکمات و متشابہات کی بحث

۱- قرآن مجید میں دو طرح کی آیات ہیں (۱) محکمات (۲) متشابہات

محکمات محکم کی جمع ہے (صیغۂ مونث آیت کے لیے ہے)۔ محکم کے لفظی معنی ہیں پختہ ' پکی چیز۔ اور عربی زبان کے محاورے میں اس بات کو کہتے ہیں جو ایسی صاف ہو جس سے ایک ہی مطلب سمجھ میں آئے۔ جس کا مفہوم متعین کرنے میں کسی اشتباہ کی گنجائش تک نہ ہو۔ جس کو اپنی مرضی کے معنی پہنانا دشوار ہوں۔ یہ آیات "کتاب کا اصل مدار اور اس کی بنیاد ہیں"۔ یہی آیات قرآن کے نازل ہونے کی اصل غرض کو پورا کرتی ہیں۔ کسی متشابہ آیت کا کوئی ایسا مطلب نکالنا ہر گز جائز نہیں جو ان صاف اور واضح آیات کے خلاف ہو۔ دین کے بنیادی اصول مثلاً عقیدۂ توحید اور اعمال حسنہ سب محکمات میں بیان ہوئے ہیں۔

متشابہات: متشابہ کے لفظی معنی ہیں ملتا جلتا جس کو دوسرے سے تمیز کرنا مشکل ہو اور محاورے میں اس کلام کو کہتے ہیں جو دوسرے کلام سے ایسا ملتا جلتا ہو کہ باہم تفریق و تمیز دشوار ہو۔ یا جس بات کے کئی مطلب سمجھ میں آتے ہوں اور بخوبی تمیز نہ ہو سکتی ہو کہ کونسا مطلب مقصود ہے۔ یا جو معنی اس کے الفاظ سے سمجھے جاتے ہوں۔۔ یا مختصراً یوں سمجھئے کہ متشابہات وہ ہیں جن کے معنی مراد اور مفہوم میں اشتباہ کی گنجائش ہو۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن میں آخر متشابہات لائی ہی کیوں گئیں؟

ہر سمجھ دار آدمی یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ قرآن مجید انسانوں کی زبان میں نازل ہوا ہے اور اس کا مقصد عوام و خواص سب کی ہدایت ہے۔ قرآن مجید میں بہت سی ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں جن کو انسان کے حواس خمسہ ظاہری و باطنی نے محسوس

Marfat.com

نہیں کیا ہے اور نہ ان کی کیفیات کو جانا ہے۔ اور اس قسم کے امور بیان کرنے کی ضرورت اس لیے بھی ہوئی کہ انسان کے لیے زندگی کا کوئی راستہ تجویز کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ اس کائنات کی حقیقت ' اس کے آغاز و انجام ' اس میں انسان کی حیثیت وغیرہ بنیادی باتوں کے متعلق کچھ ضروری معلومات دی جائیں۔ یہ ناممکن ہے کہ اس قسم کے مطالب آیات محکمات میں بیان ہو سکیں۔ کیونکہ جو چیزیں انسان کے حواس سے ماوراء ہیں۔ اور جو انسانی علم کی گرفت میں کبھی نہ آئی ہوں۔ ان کے لیے کسی بھی انسانی زبان میں ایسے الفاظ نہیں مل سکتے جس سے ہر سامع کے ذہن میں اصل مفہوم کی صحیح تصویر آجائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس قسم کے مضامین کے لیے وہ الفاظ اور اسلوب بیان اختیار کیا جائے جو اصل حقیقت سے قریب تر مشابہت رکھنے والی محسوس چیزوں کے لیے زبان میں پائے جاتے ہوں ۔ یا ان کا ذکر تمثیل کے پیرائے میں آیات متشابہات کے ذریعے کیا جائے۔

مزید برآن : قرآن مجید تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح ذی علم اور دانشمند اس سے ہدایت پائیں اسی طرح جاہل و نادان عوام اور بھیڑ بکریوں کے چرانے والے بھی ویسی ہی ہدایت پائیں۔ عوام اکثر حقائق امور کے سمجھنے کے قابل نہیں ہوئے (آپ کسی جاہل کو یونیورسٹی کا تصور دلانے کے لیے "بڑا مدرسہ" کا لفظ ہی استعمال کر سکتے ہیں)۔ بلکہ حالات زمانہ کے لحاظ سے یا اس علمی و سائنسی ترقی کے لحاظ سے جو کسی زمانے میں ہوئی ہوتی ہے۔ اکثر ذی علم بھی حقائق اشیا یا حقیقۃ الامر (Reality) کے سمجھنے سے عاجز ہوتے ہیں۔ اللہ کے پیغمبر کو ان (امور سے چنداں بحث نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ روحانی و اخلاقی اصلاح و تربیت کو مدنظر رکھ کر ان مطالب کو ایسے الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ اگر اس کے ایک پہلو پر خیال کرو تو اس سے وہ مطلب نکلتا ہے جو عوام کے خیالات یا اس زمانے کے اہلِ علم کی معلومات کے مناسب ہوتا ہے۔ لیکن اس میں ایک دوسرا پہلو مخفی بھی ہوتا ہے۔ اور جوں جوں

Marfat.com

علم اور معلومات کی ترقی ہوتی جاتی ہے تب سمجھ میں آتا ہے۔ بلکہ نبی تو ان حقیقتوں کو دیکھ رہا ہوتا ہے جنہیں شاید کسی بھی زمانے کا علم اور سائنس محسوس نہ کر سکے (مثلاً حیات مابعد الموت) ۔ اب ان حقائق کو اسی زبان میں بیان کرنا جسے لوگ بولتے اور سمجھتے ہیں کوئی آسان کام نہیں۔ پس ایک ایسی کتاب میں جیسا کہ قرآن مجید ہے آیات متشابہات کا ہونا لازمی امر ہے بلکہ ان کا ہونا ہی اس کی صداقت اور منزل من اللہ ہونے کی زبردست دلیل ہے۔ اور قرآن کریم کا یہ ایک بہت بڑا معجزہ ہے کہ وہ ان امور کو جو اصل اصول ہیں اور جن کے بغیر روحانی تربیت کا ہونا ناممکن ہے۔انہیں محکمات میں بیان کرتا ہے کہ جن کا مطلب صاف سمجھ میں آ سکے مگر ما بعد الطبیعی مضامین کے لیے ایسی زبان اختیار کرتا ہے جس کا مطلب ایک جاہل بھی سمجھ جائے مگر اس میں فکر و دانش کے بلند تر مرحلوں پر پہنچے ہوئے انسان کے لیے بھی کوئی "انکشاف" موجود ہو۔

شروع کی آیتوں میں عقیدہ توحید کی بات ہوئی ہے ۔ یہی مسئلہ محکم و متشابہ کی مثال ہے۔ اتنی بات محکم ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق و مالک ہے اور وہ علم، قدرت؛ غضب رحمت۔ سمع بصر۔ زندگی ۔ کلام اور انتظام وغیرہ صفات سے متصف ہے۔ مگر اس کی صفات کی اصل حقیقت کیا ہے یہ امر متشابہات میں سے ہے کیوں کہ ہم ان صفات کو بہرحال انسان میں اس قسم کی پائے جانے والی صفات پر ہی قیاس کریں گے۔ حالانکہ اصلی حقیقت یقیناً یہ نہیں ہے۔

مندرجہ بالا مثال میں اس اعتراض کا جواب بھی موجود ہے کہ متشابہات کا صحیح مفہوم جانے بغیر اس پر ایمان کیسے لایا جائے --- بلکہ حقیقت سمجھے بغیر ایک بات کو درست ماننا تو وہ اصول ہے جو ہماری اس دنیوی زندگی میں قدم قدم پر کارفرما نظر آتا ہے۔ اس کے بغیر تو چارہ ہی نہیں۔ سب آدمی ایک ہی علمی سطح پر کیسے ہو سکتے ہیں ؟

۲- اہل ایمان اور با عمل آدمی جو قرآن کے احکام کے مطابق اپنی اخلاقی روحانی تربیت کرنا چاہتے ہیں، ایسے لوگوں کے لیے قرآن کے محکمات و متشابہات "سب" میں

Marfat.com

ہدایت ہے۔ محکمات سے تو وہ اصل ہدایت حاصل کرتے ہیں اور متشابہات کے بارے میں اسی علم پر قناعت کرتے ہیں۔ جو کام چلانے کے لیے کافی ہے۔ دوسری طرف بے عمل ، فتنہ جو ، اور محض ذہنی عیاشی کرنے والے ''حضرات و خواتین'' کی ساری توجہ صرف متشابہات پر ہوتی ہے۔ اپنے غیر اسلامی بلکہ ملحدانہ خیالات کے لیے بھی ''وحی الہی'' کی تائید حاصل کرنے کے لئے وہ متشابہات میں غوطے لگا کر کچھ نہ کچھ نکال ہی لیتے ہیں۔ بلکہ بعض ''چراغ بکف'' قسم کے طالع آزما لوگ تو ''معارف قرآن'' کا ڈھیر جمع کرنے کے لئے محکمات پر بھی ہاتھ صاف کرنے سے نہیں چوکتے۔

۳۔ اہل ایمان جانتے ہیں کہ اصل ہدایت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ انسانی قلب و نظر کا درست رہنا بھی اس کے رحم پر منحصر ہے۔ اس لیے وہ اپنے پروردگار سے ہی رحمت و ہدایت طلب کرتے ہیں۔ اس کے سامنے حاضری کا یقین ان کے سارے اعمال و نظریات پر حاوی رہتا ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت، معجزات، تعلیمات اور ان کی وفات کے متعلق چند قابل ذکر امور

۱- حضرت عیسیٰ علیہ السلام غایت درجہ متنازع فیہ شخصیت ہیں، اور لوگ ان کے معاملے میں افراط و تفریط کا شکار ہوئے ہیں۔ آپ کے بدترین مخالف یہود تھے، جنہوں نے اپنی طرف سے مسیحؑ اور ان کی والدہ پر گندے الزامات لگانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ آپؑ کے ماننے والوں میں سے اکثریت نے نہ صرف آپ کے متعلق مشرکانہ عقائد تراش لیے بلکہ آپؑ کی شخصیت کو بھی تاریخی کی بجائے افسانوی اور فرضی شخصیت کے قریب پہنچا دیا۔

آنحضرت ﷺ نے یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کو اسلام کی دعوت دی تو قدرتاً دونوں نے مسیحؑ کے متعلق آپ کے موقف کی وضاحت چاہی۔ چنانچہ قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر متعدد بار آیا ہے۔ مگر اس طرح کہ یہودی اور عیسائی دونوں ہی بگڑ گئے۔ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق قرآن کا موقف اس لحاظ سے قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت بھی ہے کہ یہ ہر قسم کی وقتی سیاسی مصلحتوں سے بالاتر ہے۔ اگر محمد عربی ﷺ محض سیاسی طالع آما ہوتے تو وہ ضرور عرب کے یہودیوں یا عیسائیوں میں سے جس کو زیادہ مفید مطلب پاتے۔ مسیحؑ کے بارے میں بھی اس کے خیالات پر صاد کر دیتے۔

۲- آنحضرت ﷺ کے مختلف ارشادات اور قرآن کریم کی تصریحات کی روشنی میں عہد رسالت سے لے کر آج تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق مسلمانوں کا ایک متفقہ مسلک چلا آتا ہے۔ پچھلی صدی میں عیسائیوں کے ساتھ محکومانہ تعلق کے نتیجے میں اور ذہنی مرعوبیت، باغیانہ تلخی یا مخصوص مصلحتوں کے پیش نظر بعض مسلمانوں نے حضرت عیسیٰؑ کے

Marfat.com

متعلق کچھ نئے نظریات پیش کیے ۔ باہمی جزوی اختلاف کے باوجود " انکار معجزات " ان تمام نظریات کی مشترک بنیاد ہے ۔

۳۔ مسیح علیہ السلام اور عیسائیت کے متعلق سورہ ال عمران نے جس موضوع کو چھیڑا ہے ۔ اس میں قرآن کی صداقتوں کو اجاگر کرنے کا حق تو اسی صورت میں ادا ہو سکتا ہے ۔ جب حضرت عیسیٰؑ کے متعلق پورا مسیحی اور یہودی لٹریچر سامنے ہو خصوصاً ان فرقوں کے افکار و خیالات اور آراء و نظریات بھی پیش نظر رکھے جائیں جو پہلی صدی عیسوی سے لے کر کم از کم بعثت نبوی سے کچھ عرصہ پہلے تک مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں موجود رہے ہیں -- اس قسم کے تقابلی مطالعے سے ہی یہ پتہ چلتا ہے کہ مسیحی دنیا کس طرح حقیقت کو خرافات میں گم کر بیٹھی تھی ۔ یہاں تک کہ ایک امی ﷺ کے ذریعے عالم الغیب و الشھادہ نے اصل حقیقت کو واضح کر دیا ۔

ذیل میں ہم بالا ختصار حضرت عیسی علیہ السلام کی زندگی کے چار اہم اور متنازعہ فیہ پہلوؤں یعنی ولادت ' معجزات ' تعلیمات ' اور وفات کے متعلق یہودیوں ' عیسائیوں اور مسلمانوں کے معتقدات بیان کرتے ہیں ۔ امید ہے اتنا بیان بھی خاصہ معلومات افزا اور حقیقت نما ثابت ہو گا ۔

۴۔ یہودی حضرت مسیحؑ کے کنواری مریمؑ سے پیدا ہونے کو مورد طعن ٹھہراتے اور مریمؑ صدیقہ پر بہتان لگاتے تھے ۔ حضرت مسیحؑ کے واضح معجزات اور بکثرت خوارق کو یہ لوگ شعبدہ بازی قرار دیتے تھے ۔ حضرت مسیحؑ کی تعلیمات کو وہ بدعت و الحاد سمجھتے تھے اس لیے کہ یہ ان کی خود ساختہ شریعت کے خلاف اور ان کی بداعمالیوں کے پردے چاک کرنے والی تھی ۔ چنانچہ انہوں نے اپنی مذہبی عدالت میں مسیحؑ پر کفر والحاد کا فتوی لگا کر ان کے لیے سزائے موت کا فیصلہ کیا ۔ مقامی رومی گورنر نے جب اس سزا کی توثیق سے انکار کیا تو اسے یہ کہہ کر آمادہ کیا کہ " یہ شخص تو حکومت کے خلاف لوگوں کو اکسا رہا ہے لہذا اس کو موت کی سزا نہ دے کر تم قیصر (شاہ روم) کی وفاداری کا ثبوت نہیں دے رہے ۔" آخر مسیح کو انہوں نے سُولی پر چڑھا دیا - اور چونکہ سُولی کی موت یہودی روایات کے مطابق " لعنتی کی

Marfat.com

موت " ہے لہذا ان کے نزدیک اس شخص (حضرت عیسی علیہ السلام) کا انجام (نعوذ باللہ) ایک معلون آدمی کا سا ہوا۔ اور وہ طنزاً یہ کہتے تھے کہ " دیکھئے یہ اللہ کا رسول تھا جس کو ہم نے مروا ڈالا اور وہ اپنے آپ کو بچا نہ سکا۔"

۵- عیسائیوں کے نزدیک حضرت مسیح ؑ کنوری مریم سے انسانی مس کے بغیر پیدا ہوئے اور اسی لئے وہ خدا کے بیٹے یا اوتار تھے یعنی خود خدا نے ان کی شکل میں جنم لیا تھا۔ (اور خدا کو یہ جنم دھارنے کی ضرورت یوں پڑی کہ نسل انسانی کے گناہوں کے کفارے کی اور کوئی صورت اسے نظر نہیں آئی) حضرت عیسیٰؑ کے معجزات و خوارق کو یہ لوگ ان کی الوہیت اور انبیت کا مزید " ناقابل تردید " ثبوت خیال کرتے ہیں مسیح ؑ کی تعلیمات میں سے مسیحیوں کو چند اخلاقی احکام اور ترک دنیا کی فضیلت یا " فرضیت " یاد رہ گئی۔ مگر وہ مسیحؑ کے دین کی اصل ہی گم کر بیٹھے اور توحید کی بجائے تثلیث جیسے غیر معقول مشرکانہ عقیدے کو انہوں نے اپنے سارے دینی عقائد کی بنیاد ٹھہرا لیا۔ جس کا مسیح ؑ کی تعلیمات سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔

مسیح ؑ کی وفات کے متعلق عیسائیوں کی اکثریت نے یہی تسلیم کیا کہ وہ واقعی مصلوب ہو کر ایک لعنتی کی موت مرے (نعوذ باللہ) بلکہ سولی کا عذاب برداشت کرنے کے علاوہ مزید تین دن تک ساری نسل انسانی کے گناہوں کی سزا بھگتتے رہے چوتھے دن پھر زندہ ہو گئے اور اس طرح ساری نسل انسانی کو گناہوں سے نجات دلانے کے بعد آپ آسمان پر چلے گئے۔ اب پھر قیامت سے پہلے آکر زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کریں گے۔ (یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسیحیوں میں ایسے فرقے بھی موجود رہے ہیں جو مسیح ؑ کی وفات کی بجائے ان کے رفع جسمانی کے قائل تھے)۔

۶- مسلمان حضرت عیسی علیہ السلام کو خدا کا برگزیدہ رسول اور انبیائے بنی اسرائیل میں سے آخری نبی مانتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے معاصر یہودی اور مسیحی، دین اسلام کے بنیادی عقائد کو مرکز بحث یا معیار صداقت قرار دینے کی بجائے، سب سے پہلے آپؐ سے یہ سوال کرتے تھے " اچھا مسیح ؑ کے متعلق تمہارا کیا خیا ہے ؟" یہودیوں کے آنحضرت ﷺ سے

Marfat.com

بدول بلکہ آپ کا شدید مخالف ہو جانے کی ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ جس شخص (یعنی مسیح علیہ السلام) کو وہ لوگ ولادت کے لحاظ سے (نعوذ باللہ) نقل کفر کفر نباشد ۔ نطفہ بے تحقیق اور موت کے لحاظ سے (نعوذ باللہ) ملعون سمجھتے تھے ۔ اس کو آپؐ خدا کا برگزیدہ نبی، مؤید بروح القدس، راستباز پیغمبر اور یہودیوں کا مسیح موعود قرار دیتے تھے --- دوسری طرف عیسائی اس لیے بگڑ گئے کہ آپؐ الوہیت و ابنیت مسیحؑ اور تثلیث کے عقیدے کو صریح کفر قرار دیتے تھے ۔ اس طرح قرآن کریم کی آیات اور آنحضرت ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں مسلمان شروع سے ہی حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق حسب ذیل امور کے قائل چلے آئے ہیں۔

۱- ولادت

مسیحؑ کنواری مریمؑ سے بغیر انسانی مس کے محض اللہ کی قدرت سے پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ مریمؑ پاکباز خاتون تھیں اور راستباز و نیکوکار والدین کی بیٹی تھیں ۔ مسیحؑ کی غیر معمولی طریقے پر پیدائش ان کی ابنیت یا الوہیت کا ثبوت نہیں بلکہ ان کے اور سب کائنات کے پروردگار - اللہ کی قدرتوں کا ایک نشان تھا۔

۲- معجزات

حضرت مسیحؑ کے ہاتھوں بہت سے معجزات و خوارق ظاہر ہوئے کیونکہ عوام ہمیشہ دلائل و عقلیات کی بجائے خارق عادت سے ہی زیادہ متاثر ہوتے ہیں ۔ اور یہود تو اپنی اعجوبہ پسندی میں خصوصیت سے بڑھے ہوئے تھے ۔ یہ معجزات اللہ کے حکم سے سرزد ہوتے تھے اور مسیحؑ کی صداقت کی دلیل تھے ۔ خود حضرت مسیحؑ بھی ان اعجازی تصرفات کو اپنی طرف منسوب نہیں کرتے تھے اور کوئی نبی بھی ایسا نہیں کرتا ۔

۳- تعلیمات

مسیح علیہ السلام لوگوں کو توحید کی طرف بلاتے تھے اور یہود کو اعمال بد ترک کرنے

Marfat.com

کا حکم دیتے تھے ۔ آپ اپنی والدہ کے فرمانبردار تھے ۔ آپ بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور اپنے سے پہلے کے انبیاء اور ان کی تعلیم کے مصدق تھے ' لہذا یہودیوں کے پاس آپ کو جھٹلانے کی کوئی دلیل نہ تھی ۔ جس طرح آپ کے ماننے والوں کے پاس تثلیث و کفارہ کا کوئی نقلی (عقلی کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہو تا) ثبوت نہیں ۔

۴- وفات

مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالی نے پر اسرار طریقے پر یہودیوں اور رومیوں کے ہاتھوں سے بچا لیا ۔ وہ سرے سے صلیب پر چڑھائے ہی نہیں گے ۔ اللہ تعالی نے مسیح ؑ کو زندہ اوپر اٹھا لیا (مگر کچھ ایسی بات ضرور ہوئی جس کی وجہ سے ان لوگوں کو یہ غلط فہمی لگی کہ غالبًا مسیح ؑ ہی سولی پر مرے ہیں (وہ بات کیا تھی ؟ قرآن کریم نے اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا) مسیح ؑ آسمان پر زندہ موجود ہیں اور قیامت سے پہلے اپنے جسد عنصری کے ساتھ اس دنیا پر تشریف لائیں گے اور یہودیت و عیسائیت کے غلبہ کو توڑیں گے اور پھر اپنی عمر طبعی پوری کر کے فوت ہوں گے ۔

یہ ہیں وہ عقائد و خیالات جو مسیح ؑ کے بارے میں مسلمانوں کے اندر گزشتہ تیرہ سو سال سے چلے آتے ہیں ۔ ان میں سے بعض کے متعلق تو قرآن میں تصریح ہے۔ بعض کم از کم قرآن کے ظاہر مفہوم کے عین مطابق ہیں اور بعض کی تائید احادیث سے ہوتی ہے ۔ (قرآن کریم میں مسیح علیہ السلام کا ذکر حسب ذیل مقامات پر آیا ہے مسیح ؑ کے متعلق کسی اختلافی نظریہ پر بحث کرنے سے پہلے ان تمام مقامات پر مجموعی طور پر جو کچھ مسیح ؑ کے متعلق مذکور ہوا ہے ۔ وہ ذہن میں موجود ہونا چاہیے ۔ آل عمران : ۳۵ تا ۳۷ ' ۴۲ تا ۶۰ النساء : ۱۵۵ تا ۱۵۹ ' ۱۷۱ ' ۱۷۲ ' المائدہ ۱۷ ' ۴۷ تا ۷۸ ' ۱۱۰ تا ۱۱۸ ' التوبۃ : ۳۱ مریم : ۱۶ تا ۳۸ ' الانبیاء : ۹۱ تا ۹۳ ۔ المومنون : ۵۰ ' الزخرف : ۵۷ تا ۶۵ - الحدید : ۲۷ ' ۲۸-

Marfat.com

الصّف : ٦ تا ٨ - التحریم : ١٢-

٧- انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں بیشتر اسلامی ممالک مختلف فرنگی اقوام (انگریز . فرانسیسی . ڈچ . پرتگیز وغیرہ) کی سیاسی غلامی میں آ چکے تھے - باہمی رقابت و عداوت کے باوجود ان تمام فرنگی قوموں کے علوم ' تمدن اور مذہب یکساں تھے - اسی لیے مغربی استعمار کے ماتحت دیے ہوئے ملکوں میں ان تینوں چیزوں کا ایک نمایاں اثر اور رد عمل ظاہر ہوا-

١- مغربی قوموں کا تصور علم یہ تھا کہ صرف وہی چیز قابل قبول ہے جو تجربہ و مشاہدہ پر مبنی ہو اور حواس خمسہ کے ذریعے عقل اس کو محسوس کر سکے مقام علم تک اس طریق رسائی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ "معجزات" کو بھی "توہمات" میں شمار کیا جانے لگا اور معجزات کا قائل ہونا "روشن خیالی" کے یکسر خلاف سمجھا جانے لگا - مسیحؑ کی "پراز معجزات زندگی" کے متعلق نئی تاویلیں کرنا وقت کا ایک اہم تقاضا تھا - (مزے کی بات یہ ہے کہ جن قوموں کے سائنس و فلسفہ سے متاثر ہو کر یہ رویہ اختیار کیا گیا - انہوں نے خود اپنے مذہب کو ان پیمانوں سے ناپنا کبھی گوارا نہیں کیا)

٢- تمدنی امور میں تمام ہی محکوم قوموں نے اپنے مغربی حاکموں کی نقل کرنے کو شائستگی اور دینوی عزت و وجاہت کا معیار قرار دے لیا - اپنی مسلمہ مذہبی اخلاقی اور سماجی اقدار کو بھی اس بت کی بھینٹ چڑھانے سے دریغ نہیں کیا-

٣- تمام مغربی قومیں مذہباً عیسائی تھیں اور مسیحیت کی تبلیغ ان کے سامراجی عزائم کا ایک جزء لاینفک تھا - مسلمان ممالک میں عیسائی مشنری ' مسلمانوں کے حضرت مسیحؑ کے بارے میں مندرجہ بالا عقائد سے مسیحؑ کی الوہیت اور آنحضرت ﷺ پر مسیحؑ کی فضیلت ثابت کرتے تھے - ہر چند کہ مسیحیوں کی یہ دلیل بالکل بودی تھی - (بعینہ یہی استدلال وفد نجران کا تھا اور قرآن نے ان سب چیزوں کا اصل صحیح جواب دے دیا تھا) مگر بعض مسلمانوں نے مسیحیت کے مقابلے کے لیے یہ ثابت کرنا ضروری سمجھا کہ مسیحؑ میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہ تھی - ان لوگوں کا

Marfat.com

خیال تھا کہ مسیحؑ کے متعلق یہ موقف اختیار کر کے وہ بیک وقت سائنس اور عیسائیت دونوں کے حملوں سے اسلام کو بچا سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک گروہ نے مسیحؑ کی معجزانہ ولادت سے انکار کیا اور کہا کہ وہ عام انسانوں کی طرح ماں اور باپ سے پیدا ہوئے تھے۔ مسیحؑ کے معجزات کی عقلی توجیہات پیش کیں اور مسیحؑ کے رفع جسمانی اور اب تک زندہ موجود ہونے کا انکار کر کے یہ کہا کہ مسیح صلیب پر چڑھائے ضرور گئے مگر موت سے بچ گئے اور پھر بعد میں یہود کے خوف سے گمنام زندگی بسر کرتے رہے تاآنکہ کسی جگہ اپنی طبعی موت سے مر گئے۔ اس کے بعد ایک اور گروہ نے مسیحؑ کی معجزانہ ولادت (کنواری مریمؑ سے مَس بشری کے بغیر پیدا ہونے) کا تو اقرار کیا مگر وفات مسیحؑ کے مسئلے کو علمی نزاع کی بجائے تجارتی راس المال بنالیا۔

۸- ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم نے مسیح علیہ السلام کے بارے میں یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کی گمراہیوں کی تردید کی ہے۔ یہود کا رویہ سراسر کفر و انکار اور نفرت و عناد پر مبنی تھا اس لیے قرآن کریم نے اس کو قطعیت کے ساتھ ردّ کر دیا۔ مسیحیوں کی گمراہی (عقیدۂ الوہیت مسیحؑ) کا سبب مسیحؑ سے محبت و عقیدت میں غلو اور مسیح کے متعلق چند حقائق سے غلط نتائج نکالنا تھا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن کریم نے عقیدہ الوہیت مسیحؑ کو تو صریح الفاظ میں کفر قرار دیا (المائدہ: ۱۷، ۷۲، ۷۳) مگر اس عقیدے کے اسباب کی بھی اسی طرح صاف لفظوں میں جڑ نہ کاٹ دی، بلکہ ان کی توثیق کی۔

عیسائیوں میں اس عقیدے کے پیدا ہونے کے تین ہی بڑے سبب تھے۔

۱- حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ ولادت

۲- ان کے محسوس معجزات

۳- ان کا آسمان کی طرف اٹھایا جانا

وفد نجران نے بھی اپنے استدلال میں یہی باتیں پیش کی تھیں۔ آخر قرآن نے لَقد کَفَر الذین قالو ان اللہ ثالث ثلثة اور لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح ابن

Marfat.com

مریم کی طرح دو ٹوک اور صاف کیوں نہ کہدیا کہ مسیح ؑ کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کا عقیدہ ہی سرے سے غلط ہے ۔ ان کی والدہ تو شادی شدہ تھیں اور فلاں آدمی ان کا باپ تھا۔" یہودیوں کی گمراہی یا غلط فہمی دور کرنے کے لیے بھی یہ اعلان زیادہ موثر ہوتا۔

قرآن میں ولادت مسیح ؑ کے بیان (آل عمران: ۴۲ تا ۴۷ اور مریم : ۱۶ تا ۳۷) کو پڑھنے کے بعد بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا کہ مسیح ؑ حسب معمول ماں اور باپ کے اتصال سے ہی پیدا ہوئے تھے ' دراصل اس بات کو ثابت کرنا ہے کہ یا تو خدا جان بوجھ کر بات کو سلجھانے کی بجائے الجھانا چاہتا ہے یا پھر اسے بیان مدعا کی بھی پوری قدرت نہیں (نعوذ باللہ)۔ یہ کہنا کہ قرآن میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ "مسیح ؑ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے" ایک مغالطہ ہے ۔ اگر قرآن سے پہلے لوگ مسیح ؑ کو ماں باپ سے پیدا شدہ ہی سمجھتے رہے ہوتے تو قرآن کو اس انکشاف کی ضرورت ہوتی مگر مسیح ؑ تو صدیوں سے ابن مریم ہی کہے جارہے تھے ۔ اگر یہ کذب تھا تو ضرورت اس کی تردید کی تھی ۔ جو قرآن نے نہیں کی ۔

اگر سائنس کے خوف سے مسیح ؑ کی اعجازی ولادت کی تاویل ضروری سمجھی گئی تھی تو اب خود سائنس ہی "کنواری سے بچہ پیدا ہونے کے امکان" کو تسلیم کر چکی ہے ۔ اور اگر اس کی بنا پر مسیح ؑ کو غیر معمولی فضیلت حاصل ہو جانے کا "خطرہ" ہے ۔ تو قرآن " ان مثل عیسی عند اللہ کمثل ادم کہہ کر اس وہم کا ازالہ پہلے ہی کر چکا ہے ۔

۹۔ معجزات مسیح ؑ کا انکار یا تاویل ' بلکہ ہر قسم کے معجزات کا انکار ' کسی ملحد کے منہ سے ہو تو بات بھی ہوئی ۔ مگر وحی و نبوت کے اقرار کے بعد معجزات سے انکار کسی طرح زیب نہیں دیتا ۔ یا پھر وحی و نبوت پر ایمان کا دعوی بھی مشتبہ ہے ۔ بات یہ ہے کہ معجزات کو عقل کے پیمانے سے ناپنا ہی بے عقلی ہے ۔ یہ روایت و نقل کی قوت صحت کی بنا پر رد و قبول کئے جا سکتے ہیں ۔ اور قرآن کریم کا بیان اگر " قابل اعتبار " ہے تو پھر ان معجزات سے انکار کی کوئی صورت نہیں ' جن کو ایک ایک کر کے قرآن نے گنایا ہے ۔ اگر یہ " خطرہ " ہے کہ معجزوں کی وجہ سے صاحب معجزات کی الوہیت ثابت ہو جائے گی تو قرآن نے بار بار

Marfat.com

باذن اللہ کہہ کر کوئی غلط نتیجہ نکالنے کا پہلے ہی سدباب کر دیا ہے۔

۱۰۔ اب وفات مسیحؑ کو لیجیے۔ یہودی شیخی سے کہتے تھے کہ ہم نے مسیحؑ کو شریعت موسوی کے مطابق سنگسار بھی کیا اور سولی پر بھی لٹکا دیا (یہودی شریعت کے مطابق ارتداد یا الحاد کی سزا سنگسار کرنا تھی اور یہی سزا یہود کی مذہبی عدالت مسیحؑ کو دلانا چاہتی تھی مگر رومی حکومت میں سزا بذریعہ سولی نافذ ہوئی تھی۔ یہودی مسیحیوں کو یہی کہتے تھے کہ ہم نے پہلے مسیحؑ کو سنگسار کر کے مار ڈالا تھا اور پھر صلیب پر بھی لٹکا دیا تھا۔ مسیحی حضرت عیسیٰؑ کا سنگسار ہونا نہیں مانتے تھے اور اس میں وہ یقیناً سچے بھی تھے۔ مگر ان کی اکثریت مسیحؑ کے صلیب پر مرنے کو تسلیم کرتی تھی۔ اگرچہ ان میں سے بعض مسیحؑ کے رفع جسمانی کے قائل تھے اور جو صلیب پر مرنے کو مانتے تھے وہ بھی تین دن کے بعد ان کے زندہ ہو کر آسمان پر چلے جانے کے قائل تھے)۔ قرآن کریم نے دو ٹوک لفظوں میں یہود کے اس زعم باطل کی تردید کر دی (النساء: ۱۵۷، ۱۵۸) بلکہ صاف کہہ دیا کہ مسیحؑ تو سرے سے صلیب پر چڑھائے ہی نہیں گئے۔ اس سے نہ صرف وفات مسیحؑ کے دراصل "مسیحی عقیدے" کی تردید ہوتی ہے۔ بلکہ یہ خیال بھی غلط ثابت ہو جاتا ہے کہ مسیحؑ صلیب پر چڑھائے تو گئے۔ مگر سولی کا یہ عذاب سہنے اور دکھ اٹھانے کے بعد بھی اتفاقاً مرنے سے بچ گئے اور پھر بعد میں اپنی طبعی موت مرے۔ اگر اسے درست مانا جائے تو یہ صلیب سے بچانا کیا ہوا یہ تو دوہری موت ہوئی --- بہرحال قرآن کریم نے یہ بات تو بالکل واضح کر دی کہ مسیحؑ مصلوب نہیں ہوئے یا بالفاظ دگریوں کہنے کہ جسے یہودیوں نے صلیب پر چڑھایا تھا اور جس کی صلیب پر چڑھی ہوئی تصویر عیسائی لئے پھرتے ہیں۔ وہ مسیحؑ ضرور نہیں تھے۔

۱۱۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر مسیحؑ کیسے بچ گئے اور کہاں گئے؟ اس کا جواب قرآن نے ان عیسائیوں کے عقیدے سے ملتا جلتا دیا ہے۔ جو اس بات کے قائل تھے کہ مسیحؑ کو اسی جسم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اوپر اٹھا لیا اور ان کی جگہ غلطی سے ایک دوسرے آدمی کو سولی چڑھا دیا گیا (یہ آدمی کون تھا اور غلطی سے اس کے اصل مجرم سمجھ لیے جانے کی وجہ کیا تھی اس کے متعلق مختلف روایات موجود ہیں) جو عیسائی مسیحؑ کے صلیب پر مرنے کے

Marfat.com

قائل ہیں وہ بھی ان کے تیسرے دن زندہ ہو کر آسمان پر چلے جانے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ دراصل مسیحؑ کی موت تسلیم کیے بغیر "کفارہ مسیح" کے عقیدے کی بنیاد ہی نہیں بنتی تھی۔ اس لئے کم از کم تین دن کا مرنا تسلیم کیا گیا۔ اور ان کے رفع کو بعد کا واقعہ بنایا گیا اصل حقیقت تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ مگر اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ "رفع" کی کوئی اصل ضرور تھی اب اگر عیسائیوں کی یہ رفع الی السماء والی روایت سرے سے ہی غلط ہوتی تو ان کے عقیدۂ الوہیت مسیحؑ کی تردید کے لیے نہایت عمدہ موقع تھا کہ قرآن میں صاف صاف کہہ دیا جاتا "جسے تم خدا اور خدا کا بیٹا سمجھ رہے ہو وہ تو کب کا مر بھی چکا ہے" لیکن عجیب بات ہے کہ ایسا کرنے کی بجائے قرآن صرف یہی نہیں کہ مسیحؑ کی موت کی تصریح نہیں کرتا بلکہ ایسے الفاظ رافعك الی (آل عمران: ۵۵) اور بل رفعه الله الیه (النساء : ۱۵۸) استعمال کرتا ہے جو مسیحؑ کے زندہ آسمان پر اٹھا لیے جانے کے مفہوم کا احتمال ضرور رکھتے ہیں ولادت مسیحؑ کو حسب معمول ثابت کرنے کی طرح قرآن کی آیات سے مسیحؑ کی وفات کا مفہوم نکالنے کی کوشش کرنا بھی در اصل اس بات کو ثابت کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ صاف اور سلجھی ہوئی عبارت میں اپنا مطلب ظاہر کرنے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتا (نعوذ باللہ)۔

حضرت مسیحؑ کے اب تک کسی دوسرے سیارے میں زندہ موجود ہونے سے محض اس لیے انکار کہ "ایسا ہونا ناممکن ہے" عقل اور ایمان کا تقاضا نہیں ہے بلکہ جب حضرت مسیحؑ کی پیدائش عام انسانی قاعدہ توالد و تناسل سے الگ یعنی بغیر باپ کے توسط کے محض نفخہ جبریل سے ہو گئی تو کیا بعید ہے بلکہ یہ تو قرین قیاس ہے کہ آپ کا انجام بھی معمول عام سے ہٹ کر ہوا ہو۔ اور کیا عجب ہے جو فرشتے کے اس مس نے آپ کے جسم میں شروع ہی سے کچھ ایسی لطافت رکھ دی ہو جو آپ کے آسمان کی طرف چڑھنے میں ممد ثابت ہو سکے۔ اگر خدا کی قدرتوں پر ایمان نہ بھی ہو تو کم از کم اس خلائی دور میں سائنس کے سامنے بھی یہ بات کہتے ہوئے چنداں شرمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ رہا یہ خطرہ کہ اس طرح تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا دیگر انبیاء پر ان

Marfat.com

کی برتری ثابت ہو جائے گی تو انبیاء کی ایک دوسرے پر فضیلت کا معیار ، ان کے معجزات یا طول و قصرِ حیات کو نہیں ، بلکہ ان کی تعلیمات اور اپنے مشن میں کامیابی کو ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ عقیدہ حیات مسیحؑ یا رفع مسیحؑ، اسلام کے بنیادی عقائد (اجزائے ایمان) میں سے نہیں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی مسیحؑ کے متعلق یہ عقیدہ منوانے پر اصرار نہیں فرمایا تھا۔ یہ عقیدہ قرآن اور احادیث کی تصریحات سے زیادہ قریب ضرور ہے۔ لیکن تاویل کے احتمال سے یکسر خالی نہیں ہے۔ لہذا اگر کوئی آدمی محض یہ سمجھ کر وفات مسیحؑ کا قائل ہو کہ رفع مسیحؑ یا حیات و وفاتِ مسیحؑ کا عقیدہ اسلام کا بنیادی عقیدہ نہیں ہے اس لئے نہیں کہ ایسا ہونا ناممکنات میں سے ہے اور نہ ہی اس لیے کہ اس عقیدے کو امت میں تفرقہ وتشتت کا ذریعہ بنا کر اپنی دکان چمکائی جائے تو جواز کی گنجائش ضرور موجود ہے۔ مسلمانوں میں وفات مسیحؑ کے قائل لوگ پہلے بھی رہے ہیں۔ اگرچہ بہت کم سہی ۔ لہٰذا یہ کہنا کہ کسی پر پہلی دفعہ الہام کے ذریعے وفات مسیحؑ کا انکشاف ہوا ہے۔ علمی دیانت داری اور تحقیق کے بھی سراسر خلاف ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

مسلمان کی انفرادی و اجتماعی کامرانی کے چند اصول

۱- اہلِ کتاب (یہودیوں اور عیسائیوں) سے محتاط رہو۔ ان میں ایک طبقہ ایسا ہے(کم از کم ان کے سیاستدان اور مشنری تو آج بھی ضرور اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں) کہ اگر تم نے ان کا باتوں پر کان دھرا۔ تو بس دین و ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ جسمانی و طبعی لحاظ سے تم زندہ رہو گے مگر تمہارا دینی و ملی وجود ختم ہو جائے گا۔

۲- کتاب و سنت سے تمسک (تلاوت آیات اور رسولؐ کی موجودگی) اور اللہ پر کامل بھروسہ تمہیں راہ راست سے بھٹکنے نہیں دے گا۔ اور منزل مقصود آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے پائے گی۔

۳- اللہ کی نافرمانی کے شایبے سے بھی بچنے کی کوشش کرو اور مرتے دم تک مسلمان رہو ۔ زندگی کے ہر لمحے میں یہ دیکھتے رہو کہ آیا تم اسلام پر قائم ہو؟ کچھ پتہ نہیں کونسا لمحہ آخری ثابت ہو۔

۴- "اللہ کی رسی" کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ اور سب مل کر پکڑو۔ یعنی اجتماعی زندگی میں دین کی سربلندی اور دین کی اقامت تمہارا نصب العین ہو۔ اس اصل مقصدِ حیات سے ہٹ کر تفرقہ و اختلاف کا شکار ہو جاؤ گے۔

۵- اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانے اور خدا کے دین کی سربلندی کو اپنا نصب العین بنانے کا ایک معجزہ تم ہی نہیں ساری دنیا دیکھ چکی ہے۔ قبل اسلام عرب قبائل کی ضرب المثل کی حد تک پہنچی ہوئی عداوتیں۔ شب و روز کے کشت و خون ' بات بات پر لڑائیاں اور برسوں بلکہ پشتوں کے کینے و عناد کس طرح آپس کی بے نظیر محبت و یگانگت' اور بے مثل الفت و اخلاص میں بدل گئے۔ یہی توحید و رسالت پر ایمان ہی مشرکین

Marfat.com

عرب کے لئے دوزخ کی آگ سے نجات کا سبب بنا۔ اور اسی نعمتِ اسلام نے پوری عرب قوم کو نیست و نابود ہونے اور خانہ جنگی کی آگ میں جل مرنے سے بچا لیا۔ وہ جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے ' اس طرح شیر و شکر ہو گئے کہ واقعی آپس میں بھائی بھائی معلوم ہونے لگے۔

٦- ان آیات میں پاکستانی مسلمانوں کے لئے خصوصاً ایک سبق ہے اور وہ یہ کہ اتحاد و اتفاق کی مضبوط ترین بنیاد صرف "اللہ کی رسی" یعنی اس کا دین ہے۔ دین کے اس رشتے کو سب رشتوں سے مقدم سمجھو اور "قومیت" کے دوسرے عوامل کی بجائے اسی احساس کو قوی اور مضبوط کرو۔

آج سے پندرہ برس پہلے " اسلام زندہ باد!" کے نعرے نے ہی اس برصغیر کے مسلمانوں میں اتحاد پیدا کر کے انہیں ہندو سامراج کی چتا میں " جل مرنے" سے بچا لیا تھا۔ آئندہ بھی دین کی سربلندی کا وہی جذبہ "ایمان ' تنظیم اور اتحاد" میں کوئی معنی پیدا کر سکتا ہے ورنہ "واپس پھیر لے جانے والے" تو اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔

☆☆☆

Marfat.com

سورۃ النّساء

تعارف

ترتیب تلاوت کے لحاظ سے یہ قرآن کریم کی چوتھی سورت ہے۔ اس میں کل ۱۷۶ آیات اور ۲۴ رکوع ہیں۔ اور سورۂ البقرہ کے بعد قرآن کی سب سے لمبی سورت یہی ہے تقسیم تلاوت کے لئے قرآن مجید کی جو سات منازل (فمی بشوق) مقرر کی گئی ہیں ان میں سے پہلی منزل سورۃ النساء کے ساتھ ختم ہوتی ہے - جیسا کہ معلوم ہے قرآن کریم کی سورتوں کے الگ الگ نام رکھنے کی اصل غرض غالباً صرف یہ تھی کہ ہر سورت دوسری سے متمیز ہو جائے - کیوں کہ سورتوں کی وجہ تسمیہ میں بظاہر کوئی یکساں اصول ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ عام طور پر تو سورت کا نام کوئی ایسا لفظ ہوتا ہے جو صرف اسی سورت میں آیا ہو اور قرآن مجید میں دوسری جگہ نہ ہو ۔ کبھی سورت کا نام کسی ایسے واقعہ یا حکم سے متعلق ہوتا ہے جو صرف اسی سورت میں مذکور ہوتا ہے۔ بعض دفعہ کوئی اور مناسبت ہوتی ہے۔ بہرحال سورت کے نام کو ہمیشہ اس سورت کے تمام مباحث کا جامع عنوان نہیں قرار دیا جا سکتا۔ سورۃ النساء کے نام اور اس کے مضامین میں بھی یہی جزوی مناسبت ہے یعنی اس سورت میں عورتوں کے حقوق و فرائض سے متعلق خاص احکام ہیں اس لئے اسے یہ نام دیا گیا۔ عورتوں سے متعلق احکام قرآن کریم کی بعض دیگر سورتوں میں بھی ہیں مثلاً البقرہ' المائدہ' النور' الاحزاب' المجادلہ الطلاق وغیرہ مگر سورۃ النساء میں اس موضوع کے بعض نہایت اہم بنیادی اور نزاعی پہلوؤں پر قطعی ہدایات دی گئی ہیں۔

Marfat.com

سورت کا زمانۂ نزول

سورۃ النساء بالاتفاق مدنی سورت ہے مصری مصاحف کی تصریحات کے مطابق ترتیب نزول کے لحاظ سے اس سورت کا نمبر ۹۲ ہے۔ اور مدنی سورتوں میں سے یہ چھٹی سورت ہے یعنی اس سے پہلے البقرہ ۔ الانفال۔ آل عمران ۔ الاحزاب اور الممتحنہ کا نزول مکمل ہو چکا تھا یا شروع تھا۔ قرآن کی متعدد دوسری سورتوں کی طرح سورۃ النساء بھی پوری کی پوری ایک ہی وقت میں نازل نہیں ہوئی بلکہ اس کے مختلف حصے تھوڑے تھوڑے وقفے سے مختلف اوقات میں نازل ہوتے رہے۔ اگرچہ صحتِ تعین کے ساتھ یہ کہنا دشوار ہے کہ کون سی آیات کب نازل ہوئیں یا پوری سورت کا مجموعی زمانۂ نزول کتنا اور کون سا ہے؟ تاہم سورت کی بعض آیتوں کے شانِ نزول سے ' اور بعض ایسے احکام و واقعات کی طرف اشاروں سے جن کے نزول یا وقوع کا ایک متعین زمانہ روایات سے معلوم ہو سکتا ہے' سرسری طور پر اتنا اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ سورت شوال ۳ ھ سے لے کر ۶ ھ کے اواخر تک بلکہ شاید ۸ھ تک کے درمیانی زمانے میں مکمل ہوئی ہے ۔ مثلاً :

۱- وراثت کی تقسیم اور یتیموں کے حقوق اور ان کی حفاظت کے متعلق احکام جنگِ احد کے بعد نازل ہوئے تھے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کے ستر آدمی شہید ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے مدینہ (منورہ) کی نوخیز شہری اسلامی ریاست کے اندر (جس کی آبادی کچھ زیادہ نہیں تھی) کثیر تعداد میں بیواؤں اور یتیموں کی موجودگی ایک مسئلہ بن کر ابھری اور ان کی بحالی (Rehabilitation) کی تدابیر اور ان کے مفادات کے تحفظ کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی۔ جنگ احد شوال ۳ ھ میں ہوئی تھی اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سورت کا ابتدائی حصہ اسی زمانے میں نازل ہوا ہو گا۔

۲- تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ صلوٰۃ خوف اور تیمم کا حکم غزوہ ذات الرقاع کے موقع پر نازل ہوا تھا۔ یہ غزوہ جمادی الاول ۴ ھ میں پیش آیا تھا۔ اس طرح

Marfat.com

اس سورت کی نمازِ خوف اور تیمّم سے متعلق آیات (۱) (۴۳' ۱۰۱-۱۰۳) کا زمانۂ نزول متعین ہو جاتا ہے۔

۳- آیت نمبر ۴۷ میں یہودیوں کو جو آخری تنبیہہ کی گئی ہے غالبًا اس کا زمانۂ نزول غزوۂ بنی نضیر سے کچھ عرصہ پہلے کا ہے۔یہ غزوہ ربیع الاول ۴ ھ میں ہوا تھا جس کے نتیجے میں یہودیوں کا یہ قبیلہ (بنی نضیر) ' مدینے سے نکال دیا گیا تھا۔

۴- آیت ۵۱ ' ۵۲ میں یہود کی "اندھی ضد" اور متعصّبانہ حق فراموشی کا ذکر ہے۔ اس کا مظاہرہ اس وقت ہوا تھا جب یہودیوں کا ایک وفد مسلمانوں کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کے لئے قریش مکہ کے ہاں پہنچا ' اس وفد میں مدینے سے نکالے ہوئے یہودی قبیلہ بنی نضیر کا مشہور سردار حییؔ بن اخطب بھی شامل تھا۔ یہود و مشرکین مکہ کے اس اتحاد کا نتیجہ جنگ خندق (احزاب) کی صورت میں ظاہر ہوا۔ گویا ان آیات کا نزول اخراجِ بنی نضیر (ربیع الاول ۴ ھ) اور جنگ احزاب (شوال ۵ ھ) کے درمیان ہوا ہے۔

۵- محرمات کے ذکر (آیات ۲۲-۲۴) میں "وحلائل أبنائکم الّذین من اصلابکم" کا تعلق ام المؤمنین حضرت زینبؓ بنت جحش کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکاح سے ہے جو ذیقعدہ ۵ ھ میں ہوا تھا۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ حکم اس سے متصل' پہلے یا بعد کے زمانے میں نازل ہوا ہو گا۔

۶- آیت ۲۵ میں منکوحہ لونڈی کے لیے زنا کی سزا "آزاد عورت کی سزا سے نصف" بیان ہوئی ہے۔ آزاد عورت کے لیے یہ سزا سورۃ النور میں مذکور ہے۔ سورۃ النور' غزوۂ بنی المصطلق اور واقعۂ افک (شعبان ۶ ھ) کے بعد نازل ہوئی تھی۔ اس لیے سورۃ النساء کی یہ آیت یقیناً اس سے بعد کے

۱- بعض روایات کے مطابق تیمّم کا حکم غزوہ بنی المصطلق (شعبان ۶ھ) یا غزوہ عسفان (جمادی الاولیٰ ۵ھ) کے موقع پر نازل ہوا تھا۔

Marfat.com

ہجرت زمانے میں نازل ہوئی ہو گی۔

۷- سورۃ النساء کی جہاد کی ترغیب و تاکید والی آیات میں سے بعض (مثلاً ۷۵) صاف اہل مکہ کے بارے میں ہیں اور ان کا تعلق فتح مکہ سے ہے۔ بعض دوسری آیات (۹۷-۱۰۰) میں دار الکفر سے دارالسلام کی طرف ہجرت کرنے کا حکم ہے۔ یہ حکم فتح مکہ تک لازمی تھا۔ اسی طرح روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ الممتحنہ کے ابتدائی حصے میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے وہ سفر حدیبیہ (۶ ھ) یا فتح مکہ ۸ھ) سے پہلے کا ہے۔ ان امور کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالباً سورۃ النساء کی بعض آیات صلح حدیبیہ یا فتح مکہ سے کچھ عرصہ پہلے بھی نازل ہوئی ہیں۔

سورت کے زمانۂ نزول کے اس سرسری تعین کے بعد اب اس کے مضامین پر ایک اجمالی نظر ڈالیے :-

سورت کے مضامین کا پس منظر اور مختصر تعارف

یوں تو اجمالی طور پر پورے قرآن مجید کو ، اور کم و بیش ہر سورت کے مضامین کو ، بلحاظ غراض و مقاصد تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔

۱- جاہلیت کے غلط اور باطل عقائد و نظریات ، رسوم و رواج ، عادات و قوانین کو مٹانا یا ان کی اصلاح کرنا ۔

۲- زندگی کے حقیقتوں اور نئی اسلامی قدروں سے روشناس کرنا اور ان کی روشنی میں نئے احکام و قوانین دینا ۔

۳- جاہلیت کو مٹانے اور اسلام کو برپا کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانی پر تیار کرنا اور اس کے برعکس طرز عمل اختیار کرنے سے روکنا ۔

یہ ایک عام تقسیم ہے جو سورۃ النساء کے مضامین پر بھی صادق آتی ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہر سورت کا اپنا ایک مستقل محور یا مرکزی مضمون ہوتا ہے اور

Marfat.com

باقی مضامین اس کے گرد گھومتے ہیں ۔ اس لحاظ سے سورۃ النساء کا محور یا مرکزی مضمون " صالح عائلی نظام کی بنیاد پر صالح معاشرہ اور مضبوط ملت کی تشکیل " یا بالفاظ دگر " اسلامی عمرانیات کے بنیادی اصول" (Fundamentals of Islamic Sociology) قرار دیا جا سکتا ہے ۔

یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ ہر سورت کا اپنا ایک خاص تاریخی پس منظر ہوتا ہے ۔ اگرچہ قرآن عزیز کے معجزوں میں سے یہ بھی ایک معجزہ ہے کہ خاص اسباب و حالات میں نازل ہونے کے باوجود اس کے احکام اور ہدایات میں ایک وسعت ' ابدیت اور ہمہ گیری ہے ' تاہم کسی آیت یا سورت کے تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھنے سے اس کے مضامین کو سمجھنے اور ان کے برمحل استعمال میں بڑی مدد ملتی ہے ۔

سورۃ النساء مدنی دور کی سورتوں میں سے ہے اور اس میں آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کی مدنی (خصوصاً جنگ احد کے بعد کی) زندگی کے مسائل کی جھلک موجود ہے۔ مکی زندگی میں بڑی حد تک صرف ایک ہی مسئلہ درپیش تھا یعنی اسلام کی دعوت پھیلانا اور زیادہ سے زیادہ دلوں اور دماغوں کو مسخر کرنا ۔ مگر ہجرت کے بعد مدینہ میں اس تبلیغی مسئلہ کے ساتھ ساتھ معاشرتی اور سیاسی پہلو سے بھی کئی حل طلب مسائل پیدا ہو گئے تھے ۔

معاشرتی لحاظ سے مسلمانوں کی علیحدہ اور مستقل تنظیم اب تیزی سے نشوونما کے مراحل میں داخل ہو گئی تھی ۔ تطہیر و تعمیر کا ایک نیا دور شروع ہوا ۔ جس میں جاہلیت کے غلط طریقوں کو مٹا کر سوسائٹی کے اندر نئے اخلاقی ' تمدنی ' معاشرتی اور معاشی اصول رائج کیے جا رہے تھے ۔ اس نئے مسلم معاشرے کی یہ تشکیل و تکمیل آہستہ آہستہ اور تسہیل و تدریج کے حکیمانہ اصول کے تحت ہوئی اور مدنی دور کی متعدد سورتوں (مثلاً البقرہ ' النساء ' المائدہ ' النور ' الاحزاب ' الحجرات ' المجادلۃ ' الممتحنہ وغیرہ) میں اس قسم کے احکام وارد ہونے کی یہی وجہ ہے۔ سورۃ النساء میں جنگ احد کے بعد پیش آنے والے معاشرتی مسائل کے بارے میں احکام ہیں ۔

Marfat.com

سیاسی لحاظ سے مدینہ میں ہی اسلامی ریاست کا آغاز ہوا۔ مشرکین مکہ مسلمانوں کا اس طرح آزاد فضا میں پنپنا برداشت نہ کر سکے اور وہ فوجی قوت کے بل پر اسلام کو نیست و نابود کرنے پر تل گئے۔ اس طرح مخالفِ اسلام طاقتوں کے ساتھ مسلح کشمکش کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو کم و بیش ۸ سال (۲-۹ ھ) تک جاری رہا۔ دشمن کے ناپاک منصوبوں کو خاک میں ملانے کے لئے جہاد کا حکم وقت کا تقاضا تھا۔ اکثر مدنی سورتوں (مثلاً البقرہ۔ آل عمران۔ الأنفال ۔ التوبۃ ۔ محمد۔ الفتح ۔) کی طرح سورۃ النساء میں بھی جہاد کے احکام موجود ہیں۔

کافروں کے بیرونی حملوں کے علاوہ ' مدینہ میں مسلمانوں کے لئے ایک اندرونی خطرہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ اور یہ خطرہ منافقوں سے تھا۔ مدینے کے کچھ عیار لوگ، قریشِ مکہ اور مسلمانوں کے اس تصادم میں کھلم کھلا کسی ایک فریق کا ساتھ دینے کو ابلہی اور نادانی سمجھتے تھے کچھ ایسی بات نہ تھی کہ وہ غیر جانبدار ہوں۔ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف بغض و عناد ضرور تھا۔ بظاہر انہیں کفار مکہ کی کامیابی کے امکانات روشن نظر آ رہے تھے مگر مسلمانوں کے کردار کی پختگی' ان کی دین سے وابستگی اور جنگ بدر میں ان کی بہادری کے جوہر بھی یہ منافق دیکھ چکے تھے۔ بے سروسامان ہونے کے باوجود مسلمانوں کے غالب آ جانے کے امکانات بالکل موہوم نہ تھے۔ اس لیے ان منافقین نے "بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ اپنی وفاداریوں کو بدلنے" کی بزعم خویش دانشمندانہ پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ ان لوگوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو بارہا سخت پریشان ہونا پڑا۔ متعدد دوسری مدنی سورتوں کے طرح سورۃ النساء کا ایک موضوع سخن "منافقوں سے انتباہ اور ان کو تنبیہہ" بھی ہے۔

مشرکینِ مکہ اور منافقین مدینہ کے ساتھ مسلمانوں کے اس "تنازع للبقاء" میں یہود مدینہ کے پاجیانہ (Villainous) کردار اور اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے شدید حسد و عداوت نے' مختلف معاشرتی و معاشی اسباب کی بنا پر' مسلمانوں کے مصائب اور پریشانیوں میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ یہ "آل رسل" کے لیبل بردار

Marfat.com

اور رسولوں کے "قدیمی غدار" محض مسلمانوں کے درپۓ آزار ہونے کے لیے ہر گھٹیا سے گھٹیا حربہ اختیار کرنے پر طیار ہو جاتے تھے - اسلام دشمنی پر متحد اس شیطانی تکڑی (Trio) یعنی کفار' منافقین اور یہود کا ذکر مدنی سورتوں میں عموماً ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ سورۃ النساء میں کم و بیش پچیس آیات صرف یہود کے نامہ' اعمال کی تصویر پیش کرتی ہیں' جن میں ہر "یہودی صفت" آدمی کے لیے سامانِ عبرت موجود ہے۔

سورۃ النساء میں کافروں' منافقوں اور یہودیوں کی ریشہ دوانیوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ جہاد کی ترغیب' جہاد کے مقاصد' جہاد کی اہمیت اور جہاد سے متعلق بعض خاص احکام (مثلاً صلوۃ خوف) بیان ہونے کا تاریخی پس منظر یہ بھی ہے کہ جنگ احد کے بعد اسلام اور کفر کی کشمکش نے زیادہ نازک صورت اختیار کر لی تھی۔ احد میں مسلمانوں کے نقصانات کی وجہ سے نواح مدینہ کے غارت پیشہ مشرک قبائل' روبارہ صفت یہودی ہمسایوں اور گھر کے ابن الوقت منافقوں کی ہمتیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ مسلمان ہر طرف سے خطرات میں گھر گئے تھے' اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ جنگ احد کے بعد سے غزوات و سرایا کا ایک غیر منقطع سا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو جنگ احزاب بلکہ اس کے بھی کچھ عرصہ بعد تک جاری رہا۔ مثلاً واقعہ رجیع (اواخر شوال ۳ ھ) واقعہ بئر معونہ (صفر ۴ ھ) غزوہ بنی نضیر (ربیع الاول ۴ ھ) غزوہ ذات الرقاع (جمادی الاول ۴ ھ) غزوہ بدر صغریٰ (شعبان ۴ ھ) سریہ سیف البحر(۴ ھ) سریہ ذات القصہ (۴ھ) غزوہ دومۃ الجندل (محرم ۵ ھ) غزوہ بنی لحیان (جمادی الاول ۵ ھ) جنگ احزاب (شوال ۵ ھ) غزوہ بنی المصطلق (شعبان ۶ ھ)۔ اس طرح سورۃ النساء کے جہاد اور تنظیم و استحکامِ ملت سے متعلق احکام' ایک لحاظ سے' جنگ احد کے سیاسی نتائج سے تعلق رکھتے ہیں جس طرح عورتوں اور یتیموں کے حقوق اور وراثت و وصیت سے متعلق احکام جنگ احد ہی کے معاشرتی و معاشی نتائج سے تعلق رکھتے ہیں۔

سیاسی و معاشرتی صورت حال کے مطابق مسلمانوں کو "تازہ ترین" احکام دینے کے علاوہ' اس دور (زمانۂ نزول سورت) میں جاہلیت کے غلط نظریات کی تردید' اور

Marfat.com

اسلام کے پیغام کی نئے حلقوں تک تبلیغ کا کام بھی جاری رہا اب اسلام کی دعوت کا رخ، مشرکین مکہ کے علاوہ ' اہل کتاب (یہودیوں اور عیسائیوں) بلکہ پوری انسانیت کی طرف تھا۔ ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کو تبلیغ و اقامتِ دین کی اہم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بلند ترین اخلاق کی تعلیم دی گئی اور عقیدے کی صحت اور ایمان کی پختگی کو ان تعلیمات کی بنیاد قرار دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ النساء میں عیسائیوں اور یہودیوں کو یٰأہل الکتٰب(۱) تمام انسانوں کو یٰأیّھا النّاس(۲) اور خود مسلمانوں کو یٰأیھا الّذین آمنوا (۳) ' بصیغۂ ندا ' پکار کر ایمان اور عقائد درست کرنے اور درست رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ بلکہ معاشرتی و سیاسی احکام کے سلسلے میں بھی توجہ بار بار اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ و سلم کی طرف مبذول کرائی گئی ہے تاکہ اسلامی احکام کی یہ اصل و اساس نظروں سے کسی وقت بھی اوجھل نہ ہونے پائے۔

اس پس منظر کی روشنی میں ' اور اس حقیقت کے پیشِ نظر ' کہ اس مرحلے میں بیک وقت کئی پہلوؤں سے ارشاد و ہدایت اور اصلاح و تعمیر کا کام شروع تھا' سورۃ النساء کے اہم مضامین کو مختصراً حسبِ ذیل عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ حوالہ کی سہولت کے لیے' اور مزید وضاحت کی خاطر اصل مقام کی طرف رجوع کرنے کے لیے' آیات کے نمبر ساتھ دے دیئے ہیں۔

۱۔ اصلاح عقائد

۱۔ شرک ناقابل معافی گناہ ہے آیت ۴۸ ' ۱۱۶۔

۲۔ توبہ کی حقیقت اور اس کی قبولیت کی شرائط آیت ۱۷ ' ۱۸' ۱۱۰ ' ۱۱۲۔

۱۔ مثلاً آیت ۴۷ ' ۱۷۱

۲۔ مثلاً آیت ۱۷۰' ۱۷۴

۳۔ مثلاً آیت ۱۳۶

Marfat.com

۳- اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا آیت ۴۰، ۱۴۷۔

۴- اطاعتِ رسولؐ بدل و جان فرض ہے آیت ۶۴، ۶۵۔

۵- نجات آرزوؤں پر نہیں عمل پر منحصر ہے آیت ۱۲۳، ۱۲۴۔

۶- اللہ، اس کے تمام رسولوں، فرشتوں، کتابوں اور یومِ آخرت پر ایمان اور صحیح معنوں میں ایمان لانا ضروری ہے آیت ۱۳۶۔

۷- خدا کو ماننا مگر رسولوں کو نہ ماننا یا بعض رسولوں کو ماننا اور بعض کو نہ ماننا یہ سب صریح کفر ہے آیت ۱۵، ۱۵۱۔

۸- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانا بھی ضروری ہے جیسے ان سے پہلے انبیاء پر آیت ۱۶۳، ۱۷۰۔

۹- گمراہی کی ایک صورت دین میں غلو بھی ہے۔ جیسے عیسائیوں نے مسیح علیہ السلام کو خدا بنا دیا۔ آیت ۱۷۱، ۱۷۲۔

ان کے علاوہ سورت میں جگہ جگہ اللہ کی صفات کا بطور اسماء حسنیٰ اور اعمال کی جزا و سزا (ایمان بالآخرۃ) کا ذکر ہے۔

۲- عبادات سے متعلق احکام

۱- طہارت (غسل، وضو اور تیمّم) کا حکم اور مختصر طریقہ آیت ۴۳۔

۲- سفر میں نماز قصر کرنے اور جنگ میں نمازِ خوف ادا کرنے کا حکم اور مختصر طریقہ آیت ۱۰۱، ۱۰۳۔

۳- کفارۂ قتلِ خطا کا بیان آیت ۹۲۔

۳- مکارمِ اخلاق کی ترغیب اور ان کا حکم

الف- تمام اعلیٰ اخلاق کی بنیاد عبودیت (۱) اور تقویٰ (۲) پر ہے یعنی یہ کہ آدمی صرف ایک اللہ ہی کی بندگی اختیار کرے اور اس کی نافرمانی سے بچے آیت ۱، ۳۶، ۴۹، ۱۳۱۔

Marfat.com

ب- تقویٰ و عبودیت کی اس مضبوط بنیاد پر کھڑی ہونے والی مکارم اخلاق کی وسیع عمارت کے حسبِ ذیل ضروری عناصر اس سورت میں مذکور ہوئے ہیں۔

(۱) قول معروف آیت ۵ ' ۸ ' ۹ ۔

(۲) والدین ' اقربا ' یتیموں ' مسکینوں ' پڑوسیوں ' ساتھیوں اور ماتحتوں سے حسن سلوک آیت ۳۶ ۔

(۳) ادائے امانت آیت ۵۸۔

(۴) عدل و انصاف کا بلند معیار آیت ۵۸ ' ۱۳۵۔

(۵) تحیّہ حسنہ (سلام کا اچھا جواب دینا) آیت ۸۶۔

(۶) شفاعت حسنہ (بھلائی کی سفارش) آیت ۸۵۔

(۷) خائنوں کی طرفداری نہ کرنا آیت ۱۰۵۔

(۸) بھلائی اور لوگوں کی بہتری کے کاموں میں خفیہ اور خاموش شرکت آیت ۱۱۴۔

(۹) کمزوروں کی حمایت تن ' من ' دھن سے کرنا آیت ۷۵۔

۴- رذائل اخلاق کی مذمّت اور ان سے ممانعت

الف- تمام رذائل اخلاق کی بنیاد کفر یا اتباع شہوات ہے آیت ۲۶ ' ۲۷ ' ۳۸' ۳۹' ۶۰۔

ب- اس سورت میں اخلاقی پستی کی حسبِ ذیل صورتوں کی مذمت کی گئی ہے ' ان سے روکا گیا ہے اور ان کے ارتکاب کو گناہ قرار دیا گیا ہے۔

۱- یتیم کا مال کھانا آیت ۲ ' ۶' ۱۰

۲- جنسی آوارگی و بے حیائی اور سفاح و مخادنت آیت ۱۶' ۲۴' ۲۵۔

۳- ناجائز کمائی آیت ۲۹

۴- عدم احترامِ نفس آیت ۲۹

۵- تکبر و خودستائی آیت ۳۶ ' ۱۷۳

Marfat.com

۶- بخل آیت ۳۷

۷- ریاکاری آیت ۳۸

۸- حسد آیت ۵۴

۹- جھوٹی قسموں اور بہانوں سے اپنے آپ کو سچا ظاہر کرنا آیت ۴۹، ۶۲، ۱۱۲

۱۰- خیانت آیت ۱۰۷

۱۱- سازشیں کرنا آیت ۱۱۴

۱۲- نفاق و دو رخی آیت ۲۳۸، ۱۴۲

۱۳- الجھر بالسوء (بدگمانی پر زبان کھولنا) آیت ۱۴۹

۵- عائلی اور معاشرتی زندگی سے متعلق احکام

الف عائلی زندگی کی ابتداء اور اس کے اغراض و مقاصد

۱- کنبہ انسان کی اجتماعی زندگی کا پہلا معاشرتی و معاشی یونٹ آیت ۱، نیز آیات وراثت (۱۱، ۱۲) اس کی تائید کرتی ہیں۔

۲- نکاح کی اجازت آیت ۳، ۲۴ جزوی طور پر

۳- تعداد ازدواج کی مشروط اجازت اور اس کی حد آیت ۳

۴- نکاح پر پابندیاں (محرمات) آیت ۲۲ تا ۲۴

۵- نکاح کی غرض و غایت (i) احصان اور (ii) سفاح و مخادنت سے اجتناب آیت ۲۴، ۲۵

ب- عائلی زندگی میں میاں بیوی کے حقوق و فرائض کی تقسیم:

مرد کے فرائض

۱- مہر کی ادائیگی آیت ۴، ۲۴ نیز ۲۰، ۲۱

۲- نفقہ و غیرہ مالی ضروریات کی ذمہ داری آیت ۳۴

۳- عدل بین الازواج آیت ۳، ۱۲۹

Marfat.com

۴- بیوی یا بیویوں کے ساتھ حسن معاشرت آیت ۱۹

۵- عائلی امور کی مجموعی نگرانی اور انتظام آیت ۳۴

عورت کے فرائض

۱- بے حیائی سے بچنا آیت ۱۵ ' ۱۹' ۲۵

۲- انتظامی اور شرعی امور میں خاوند کی فرماں برداری آیت ۳۴

۳- خاوند کے حقوق اور اپنی عصمت کی حفاظت آیت ۳۴

۴- خاوند کے ساتھ صلح اور تعاون کی پالیسی اختیار کرنا آیت ۱۲۸

ج- عائلی زندگی میں بدمزگی کے اسباب اور اس کا علاج

۱- محض پسند نا پسند اور تلقین رجائیت آیت ۱۹

۲- عورت کی طرف سے سرکشی آیت ۳۴

۳- مرد کی طرف سے سرکشی آیت ۱۲۸

۴- باہمی صلح اور اصلاح حال کی کوشش آیت ۳۵ ' ۱۲۸

۵- آخری علاج ' تفرقہ آیت ۱۳۰

د - عائلی روابط کی تنظیم اور باہمدگر احساس ذمہ داری (Receiprocal Responsibility) کے ذریعے معاشرے کا استحکام

۱- احکامِ میراث و وصیت آیت ۷ ' ۱۱ ' ۱۲ ' ۳۳' ۱۷۶

۲- قریبی رشتہ داروں خصوصاً یتیموں اور کمزوروں کے ساتھ حسنِ سلوک آیت ۸'۳۶'۱۲۷

۳- یتامیٰ کی دیکھ بھال اور ان کے امور کی نگرانی آیت ۲ ' ۵' ۶' ۹

۴- "ایک رحم" سے ہونے (قرابت داری) کی بنیاد پر احساس ذمہ داری کو "ایک ہی جان" سے ہونے (نسلِ آدم) تک وسعت دینے کی تلقین آیت ۱۔

۵- مکارم اخلاق کی تلقین سے صالح معاشرے کی تشکیل دیکھئے اوپر ۴ کے ماتحت)

Marfat.com

۵- خاندانی روابط اور معاشرتی تعلقات کو نقصان پہنچانے والے امور سے اجتناب

۱- بیوی کو خاوند کی نافرمانی سے ممانعت آیت ۳۴

۲- خاوند کو بیوی کی حق تلفی یا اس پر زیادتی سے ممانعت آیت ۱۹ تا ۲۱ ' ۳۴ ' ۱۲۹

۳- وصیت یا قرض میں کسی کی حق تلفی نہ کرنا آیت ۱۲

۴- رشتہ داروں اور تمام انسانوں کے خلاف رذائل اخلاق سے پرہیز کے احکام (دیکھئے اوپر ۴ کے ماتحت)

۶- مسلمانوں کی اجتماعی ملّی زندگی سے متعلق احکام

الف- اللہ اور رسولؐ کی اطاعت

۱- اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر انعام اور نافرمانی پر سزا ' آیت ۱۳ ' ۱۴' ۴۲ ' ۶۹

۲- اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کا حکم آیت ۵۹

۳- رسولؐ کی اطاعت اللہ ہی کی اطاعت ہے آیت ۱۱۵

ب- اطاعتِ امیر کی اہمیّت اور اختلافات کا حل

۱- مسلمانوں پر اپنے حاکم وقت کی اطاعت بھی لازمی ہے مگر یہ کہ امیر خود مسلمان ہونا چاہیے۔

۲- اختلافات کی صورت میں قرآن و سنت کی طرف رجوع کیا جائے آیت ۵۹۔

۳- اہم قومی و ملّی مسائل حکومت کی سطح پر طے کرنے چاہئیں اور ان کے متعلق افواہیں نہ پھیلائی جائیں آیت ۸۲

۴- مسلمانوں کے متحدہ و متفقہ مسلک یا فیصلوں کی خلاف ورزی اور کافروں کی سیاسی دوستی باعث عذاب ہے آیت ۱۱۵ ' ۱۴۴

Marfat.com

ج- جہاد کی اہمیت اور اس کے متعلق احکام

۱- جہاد کا ایک مقصد کمزور مسلمانوں کو ظالموں کے پنجے سے نجات دلانا ہے
آیت ۷۵

۲- جہاد میں "موت کا خطرہ" محسوس کرنا حماقت ہے یہ "خطرہ" تو بہرحال درپیش آئے گا ہی آیت ۷۷، ۷۸

۳- مومنِ مجاہد کے درجات اور فضائل، مومن غیر مجاہد کی نسبت کہیں زیادہ ہیں
آیت ۹۵

۴- دار الکفر کے ساتھ جہاد کا تقاضا ہے کہ وہاں (دارالکفر میں) رہنے والے مسلمان دار الاسلام کی طرف ہجرت کریں آیت ۸۹، ۹۷، ۱۰۰

۵- مسلمانوں کو ہر وقت دشمن کے مقابلے کے لیے تیار رہنا چاہیے آیت ۷۱

۶- راہِ خدا میں مرنا یا غالب آنا دونوں طرح کامیابی اور نفع کا سودا ہے۔
آیت ۷۴

۷- مسلمان کی لڑائی صرف اللہ کی راہ میں ہونی چاہیے آیت ۷۶

۸- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اکیلے بھی کافروں سے لڑنے کا حکم دیا گیا البتہ مومنوں کو جہاد کی ترغیب دلانے کا حکم بھی دیا گیا آیت ۸۴-

۹- مسلمانوں سے برسر جنگ کافر قوم کے علاقے میں رہنے والے ایسے مسلمان جو اسلامی حکومت کے خلاف معاندانہ کاروائیوں میں رضاکارانہ حصہ لیتے ہوں۔ ان سے بھی جہاد کرنا ہو گا۔ آیت ۸۸-۹۱

۱۰- جہاد میں بین الاقوامی معاہدوں کا لحاظ رکھنا ہو گا آیت ۹۲

۱۱- نماز کی پابندی سفر اور میدانِ جنگ میں بھی ضروری ہو گی البتہ سفر میں قصر اور جنگ میں نمازِ خوف پڑھ سکتے ہیں آیت ۱۰۱-۱۰۳

۱۲- جہاد کو دنیا طلبی کا ذریعہ مت بناؤ۔ آیت ۹۴

۱۳- جہاد سے جی چرانا نفاق کی علامت ہے آیت ۷۲

Marfat.com

۷- اندرونی دشمنوں کی پہچان اور ان کے بارے میں پالیسی

جہاد کے ضمن میں یہودیوں اور منافقوں کی مذمت بھی کی گئی ہے۔ انہیں راہِ راست پر آنے کی تلقین بھی اور مسلمانوں کو ان سے خبردار رہنے کی تنبیہہ بھی۔ کیونکہ اس وقت یہ دو اندرونی دشمن' بیرونی دشمن (کفار) سے بھی بڑھ کر خطرناک تھے۔

الف- منافقوں سے متعلق

۱- منافق خدا اور رسولؐ کے فیصلوں اور احکام کو ناگوار سمجھتے تھے۔ آیت ۶۰ ' ۶۱

۲- منافق جہاد سے جی چراتے تھے آیت ۷۲

۳- منافق باتیں زیادہ بناتے اور عمل کے وقت گھبرا جاتے تھے آیت ۷۷

۴- مسلمانوں کے خلاف سازشیں اور سرگوشیاں کرتے تھے آیت ۸۱

۵- ایسی افواہیں پھیلاتے جن کا مقصد مسلمانوں کو دشمن سے غافل رکھنا یا بدل کرنا ہوتا تھا آیت ۸۳

۶- ایسے مسلمان بھی منافق ہی قرار دیے گئے جو محض دنیوی مفادات کے لیے رضامندانہ دارالکفر میں رہتے تھے اور دار الاسلام کی طرف ہجرت نہیں کرتے تھے' آیت ۸۸ تا ۹۱

۷- منافق' کافروں کی سیاسی دوستی میں عزت کے خواہاں ہوتے تھے آیت ۱۳۹

۸- اللہ کے احکام اور دینی امور کا استہزاء ان کا معمول تھا آیت ۱۳۹-۱۴۰

۹- خدا اور رسولؐ سے دھوکا کر کے در اصل خود فریبِ نفس میں مبتلا تھے آیت ۱۴۲

۱۰- منافقوں کا نماز میں جی نہیں لگتا تھا۔ آیت ۴۳

۱۱- منافق کی سزا کافر سے بھی زیادہ آیت ۱۴۵

نوٹ: کیا آج بھی مسلمانوں کی صفوں میں اس قسم کے لوگ موجود نہیں ؟

Marfat.com

ب- یہودیوں کے متعلق

۱- یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرارت اور گستاخی سے باز نہیں آتے تھے اور ان کی اندرونی عداوت ان کے لب و لہجہ سے بھی عیاں ہو جاتی تھی آیت ۴۵-۴۶

۲- مسلمانوں کی عداوت میں بت پرست مشرکوں کے دین کی تعریف بھی کر گزرتے تھے۔ آیت ۵۱ ' ۵۲

۳- ان کی عداوت کی وجہ یہ حسد بھی تھا کہ نبوت کسی یہودی کو کیوں نہیں ملی آیت ۵۴

۴- پیغمبروں سے الجھنا اور ان کی راہ میں مشکلات پیدا کرنا یہود کی قومی خصوصیت بن گئی تھی آیت ۱۵۳ ' ۱۵۴

۵- اپنے جرائم پر نادم ہونے کی بجائے نازاں ہوتے تھے مثلاً مسیح علیہ السلام کے بارے میں ان کا رویہ اب تک یہی ہے آیت ۱۵۶ ' ۱۵۷

۶- سود کھاتے تھے اور ناجائز کمائی سے پرہیز نہیں کرتے تھے آیت ۱۶۱

۸- دعوت اسلام اور تبلیغ

اس سورت میں یہودیوں اور عیسائیوں کو اسلام کی دعوت دی گئی ہے۔ یہودیوں کو آیت ۴۷ ' ۱۷۰ میں اور عیسائیوں کو آیت ۱۷۱ تا ۱۷۳ میں اس کے علاوہ عام انسانوں کو بھی خطاب کیا گیا ہے۔ اس سورت کے زمانہ نزول کے آخر تک اسلام کی دعوت عرب سے باہر پہنچانے کا کام بھی شروع ہو چکا تھا۔

☆☆☆

Marfat.com

تخلیق انسان

یآأیّھا النّاس اتّقوا ربّکم .... (النساء /۱: اے لوگو! اپنے رب کی نافرمانی سے بچتے رہو)۔ تمام انسانوں کو مخاطب کر کے یہ بتا دیا گیا کہ ہر انسان پر اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی لازمی اور اس کی نافرمانی سے اجتناب ضروری ہے۔ رنگ، نسل، قوم، ملک یا مرتبے وغیرہ کی بناء پر کوئی استثناء نہیں ہے۔ پروردگار سے ڈرنے کا مطلب اس کے احکام کا احترام کرنا اور خلاف ورزی کرنے سے ڈرنا ہے۔

الّذی خلقکم :-(جس نے تم کو پیدا کیا) انسان (اور کائنات) کی تخلیق کا کونسا نظریہ درست ہے؟ قرآن کو اس سے چنداں سروکار نہیں ۔ اصل بات تو یہ ہے کہ انسان بہرحال مخلوق ضرور ہے۔ اس کا ایک خالق ہے اور وہی اس کا رب ہے۔ اسی پیدا کرنے والے ۔ اور صرف اسی ۔ کی ربوبیت پر ایمان اور بھروسہ اور اسی کے آگے ذمہ داری کا احساس (تقویٰ) انسان کی فلاح کا نقطہ آغاز بھی ہے اور معیارِ کمال بھی۔

من نّفس وّاحدۃ :(ایک جان سے)

۱- تمام مفسرین کے نزدیک یہاں نفس واحدہ (ایک جان) سے مراد ابو البشر حضرت آدمؑ ہیں۔ جن سے نوع انسانی شروع ہوئی اور جو ہر رنگ و ہر نسل کے انسانوں کے آخری جدِ اعلیٰ ہیں۔ وحدتِ نوعِ انسانی کا یہ سبق - جو قرآن کریم میں کئی اور مقامات پر بھی موجود ہے - قرآنی تعلیمات کا ایک خاص امتیازی پہلو ہے، اور اس لحاظ سے خصوصاً قابلِ غور ہے کہ تہذیب و شائستگی اور "انسانیت" کے اس دور میں بھی ایسی قومیں اور مذاہب موجود ہیں جو اس بات کے بھی قائل نہیں کہ بلحاظ اصل انسان انسان سب ایک ہیں۔

Marfat.com

۲- دورِ حاضر کے بعض علماء جو قرآن مجید کی آیات پر علوم طبیعیہ (Natural Sciences) اور عصری تحقیقات کی روشنی میں غور کرتے ہیں ' کا ذہن اس طرف گیا ہے کہ نفس واحدہ سے مراد سب سے پہلا (Protoza) یا (Animulcula) بھی ہو سکتا ہے جو حیوانی زندگی کا پہلا مرحلہ ہے۔ یا وہ سب سے پہلا خلیہ (Cell) مراد ہے جس کا مواد خدا جانے کس طرح پہلی دفعہ مٹی (طین) کے اجزاء سے ایک جگہ جمع ہوا۔ یا وہ بار آور خلیہ (Oosperm) جس سے رحم مادر میں زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔

وخلق منها زوجها :- (اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا)

۱- عام طور پر اہلِ تفسیر زوج سے مراد حضرتِ حوّاء لیتے ہیں جن کی پیدائش کے متعلق موجودہ توریت (کتاب پیدائش : ۲۲-۲۳) میں یہ بتایا گیا ہے کہ "خدا نے پہلے آدمؑ کو پیدا کیا۔ پھر جب وہ سوئے ہوئے تھے تو ان کی ایک پسلی نکال کر اس سے حواؑ پیدا کی اور پھر اس جوڑے سے نسل انسانی پھیلی"۔ اور یہی قصہ اسرائیلی روایات کے ذریعے مسلمانوں میں بھی مشہور ہو گیا۔ خود قرآن مجید تخلیقِ حواؑ کے بارے میں بالکل خاموش ہے۔ ایک مشہور حدیث سے بظاہر توریت کے بیان کی تائید ہوتی ہے مگر اس میں بھی آدمؑ اور حواؑ کا نام نہیں۔ بلکہ صرف عورت کے مرد کی پسلی سے پیدا ہونے کا ذکر ہے جس کا مطلب تخلیقِ انسان کی آغاز داستان نہیں بلکہ فطرت نسوانی کے بعض نفسیاتی پہلوؤں کی نشان دہی ہے اور اس مفہوم کی تائید بخاری و مسلم کی اس روایت سے ہوتی ہے جس میں عورت کو "پسلی کی مانند" (کالضّلع) کہا گیا ہے۔

۲- قرآن کریم کے ان الفاظ کا ایک مفہوم موجودہ علم الحیات (Biology) کی تحقیقات کی روشنی میں بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ حیاتیات کی رو سے ہر جاندار کی ابتداء ایک خلیہ (Cell) سے ہوتی ہے۔ پھر اسی خلیے سے اس کا جوڑا پھوٹ کو دو خلیے بن جاتے ہیں اور پھر تیزی سے ہر خلیہ اپنے سے دو گنے چوگنے خلیے بناتا چلا جاتا ہے۔ رحم مادر میں انسان (بلکہ ہر حیوان) کی ابتداء ایک نر جرثومہ حیات (Sperm Cell) اور ایک مادہ بیضہ (Ovum Cell) کے اتحاد جنسی سے ہوتی ہے۔ جس کے فوراً بعد اس بار آور خلیے

Marfat.com

(Oosperm) میں ایک عمل تقسیم و امتیاز (Mitosis) شروع ہو جاتا ہے یعنی یہ خلیہ ٹوٹ کر فوراً دو خلیے بن جاتا ہے پھر ہر خلیہ ٹوٹ کر دو خلیے بننا شروع ہو جاتا ہے اور اس طرح دو سے چار اور چار سے آٹھ اور آٹھ سے سولہ ۔ علی ہٰذا القیاس یہ عمل نو ماہ جاری رہتا ہے بلکہ بعد میں بھی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کا بالغ مرد یا عورت کا بدن کم از کم ۲۶۵۰۰،۰۰۰،۰۰۰ خلیات سے مرکب ہوتا ہے یعنی روئے زمین کی ساری آبادی سے تیرہ ہزار گنا ۔ ذرا غور کیجئے کہ خلیوں کی اس "بستی" میں جسے بدنِ انسانی کہتے ہیں کس طرح ایک قسم کے متعدد خلیوں میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ کچھ خلیے دل و جگر بناتے ہیں دوسرے بال خاخن وغیرہ - مرد عورت کے جسم کا ہر ہر خلیہ نر یا مادہ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر اللہ کی قدرت سے ایک خاص قسم کے خلیات غالب ہو کر ہر انسان کی صنف اور جنس متعین کر دیتے ہیں (فتبارك الله احسن الخالقين)

وبث منهما رجالا كثيرا ونسآء :(اور ان دونوں سے بکثرت مرد و عورت پھیلا دیے) اس طرح اللہ نے کروڑہا خلیات سے ' جن میں کثرتِ اختلاف کے باوجود ایک بنیادی وحدت ہے ' بدن انسانی بنایا جسے عالم اصغر کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح اس نے دنیا کی یہ بستی بسائی جو خلیات کی بجائے مرد و عورت' ہر دو جنس ' پر مشتمل افراد انسانی کا "عالم اکبر" ہے "نفس واحدہ" اور اس کے "زوج" سے بکثرت مردوں اور عورتوں کے پھیلنے کا ذکر کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں علم الحیات کے نقطۂ نظر سے آغاز حیات کا ذکر نہیں ہو رہا بلکہ پہلے انسان اور اس کے جوڑے کا ذکر ہو رہا ہے قطع نظرِ اس بات کے کہ یہ انسان اول منفرد عمل تخلیق تھا یا ایک مرحلہ ارتقاء۔

واتقوا الله :-(اور اللہ سے ڈرتے رہو) جس طرح بدن انسانی کے اس "عالمِ اصغر" کا ہر ہر خلیہ تکوینی طور پر اللہ کے قانون کا پابند ہے۔ اور ہر عضو کے خلیے اپنے جداگانہ عمل (Fucntion) کے باوجود دوسرے اعضاء کے خلیوں کے معاون ہوتے ہیں۔ چشمۂ حیات (خون) سے ہر عضو کچھ اپنے لیے رکھتا ہے اور کچھ دوسرے اعضاء کو پہنچا دیتا ہے۔ اس طرح ان خلیوں میں کثرت تعداد اور اختلاف کار کے باوجود کبھی باہم کوئی

Marfat.com

مخالفت یا فساد نہیں ہوتا۔ اور انسان "تندرست" رہتا ہے - اسی طرح اے انسانو! تم ' جو اس انسانی سوسائٹی کے "عالم اکبر" کے خلیات (افراد) ہو ' تشریعی طور پر اللہ کے احکام کے پابند رہو یعنی تقویٰ اختیار کرو۔ تاکہ روئے زمین پر فتنہ و فساد کی بجائے امن و سلامتی قائم ہو۔

اَلّذی تسآء لون به : (جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے مانگتے ہو)

(۱) باہم ایک دوسرے سے حقوق و مراعات کا مطالبہ اس (اللہ) کے نام پر کرتے ہو۔ پس جب اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے اس کا نام استعمال کرتے ہو۔ تو ادائے فرض میں بھی اسے یاد رکھو۔

(۲) جس کے واسطہ سے تم اپنے کام نکالتے ہو۔ معاملات میں اعتماد کی بنیاد یہی بنتا ہے۔ اور دیانت داری ' اللہ کے ذریعے (واسطے) سے پیدا ہونے والی ذمہ داری ہی کا نام ہے۔

(۳) جس کا واسطہ دے کر ضعیف دبے کس لوگ رحم طلب کرتے ہیں۔

(۴) جاہ و اقتدار حاصل کرنے یا سیاسی شان و شوکت بڑھانے کے لیے جس کا نام بار بار عوام کے سامنے استعمال کرتے ہو (اس کے سامنے جواب دہی) کا بھی خیال رکھو۔

والارحام (اور تعلقات بگاڑنے سے پرہیز کرو):- اس کا عطف واتّقوا الله پر ہے یعنی جس طرح اللہ کے احکام کا احترام اور اس کی نافرمانی سے اجتناب ضروری ہے۔

(۱) اسی طرح قریبی رشتہ داروں کے حقوق کا احترام بھی لازمی ہے جن کے ساتھ تمہارا تعلق رحم (یعنی نسب اور قرابت) کا ہے۔

(۲) خیال رہے یہاں حکم رشتہ داروں کی حق تلفی سے بچنے کا ہے۔ جس کا امکان اور ارتکاب عموماً زیادہ ہوتا ہے۔ اقربا سے حسن سلوک اور قرابت کا لحاظ بھی واجب ہے اور اسے قطع کرنا حرام ہے مگر خویش نوازی اور اقربا پروری (Nepotism) بذاتِ خود ایک مذموم فعل اور گناہ ہے۔ کیونکہ اس میں رشتہ دار کو اس کا جائز حق نہیں بلکہ کسی

Marfat.com

دوسرے کا غصب کیا ہوا حق دیا جاتا ہے۔

إن الله كان عليكم رقيبا (یقین مانو اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے) : اللہ تمہارے ذاتی خانگی اور اجتماعی ہر قسم کے معاملات کی کڑی نگرانی کر رہا ہے۔ اسے اچھی طرح خبر ہے کہ تم اپنے بیوی بچوں اپنے رشتہ داروں ' اپنی سوسائٹی کے کمزوروں اور ضعیفوں کے حقوق کی پوری رعایت کرتے ہو۔ یا ان پر ظلم کرتے ہو۔ نہ ظالم کی حرکتیں اس سے پوشیدہ رہ سکتی ہیں اور نہ مظلوم کی حفاظت و نگہبانی اس پر دشوار ہے۔

چونکہ اس سورت میں آگے چل کر بڑے نازک قسم کے حقوق بیان ہوئے ہیں جن کا صحیح معنوں میں نفاذ نہ تو صرف قانون بنا دینے سے ہو سکتا ہے) ' چاہے وہ قانون فی نفسہ کتنا ہی اچھا کیو نہ ہو) اور نہ ہی کسی بیرونی دباؤ یا ڈنڈے کے زور سے - مثلاً ازدواجی و عائلی حقوق میراث و قرابت کے حقوق۔ کمزوروں اور ضعیفوں کے حقوق۔ سوسائٹی اور ملّت کے حقوق۔ اللہ اور اس کے رسول کا حقِ اطاعت و خلوص وغیرہ اس لیے اس تمہیدی آیت میں دو دفعہ تقویٰ (پرہیزگاری ـ محتاط طرزِ عمل ـ اللہ کے سامنے جواب دہی کا احساس اور دینی و اخلاقی نظم و ضبط یا ڈسپلن کا شعور) پر زور دیا گیا ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

تعدادِ ازدواج

مرد کو بیک وقت ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی اجازت

۱- پہلی بات تو یہ یاد رہے کہ اسلام نے دنیا میں یہ مسئلہ ازسرِ نو یا پہلی دفعہ متعارف نہیں کرایا۔ کم و بیش دنیا کی تمام اقوام و مذاہب میں اس کا رواج اور جواز موجود رہا ہے۔بلکہ اکثر داعیانِ حق و بانیانِ مذاہب نے خود اس پر عمل کر کے اسے ناقابل اعتراض ہونے کی سند دی ہے۔ اسلام نے تو اس میں اصلاح کی اور وہ بھی بڑے متوازن و معتدل طریقے پر کہ پہلے تو تعداد پر پابندی لگائی یعنی چار تک حد مقرر کر دی۔ پھر تعداد کی اس اجازت کو عدل کے ساتھ مشروط ٹھہرایا۔ اور یوں ایک بیوی پر قناعت کرنے کو عام (Normal) حالات میں اقرب الی الصواب قرار دیا۔

۲- اسلام نے یک زوجی (Monogamy) کو بہتر تو قرار دیا مگر اس کا پابند نہیں کیا۔ اسی طرح تعداد ازدواج پر کڑی شرائط تو مقرر کر دیں مگر اس کی مذمت نہیں کی۔ یہی اس کے نظام عدل و حکمت کا کمال ہے۔

۳- تعداد ازدواج فی نفسہ کوئی برائی نہیں ہے جس کی وجہ سے کسی مسیحیت زدہ اور مغرب گزیدہ مسلمان کو شرمانے اور طرح طرح کی تاویلیں کرنے کی ضرورت محسوس ہو۔ بعض حالات (مثلاً انفرادی مجبوریوں یا جنگ کے بعد مردوں کی قلت اور بے شوہر عورتوں کی کثرت وغیرہ) میں یہ چیز ایک اخلاقی اور تمدنی ضرورت بن جاتی ہے۔ نکاح سے باہر یا اس کے بغیر صنفی بدامنی پھیلانے کے نقصانات یقیناً سماج اور اخلاق کے لیے اس سے کہیں زیادہ ہیں جو تعداد ازدواج سے پہنچ سکتے ہیں - تعداد ازدواج کا راستہ کھولے بغیر یہ ناممکن ہے کہ دنیا کا کوئی قانون حرام کاری کا سدباب

Marfat.com

کرنے میں کامیاب ہو۔(۱)

۱۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل امور بھی قابل غور ہیں:-

(۱) موجودہ علم "مردم شماریات" (Demography) نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ولادت ' شیر خوارگی اور بچپن میں لڑکوں کی شرح اموات لڑکیوں سے زیادہ ہوتی ہے اور کوائف بتلاتے ہیں کہ بعض ملکوں اور قوموں میں جہاں لڑکوں کی شرح پیدائش لڑکیوں کے مقابلے میں ۵-۶ فیصدی تک زیادہ ہوتی ہے' وہاں بھی دس بارہ سال کی عمر کو پہنچنے تک مجموعی طور پر لڑکوں کی تعداد کا تناسب لڑکیوں کی تعداد کے مقابلے پر کم ہو جاتا ہے۔

(۲) جوانی اور اس کے بعد کی عمر میں بھی عورتوں کی نسبت مردوں کے لئے مرنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ عموماً جانبازانہ پیشے اور جاں طلب قسم کے کام مرد اختیار کرتے ہیں۔

(۳) ہر مرد شادی نہیں کر سکتا کیونکہ شادی سے پہلے عموماً مرد کو بعض خاص جسمانی سماجی اور معاشی شرائط پوری کرنا ضروری ہیں۔ خصوصاً معاشی لحاظ سے اس کا برسر روزگار ہونا اور اہل و عیال کے متوقع اخراجات کا اپنے معاشرتی رتبہ کے لحاظ سے پورا کرنے پر قادر ہونا ' عموماً ہر ملک و قوم میں لازمی تسلیم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ بہت سے مرد عمر بھر شادی نہیں کر پاتے یا کم از کم پچیس تیس سال تک کی عمر تک کنوارے رہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس عورت بالعموم بالغ ہونے کے ساتھ ہی شادی کے قابل سمجھی جاتی ہے۔ اگر کسی معاشرے میں ایک ہی عمر کے سو مردوں اور سو عورتوں کے متعلق کوائف جمع کیے جائیں تو مختلف پہلوؤں سے شادی کی شرائط پر پورا اترنے والے مردوں کا تناسب عورتوں کے مقابلے پر کم ہو گا۔

(۴) بعض دفعہ بیوی میں کوئی ایسا جسمانی ' ذہنی یا اخلاقی عیب ہوتا ہے جو شادی کے بعد ظاہر یا لاحق ہوتا ہے اور جو شادی کی اصل غرض و غایت (اولاد ' سکون وغیرہ) ہی کے سراسر منافی ہوتا ہے۔ پھر اس قسم کی اکثر صورتوں میں محض دوسری شادی کے لیے پہلی عورت کو طلاق دینا ' اس کی موجودگی میں دوسری بیوی لانے کی نسبت ' زیادہ ظالمانہ فعل ہوتا ہے۔

ان تمام اسباب و عوامل پر علی وجہ البصیرت نگاہ رکھتے ہوئے ' دنیا کی تمام اقوام کے لیے کوئی ایسا ازدواجی قانون مرتب نہیں کیا جا سکتا جس میں تعداد ازدواج کی گنجائش نہ ہو۔

Marfat.com

۴- حیاتیاتی نقطہ نظر سے (Biologically) مرد و عورت میں اتنا واضح تفاوت ہے کہ اسے نظر انداز کر دینا فطرت سے جنگ کرنا ہے۔ فعل جنسی اتحاد تناسلی کے فوراً بعد مرد کی حیاتیاتی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے مگر عورت پر ایک لمبے عرصے کے لیے حمل و ولادت اور رضاعت و پرورش وغیرہ کی ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے۔ اتنے عرصے کے لیے مرد کی شہوانی جبلت منقطع نہیں ہو جاتی ۔ اس لیے جو شریعت مرد کی اس جبلت و ضرورت کو کوئی رعایت اپنے نظام میں نہیں رکھتی وہ کچھ بھی ہو۔ بہرحال خدائی اور مطابقِ فطرت نہیں قرار دی جا سکتی۔

۵- مرد کو متعدد بیویوں کی اجازت (Polygamy) سے عورت کو بیک وقت متعدد شوہروں کی اجازت(Polygandry) پر استدلال (بلکہ بعض نام نہاد مسلمان "لیڈرانیوں" کی طرف سے اس کا مطالبہ) سراسر جہالت اور ضلالت و سرکشی پر مبنی ہے۔ اول تو اس لیے کہ ' جیسا ابھی اوپر بیان ہوا ہے۔ حیاتیاتی لحاظ سے مرد و عورت کے جنسی وظائف (Functions) اور صنفی افعال الاعضاء بالکل جداگانہ ہیں۔ تمدنی معاشرتی امور میں اور حقوق و واجبات کی تقسیم میں تو مساوات ممکن بھی ہے' مگر حیاتیاتی اور فطری اعتبار سے مساوات انسان کے بس کی چیز نہیں ہے۔ دوسرے اس لیے کہ تمدنی و عمرانی نقطہ نظر سے بھی " چند شوہری " ناقابل قبول ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا رواج کبھی کسی متمدن و ترقی یافتہ قوم میں نہیں رہا۔ نسب کی حفاظت اور اس کی پہچان کے عمرانی و تہذیبی فوائد و برکات سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور "چند شوہری نظام" میں اس کا تصور بھی ممکن نہیں۔

۶- اسلام میں تعداد ازدواج حکم نہیں ہے بلکہ اجازت ہے۔ اور وہ بھی کڑی شرائط کے ساتھ مشروط پس اگر کوئی مسلمان عدل و انصاف کی شرائط پوری کیے بغیر تعدد ازدواج کی اجازت سے فائدہ اٹھاتا ہے تو وہ اللہ کے ساتھ دغابازی کرتا ہے اور اسلامی حکومت میں عدالتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اس لحاظ سے مظلوم عورتوں کی داد رسی کریں۔ مگر کسی فی نفسہ مفید یا ضروری چیز کے استعمال کو اس لیے ممنوع قرار دے دینا

Marfat.com

کہ بعض لوگوں نے اسے غلط بھی استعمال کیا ہے کوئی دانائی نہیں ہے۔

۷۔ تعدد ازدواج ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ اسے مسلمانوں کے حل طلب مسائل میں سرفہرست رکھا جائے۔ کسی اجازت کا غلط استعمال یا کسی معاشرتی و اخلاقی قانون کی خلاف ورزی اس وقت ایک معاشرتی مسئلہ بن جاتی ہے جب اس کے مرتکب اکثر لوگ ہونے لگیں۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلم معاشرے میں شرعی اجازت کے باوجود ' اکثر مرد (غالباً نوّے فی صد) یک زوجی زندگی بسر کرتے ہیں۔ عام آدمی دوسری شادی کو ایک معاشی و معاشرتی وبال سمجھتا ہے اور ناگزیر ضرورت کے سوا اس سے گریز کرتا ہے۔ یہ صرف کھاتا پیتا طبقہ اور بڑے لوگ ہی ہیں جو اللہ کے اس قانون کو کھیل سمجھتے رہے ہیں۔ اس لیے صرف انہی کی سرکوبی کی ضرورت ہے۔

۸۔ تعداد ازدواج کی اجازت کے غلط استعمال کا تدارک کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمان مردوں اور عورتوں دونوں کو شریعت کے بتائے ہوئے حقوق و فرائض کا علم ہو کیونکہ ہمیشہ صرف مرد ہی بے انصافی کے مرتکب نہیں ہوتے بعض دفعہ عورتیں بھی خود "چھوٹی بیگم" بن کر "بڑی بی" کے حقوق پر چھاپہ مارنے میں ایک لطف اور معاشرتی عظمت محسوس کرتی ہیں۔

☆☆☆

Marfat.com

ملک یمین

(لونڈی اور غلام)

۱- اس سلسلے میں بھی پہلی بات تو یہ یاد رہے کہ اسلام نے دنیا میں لونڈی و غلاموں کا رواج شروع نہیں کیا۔ اس کا وجود زمانۂ قدیم سے کم و بیش تمام قوموں اور ملکوں میں چلا آیا ہے- اسلام سے پہلے کسی مذہب نے غلامی کو ختم کرنے بلکہ لونڈی غلاموں کی حالت سدھارنے پر بھی کوئی توجہ نہیں دی۔

۲- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے قیدیوں کے سوا یا جو پہلے سے لوگوں کے پاس لونڈی غلام تھے ان کے سوا کسی اور طریقے پر ہاتھ آئے ہوئے افراد کو (مثلاً خود والدین کا اپنی اولاد کو بیچ دینا یا کسی قافلے یا قبیلے کو لوٹ کر اور اغوا کر کے لانا) غلامی میں رکھنے کی اجازت نہیں دی بلکہ آزاد مرد و عورت کا بیچنا یا خریدنا جرم قرار دیا۔

۳- جنگ میں ہاتھ آئے ہوئے قیدیوں کو بھی عموماً صرف اس صورت میں لونڈی غلام بنایا جاتا تھا۔ جب ان کو واپس لے جانے والا ہی کوئی نہ ہوتا۔ نہ زر فدیہ دے کر نہ قیدیوں کے تبادلے میں۔ گویا کہ وہ قیدی ایک طرح سے لاوارث ہی ہوتا تھا۔

۴- اس زمانے میں حکومت کے لیے ان قیدیوں کو الگ جیلوں یا کیمپوں میں رکھنے کا بندوبست کرنا دشوار تھا - باقاعدہ فوج تک نہیں تھی - اس لیے سہولت کے لیے قیدیوں کو فوج ہی کے افراد میں تقسیم کر دیا جاتا۔ یہ نو وارد اس فرد کے خاندان کے ایک جزء (ملازم) کی حیثیت سے رہتا - مالک کو اس غلام سے کام لینے کا حق حاصل تھا مگر اس کے آرام کا بھی ہر طرح لحاظ رکھنا اس (مالک) پر واجب تھا۔

Marfat.com

۵۔ چونکہ یہ لونڈی یا غلام اس فوجی کو ایک طرح سے اس کی خدمات کے عوض کے طور پر ملتا تھا۔ اس لیے اسے یہ حق تھا کہ وہ چاہے تو کچھ رقم اپنے حق الخدمت کے طور پر لے کر اس لونڈی یا غلام کو آگے فروخت کر دے۔ مگر عہد نبوی اور خلفائے راشدین تک کہیں لونڈی غلاموں کی باقاعدہ منڈی کا ذکر تک نہیں ملتا۔

۶۔ اگر یہ قیدی عورت (لونڈی) ہوتی تو اس کے مالک کو اس سے ہم بستری کا حق بھی حاصل تھا (بلکہ اس اجازت کے بغیر ایک عورت کو مرد کے ماتحت کر دینے کا نتیجہ بھی تو وہی نکل سکتا تھا جس کی جھلک مرد افسروں کے ماتحت ملازم خواتین کی صورت میں ہم عموماً دیکھتے رہتے ہیں)۔ اس عورت کا جنگی قیدی ہو کر آنا ہی اس کے سابقہ نکاح کے خاتمہ کا اعلان ہوتا اور حاکم کی طرف سے اس کا باضابطہ ایک شخص کو دیا جانا نئے نکاح کا قائم مقام سمجھا جاتا تھا۔ مگر جنسی تعلقات کی صورت میں بعض ایسی شرائط کا پورا کرنا ضروری تھا جو اغراضِ نکاح سے تعلق رکھتی ہیں مثلاص استبراء رحم کر لینا تا کہ بچے کے نسب میں شبہ نہ رہے۔ اسی طرح ان تعلقات کا اعلان بھی ضروری تھا کیونکہ باپ کی مدخولہ لونڈی بیٹے پر اسی طرح حرام ہے جس طرح باپ کی منکوحہ بیوی۔ دو سگی بہنوں کو ایک آدمی جنسی تعلقات کے لیے بطور لونڈی کے بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ اسی طرح اگر مالک چاہتا تو کسی دوسرے آدمی کے ساتھ اپنی لونڈی کا نکاح کر دیتا۔ اس صورت میں مالک کو حقوق خدمت تو حاصل رہتے مگر اب جنسی تعلقات حرام ہو جاتے تھے۔ اصل مالک کے سوا یا اس کی باضابطہ شرعی اجازت اور اعلان کے بغیر گھر یا باہر کے کسی دوسرے آدمی کے لیے اس کی لونڈی کے ساتھ جنسی تعلقات قطعاً حرام تھے۔ خلاصہ یہ کہ ہر لونڈی کے ساتھ اس کے مالک کے جنسی تعلقات کا ہونا ضروری نہیں تھا اور اگر ہوتے تو یہ بلا شرط و قید محض کھلم کھلا شہوت رانی کے طور پر ہر گز نہیں ہوتے تھے۔ البتہ لونڈی کو منکوحہ بیوی کے سے حقوق و مراعات حاصل نہ تھے۔ جنگی قیدیوں کو فاتحین کے سے پورے شہری حقوق و مراعات (Civil Rights) نہ آج تک کبھی دیئے گئے ہیں نہ دیئے جا سکتے ہیں۔

Marfat.com

۷- اس کے ساتھ اسلام نے لونڈی غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیبات مختلف طریقوں پر دیں۔ قرآن و حدیث میں اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے۔ مختلف کفاروں میں لونڈی غلام آزاد کرنے کا حکم دیا۔ مصارف زکوٰۃ میں اسے مستقل مد قرار دیا۔ انہیں آسان شرائط پر اپنی آزادی خریدنے (مکاتبت) کا حق دیا۔ بچے کی ماں ہو جانے کے بعد لونڈی کو آگے بیچنے سے روک دیا۔ اس سے ہونے والی اولاد کو پورے قانونی حقوق دیئے۔ اور مالک کے مرتے ہی اس (ام الولد) کے ازخود آزاد ہو جانے کا حکم دیا۔ اس جنس (ملک یمین) کے سوسائٹی میں آنے کا صرف ایک ہی دروازہ تھا یعنی اسیرانِ جنگ اور یہ کوئی "درآمد" کی مستقل مد نہیں۔ اس کے برعکس ان کی آزادی کی متعدد راہیں کھول دیں - لونڈی غلاموں سے متعلق ان تمام احکام کا مجموعی مقصد صاف یہی معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ بتدریج غلامی کو ختم کر دیا جائے۔

۸- اسلام نے جبری اور فوری طور پر تمام لونڈی غلاموں کو آزاد کر دینے کا حکم اس لیے نہیں دیا تھا کہ اس زمانے میں لونڈی غلام معاشرے کا ایک جزو بنے ہوئے تھے اور ان سب کی فوری آزادی حکومت کے لیے "بحالیات" کا ایک اور لاینحل عقدہ پیش کرتی۔ غلامی کو ختم کرنے والے دوسرے احکام و اقدامات کے علاوہ مکاتبت (غلام کو آسان شرائط پر آزادی خریدنے کا حق) سے بڑھ کر دانشمندانہ اور ترقی یافتہ صورت اس مسئلے کو حل کرنے کا اور کیا ہو سکتی ہے؟ بہر حال غلامی ایک معاشرتی مسئلہ تھا اور اسلام نے اس کو تدریج کے ساتھ ختم کرنے کی حکیمانہ طرح ضرور ڈال دی۔

۹- بدقسمتی سے بہت جلد مسلمانوں اور خصوصاً ان کے امراء و حکمرانوں نے اسلام کے دوسرے بہت سے احکام کی طرح لونڈی اور غلاموں سے متعلق احکام کی بھی نہ صرف روح کو بھلا دیا بلکہ خلاف ورزی بھی کرنے لگے۔ عرب میں رائج غلامی کو بالآخر ختم کر دینے کے لیے اسلام نے جو اصلاحات اور شرائط و قیود نافذ کیں۔ مسلمانوں نے ان شرائط کی لفظی بجا آوری کے ساتھ اصل غلامی کو برقرار رکھنا ضروری خیال کیا۔ فوجی کو اپنے حق الخدمت کے طور پر لونڈی غلام کو آگے بیچ دینے کا جو حق دیا گیا تھا۔ اس کو

Marfat.com

یوں غلط استعمال کیا گیا کہ ہر لونڈی غلام خریدنے والا اپنے سودے کو قانوناً جائز سمجھنے لگا کیونکہ اس نے تو بہر حال رقم خرچ کی ہے۔ بیچنے والے کو وہ مال بیچنے کا حق تھا یا نہیں اس سے اسے کیا غرض؟ (اور سعودی عرب وغیرہ میں اب تک جواز کے اسی شرعی حیلے کی بناء پر دوسرے ملکوں سے اغوا کیے ہوئے بچے بکتے ہیں)۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے کوئی آدمی کہیں سے مالِ مسروقہ صرف رسید کے قانونی اطمینان پر خرید لے کیونکہ اس کا اصل مقصد ناجائز سودے سے پرہیز نہیں بلکہ صرف قانونی شکنجے سے بچنا ہوتا ہے۔ عباسی دور میں لونڈی غلاموں کے باقاعدہ بازار لگنے لگے۔ عیاش عمراء اور بدمعاش غلفاء کی مانگ پوری کرنے کے لیے "بیوپاری" ہر ناجائز طریقے سے بچے حاصل کرتے۔ اس کے لیے خصوصاً سرحدی ڈاکوؤں کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں تاکہ "دار الکفر" سے آئے ہوئے مال کی بناء پر اس پر آور بھی جواز کی مہر لگ سکے۔ ان بچوں اور بچیوں کی اونچی سوسائٹی کے آداب سکھا کر گراں قیمت پر فروخت کیا جاتا۔ آج کے پیرس ' لندن اور نیویارک طی طرح اس زمانے کے بغداد ' قاہرہ و قرطبہ سیاسی و ذہنی اعتبار سے ہی نہیں۔ عیاشی و فحاشی کے لحاظ سے بھی تمام مہذب دنیا کی قیادت کر رہے تھے۔

۱۰- صاف ظاہر ہے کہ یہ بعد کے دور کی پروردۂ شہوت غلامی کسی لحاظ سے بھی اسلامی احکام کے مطابق نہ تھی۔ بلکہ سراسر خلافِ منشائے اسلام تھی۔ لہٰذا اس پر اعتراض اسلام پر اعتراض نہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو آنحضورؐ کا اسیرانِ جنگ کو بعض صورتوں میں بطور غلام لونڈی کے فوجیوں میں تقسیم کرنے سے بھی اصل اصول تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسیرانِ جنگ کے بارے میں آخری فیصلے کا حق مسلمانوں کی حکومت کو ہی ہو گا۔ اس زمانے کے مخصوص حالات کے پیش نظر تقسیم ہی موزوں و مناسب طریق کار تھا۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اسیرانِ جنگ خصوصاً عورتوں کو کیمپوں میں رکھ کر بیشمار فوجی افسروں اور سپاہیوں کا نشانۂ ہوس بنانے کی نسبت (جیسا کہ آج کل ہوتا ہے) کسی عورت کا ایک آدمی سے وابستہ کر دینا زیادہ باعزّت طریقہ ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ اس عورت کی خبر لینے والا دنیا میں کوئی نہ رہا ہو۔ کیونکہ اس کی قوم اور

Marfat.com

حکومت کو زر فدیہ یا قیدیوں کے تبادلے میں اسے آزاد کرا لینے سے عام حالات میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔

۱۱- غلامی کوئی ایسا شعبہ یا ادارہ (Institution) نہیں ہے کہ اسلام نے اسے بہر قیمت معاشرے میں برقرار رکھنے کا حکم دیا ہو۔ اس کے برعکس قرآن اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت احکام کا مقصد بالآخر غلامی کو ختم کر دینا ہی معلوم ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ اس نصب العین کے حصول کی سعادت خود مسلمانوں کو حاصل نہ ہوئی۔ لیکن اب جب کہ مملوک غلاموں اور کنیزوں کا وجود دنیا کے اکثر ملکوں میں نہیں رہا تو اس کا احیاء کوئی دینی فریضہ نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے نادانی سے سمجھ لیا ہے - بلکہ مسلمان کا فریضہ تو عورت کے جسم کی فروخت کا کلیتہً سدباب کرنا ہے جو آج بھی تہذیب کے رنگین پردوں میں زور شور سے جاری ہے۔

۱۲- جس طرح "اسلام میں غلامی" پر اعتراضات کے رد میں غلامی کے وجود کی حمایت بلکہ اس پر اصرار کرنا افراط کا پہلو ہے۔ اسی طرح ان اعتراضات سے بچنے کے لیے قرآنی آیات کو ایسے معنی پہنانا جن کا ساتھ نہ تاریخ دے سکے نہ زبان، تفریط اور ذہنی مرعوبیت کا نتیجہ ہے مثلاً ما ملکت ایمانکم کے صیغہ ماضی سے یہ معنی پیدا کرنا کہ اس سے مراد صرف نزولِ آیت یا نزول قرآن کے وقت تک کے غلام ہیں - یہ ایسی مضحکہ خیز تاویل ہے کہ اگر اسے قرآن کے دوسرے صیغہ ماضی میں بیان کردہ احکام و اخبار (مثلاً آمنوا وعملوا الصّلحٰت) پر چسپاں کرنے لگیں تو کتنے ہی دائمی اصول قصۂ ماضی بن کر رہ جائیں ۔ اسی طرح " امّا منّا بعد و إما فدآء (۴۷ : ۴) سے یہ ثابت کرنا کہ اسلام ہر حال میں جنگی قیدیوں کو چھوڑ دینے اور صرف چھوڑ دینے کا حکم دیتا ہے (فدیہ ملے تو ورنہ مفت بھی)۔ یہ بات تاریخ کے علاوہ عقل کے بھی خلاف ہے اور ایسی تفسیر عالیشان کوٹھیوں میں بیٹھ کر ہی لکھی جا سکتی ہے۔ عملاً میدانِ جنگ میں موجود ہوں تو یوں فلسفہ نہ بگھاریں۔ سب قیدیوں کا معاملہ یکساں نہیں ہو سکتا اور بعض صورتوں میں روک لینا یا سزائے موت دینا بھی مناسب اور ضروری ہوتا ہے جیسا کہ

Marfat.com

سنّت رسولؐ سے بھی ثابت ہے۔

اصل بات صرف یہ ہے کہ غلامی سے متعلقِ جملہ اسلامی احکام بلکہ اصلاحات کا مجموعی مقصد بتدریج غلامی کو ختم کرنا تھا اور غلامی کو ظلم یا شہوت رانی کا ذریعہ بنانا اسلام کے مجموعی مزاج کے یکسر منافی ہے - اور ان دونوں پہلوؤں سے اسلام کو تمام مذاہب پر یقیناً فوقیت حاصل ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

اسلام کا قانونِ وصیّت

وصیت کا اسلامی قانونِ وراثت کے ساتھ نہایت اہم تعلق ہے بلکہ غور کیا جائے تو قانونِ وصیت دراصل قانون وراثت کے تکملہ اور تتمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آیات میراث میں (جیسا کہ آگے بھی آ رہا ہے) چار دفعہ "من بعد وصيّة ..." کی تکرار ہوئی ہے۔ اسلامی قانونِ وراثت کے نفاذ کی راہ میں پیدا ہونے والی بعض پیچیدگیوں کا حل ہی اسلامی قانونِ وصیّت میں ہے اس لیے یہاں وصیت سے متعلق کچھ مزید احکام بیان کرنے ضروری ہیں:

۱- ہر شخص پر اپنے مال اور جائداد کے بارے میں وصیت کر جانا ضروری ہے یہ محض سفارشی حکم نہیں بلکہ تاکید کے ساتھ بیان ہوا ہے سورہ البقرہ کی آیت ۱۸۰ میں وصیت کے بارے میں کتب علیکم (تم پر فرض کیا گیا ہے) اور حقاً علی المتقین (پرہیزگاروں پر لازم ہے) جیسے فیصلہ کن الفاظ اور انداز میں حکم دیا گیا ہے۔

۲- وصیت کا قاعدہ در اصل اس لیے مقرر کیا گیا ہے کہ قانونِ وراثت کی رو سے جن قریبی رشتہ داروں کو حصہ نہیں ملتا مثلاً یتیم پوتا ' غیر مسلم والدین ' ان میں سے جو امداد کے مستحق ہوں ان کے لئے آدمی اپنے اختیار تمیزی (Discretion) سے کام لے کر کچھ حصہ مخصوص کر دے۔ بلکہ رشتہ داروں کے علاوہ دوسرے مستحقین کے لیے یا رفاہ عام کے کاموں کے لئے بھی وصیت کی جا سکتی ہے۔

۳- چونکہ وصیت کے حق داروں اور وراثت کے حق داروں کا آپس میں اختلاف

Marfat.com

ہونا عین ممکن ہے۔ قانونِ وراثت بعض لوگوں کے حقوق متعین کر چکا ہے اور قانونِ وصیت صاحب مال کو بعض لوگوں کے حقوق متعین کرنے کا اختیار دیتا ہے۔ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ ضروری مگر بظاہر متصادم مقاصد ہیں اور ایک قانون کا سہارا لے کر دوسرے قانون کے مقاصد کو زک دی جا سکتی ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میراث اور وصیت کے احکام کی توضیح کے لئے دو اہم قاعدے بیان فرمائے ہیں:

(i) اول تو یہ کہ وصیت اور وراثت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ وصیت کے ذریعے کسی وارث کے شرعی حصے میں کمی بیشی نہیں کی جا سکتی۔ کسی وارث کو بذریعہ وصیت میراث سے محروم نہیں کیا جا سکتا اور کسی وارث کو اس کے اپنے حصے کے علاوہ کوئی خاص چیز ' دوسرے وارثوں کی اجازت کے بغیر ' بذریعہ وصیت نہیں دی جا سکتی۔

(ii) دوسرے یہ کہ وصیت ' کل جائداد کے زیادہ سے زیادہ ایک تہائی حصے کی حد تک کی جا سکتی ہے اس سے زیادہ میں وصیت نافذ نہیں ہو گی اور وارثوں پر اس کی پابندی ضروری نہیں۔ (۱)

۴۔ اگر ان پابندیوں کے باوجود کوئی آدمی ' قانون کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے ' یا کسی قانونی حیلے کی آڑ میں اور اپنے اختیار تمیزی کو غلط استعمال کر کے ' کسی جائز حق دار پر وصیت کے ذریعے ' ظلم کرے تو شریعت نے اس

۱۔ مسلمانوں نے وصیت سے کام لینا چھوڑ دیا تو اس سے کئی دشواریاں پیدا ہوئیں (مثلاً یتیم پوتے کا مسئلہ) - یہ تفریط تھی۔ اب جو بعض لوگوں نے وصیت میں ان برائیوں کا علاج دیکھا تو اسلام کے قانونِ وصیت کی تعریف میں اس افراط کو پہنچ گئے کہ سنت سے ثابت اس پابندی کو بھی غیر ضروری خیال کرنے لگے- یہ ورثاء کے حق میں ظلم کا دروازہ کھولنے کی کوشش ہے اور انسانی فطرت کی ان بوالعجبیوں سے کون واقف نہیں کہ ایک آدمی اپنے ان عزیزوں پر بھی ظلم کر گزرتا ہے جن کے لئے دوسرا جان تک دے دیتا ہے۔

Marfat.com

تک کے لئے گنجائش رکھی ہے کہ خاندان کے لوگ باہم رضامندی سے اس وصیت کی اصلاح کر لیں یا اسلامی عدالت سے رجوع کیا جائے تاکہ وہ وصیت کے قانونی سقم کو درست کر دے۔(دیکھئے سورہ البقر کی آیت ۸۲)۔

آبآؤکم وأبنآئکم لا تدرون أیّھم أقرب لکم نفعاً: —

ہم نہیں جان سکتے کہ تمہارے اصول (باپ دادا) میں سے یا فروع (اولاد اور اس کی اولاد) میں سے کون دنیا یا آخرت میں تمہارے لئے زیادہ نفع کا موجب ہو سکتا ہے اور اگر اس بنیاد پر سوچ کر خود وراثت کا قانون بنانے لگو تو یقیناً آراء میں اختلاف ہو گا۔

فریضة مّن الله ۔ إنّ الله کان علیماً حکیماً : —

اس لئے یہ مسئلہ (وراثت) تمہارے اجتہاد و رائے پر نہیں چھوڑا گیا بلکہ یہ سب ضابطے خود اس علیم و خبیر اور حاکم و حکیم مطلق نے مقرر کر دیئے ہیں۔ اس قانون میں کوئی ایسی کسر نہیں رہ گئی جسے پورا کرنے کے لئے اب کسی نام نہاد روشن خیال کی "خدماتِ فاسدہ" کی ضرورت ہو۔ آیت کے شروع میں یوصیکم الله اور آخر پر فریضة مّن الله کا آنا ان لوگوں کے لئے قابل غور ہے جو قرآن کو خدا کی کتاب بھی مانتے ہیں اور اس کے احکام میراث و وصیت سے بے پروا بھی ہیں۔

زوجین کی میراث

لکم نصف ما ترک ازواجکم ان لّم یکن لّھنّ ولد :

یہاں سے زوجین کی وراثت کے احکام ' شوہروں کو خطاب کی صورت میں ' بیان ہوتے ہیں۔ پہلا حکم یہ ہے کہ خاوند کو اس کی (ہر) بیوی کل ترکہ سے ۱/۲ حصّہ ملے گا بشرطیکہ اس بیوی کی کوئی اولاد نہ ہو ' نہ اس وارث خاوند سے جس کے نکاح میں

Marfat.com

وہ فوت ہوئی ہے ' اور نہ کسی پہلے خاوند سے۔

فإن كان لهنّ ولد فلكم الرّبع ممّا تركن :- اور اگر بیوی کی کوئی اولاد بھی وارث ہو۔ لڑکا یا لڑکی ' آخری شوہر (وارث) سے یا اس سے پہلے کسی شوہر سے - تو خاوند (وارث) کو اس بیوی (میت) کے کل ترکے سے ۱/۴ حصہ ملے گا - اور خاوند کو وراثت کا حصہ (۱/۲ ہو یا ۱/۴) اپنی ہر اس بیوی سے ملے گا۔ جو اس کے نکاح میں فوت ہو۔

من بعد وصية يوصين بها او دين :- وصیت کا حق عورت کو بھی حاصل ہے اور احکام وصیت کی پابندی اس کے لئے بھی ضروری ہے۔

نیز چونکہ اسے شریعت نے حقوق ملکیت دیے ہیں اس لیے وہ اپنے قرضوں کے لیے بھی ذمہ دار ہو گی - "یہاں بھی تقسیم میراث ' ادائے قرض اور تعمیلِ وصیّت کے بعد ہی ہو گی۔ یہ تو بنیادی اصول ہے۔

ولهن الرّبع ممّا تركتم إن لّم يكن لّكم ولد :- اور خاوند کے کل ترکے میں سے ۱/۴ حصہ اس کی بیوی یا بیویوں کو ملے گا۔ بشرطیکہ خاوند (میّت) کی کوئی اولاد نہ ہو۔ نہ حال ہی میں بیوہ ہونے والی بیوی یا بیویوں سے نہ کسی سابقہ بیوی سے۔ اگر بیویاں ایک سے زیادہ ہوں گی تو وہ اسی ۱/۴ میں بحصہّ برابر شریک ہوں گی۔

فإن كان لكم ولد فلهنّ الثمن ممّا تركتم :- اور اگر خاوند (میّت) کی کوئی اولاد موجود ہو چاہے کسی بیوی سے ہو تو (موجودہ) بیوہ یا بیوگان کو اپنے خاوند (میّت) کے کل ترکے کا ۱/۸ حصہّ مل سکے گا اور متعدد وارث بیویوں کی صورت میں وہ سب اسی ۱/۸ حصے میں بحصہ برابر شریک ہوں گی۔

عورت کو اپنے ہر مرنے والے خاوند سے وراثت ملے گی۔ (۱)

۱- شیعہ امامیہ کے نزدیک بیوی کو خاوند کی غیر منقولہ جائداد (زمین مکان وغیرہ) سے کچھ حصہ نہیں دیا جاتا۔ وہ اپنے آئمہ کی روایات سے " مما ترکتم (تمہارے کل ترکے میں سے) کے عموم کی تخصیص کرتے ہیں۔ نیز عورت کو زمین سے حصہ دینا باعثِ فساد خیال کرتے ہیں۔

Marfat.com

من بعد وصيّة توصون بها أو دين : -یہ بات تیسری دفعہ دہرائی جا رہی ہے کہ تقسیم میراث سے پہلے میّت کے قرض کی ادائیگی اور اس کی وصیت کا اجراء ضروری ہے۔

کلالہ کا مسئلہ

وإن كان رجل يّورث كللة أو امرأة : - اور اگر وہ مرد یا عورت جس کی میراث کی تقسیم درپیش ہے' کلالہ ہو یعنی بے اولاد بھی ہو اور اس کے والدین میں سے بھی کوئی زندہ نہ ہو۔ نہ اصل موجود ہو نہ فرع۔

وله اخ أو اخت فلكلّ واحد مّنهما السّدس : -
مگر اس (میّت مرد یا عورت) کا ایک بھائی یا بہن اخیافی (تشریح آگے آتی ہے) موجود ہوں تو اس بھائی اور بہن میں سے ہر ایک کو ترکے کا ۱/۶ حصّہ ملے گا۔

وإن كانوا أكثر من ذلك فهم شركاء فى الثلث : - اور اگر یہ اخیافی بھائی بہن اس تعداد سے (یعنی دو ' جو اوپر مذکور ہوئے ہیں) زیادہ ہوں تو یہ کل ترکے کی ایک تہائی میں بحصہ برابر شریک ہوں گے یعنی مذکر و مؤنث سب میں یکساں تقسیم ہو گا۔ کلالہ کی وراثت سے متعلق اس آیت کے سلسلے میں حسب ذیل امور قابل غور ہیں:

۱- اگر آیت میں لفظ أخ اور اخت عام ہے مگر سب مفسرین کا اس پر اتفاق ہے (اور یہ اتفاق بعض صحابہ سے منقول تفسیر بصورتِ قراء ت پر مبنی ہے) کہ یہاں أخ اور اخت سے اخیافی بھائی بہن یعنی أخ أو اخت لام مراد ہیں۔

۲- سگے بھائی بہنوں کو جو ایک ہی ماں باپ سے ہوں عربی میں عینی یا بنی اعیان کہتے ہیں۔ اور وہ سوتیلے بھائی بہن جو متحد الصلب اور مختلف البطن ہوں یعنی جن کا باپ ایک مگر مائیں مختلف ہوں - انہیں علاتی کہتے ہیں - اور ایسے سوتیلے بھائی بہن جو مختلف الصلب اور متحد البطن ہوں یعنی جن جن کی صرف ماں ایک ہو اور باپ مختلف ہوں (عورت کے متعدد نکاح کرنے کے نتیجے میں) - یہ اخیافی کہلاتے ہیں۔

Marfat.com

۳- اس بات کے ثبوت میں کہ یہاں اخیافی بھائی بہن مراد ہیں، صحابہ سے منقول تشریحی قراءت کے علاوہ مفسرین یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ اسی سورت کے آخر پر (آیت) ۱۷۶ میں بھی کلالہ کی وراثت کا حکم ہے وہ تقسیم اس (آیت والی) تقسیم سے بالکل مختلف ہے اور یہاں آیت (۱۲) کے بیان کردہ حصے بالکل ماں کے لئے مقررہ حصوں کے مطابق ہیں یعنی ۱/۶ یا ۱/۳ ماں بھی زیادہ سے زیادہ ۱/۳ لے سکتی ہے اور یہی حکم یہاں بھائی بہنوں کا ہے۔ اس لیے یہاں اخیافیوں کے بارے میں حکم ہے اور سورۃ کے آخر پر عینی و علاتی بھائی بہن کا حکم ہے۔ یہی معنی تمام مفسرین نے بیان کیے ہیں اور اس پر علمائے امت کا اجماع ہے۔

۴- یہ بات کہ ان اخیافی بھائی بہنوں کو وراثت "مرد کو عورت سے دگنا" کے اصول پر نہیں ملے گی۔ بلکہ سب مساوی حصہ لیں گے - یہ بات لفظ شرکاء سے معلوم ہوتی ہے یعنی وہ سب حصہ دار ہوں گے۔ نیز اس وضاحت سے کہ اگر صرف دو اخیافی بھائی بہن ہوں تو ہر ایک کو ۱/۶ ملے گا یعنی بھائی بہن کو برابر برابر۔ لہٰذا اگر زیادہ ہوں گے تو بھی برابر تقسیم کریں گے۔

۵- صحابہ میں کلالہ کا مسئلہ مشکل مشہور تھا اور اس کی وجہ غالباً ایک تو یہ تھی کہ اس آیت (۱۲) میں أخ اور اخت کا لفظ عام ہے جس سے ہر طرح کے بھائی بہن سمجھے جا سکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ کلالہ سے متعلق اس سورت کی دوسری آیت ۱۷۶ بہت بعد میں سفر حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے کلالہ کی سب صورتوں کی تفصیل صحابہ میں پھیلنے نہیں پائی تھی - نیز دونوں جگہ کلالہ کے مطلق بھائی بہنوں کا ذکر ہے عینی علاتی یا اخیافی کی تصریح نہیں اور دونوں آیتوں کا حکم آپس میں مختلف ہے، پس اس وجہ سے بھی کلالہ کا حکم سمجھنے میں الجھن پیدا ہوتی تھی۔ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اس مسئلہ کی تفصیل پر ایک رسالہ لکھا تھا۔ لیکن اپنی وفات سے پہلے اسے ضائع کر دیا اور لوگوں میں اس کو شائع نہیں کیا۔ غالباً اس لیے کہ اس وقت تک کلالہ کی میراث کی دونوں صورتوں کی تفصیلات اور یہ بات کہ

Marfat.com

آیت ۱۲ ' اخیافی بھائی بہنوں کے متعلق ہے اور آیت ۱۷۶ حقیقی یا علاتی بھائی بہنوں کے متعلق ہے ' عام پھیل چکی تھی اور اس بارے میں مزید کسی کتاب کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ کلالہ کے متعلق ان دونوں آیتوں کی اسی تفسیر پر تمام فقہی مذاہب متفق ہیں۔ (۱)

سورۃ النساء کی آخری آیات سے علاتی اور حقیقی بھائی بہنوں کی وراثت کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

اگر مرنے والا مرد ہے تو علاتی اور حقیقی بھائی بہنوں کی وراثت کا حکم

(۱) اگر اس کی وارث صرف ایک ہی بہن ہو تو ترکہ میں سے نصف (۱/۲) حصہ اس بہن کو لے گا--- باقی نصف ' رشتے کے دوسرے مستحق وارثوں (عصبات) میں تقسیم ہو گا۔

(۲) اگر ایک کی بجائے دو بہنیں وارث ہوں ---- تو انہیں کل ترکہ کا دو تہائی ۲/۳ ملے گا ---- باقی ۱/۳ دوسرے عصبات میں تقسیم ہو گا۔

(۳) اگر وارث متعدد بھائی بہن ملے جلے ہوں تو متوفی کا پورا ترکہ ان سب میں "مرد کو عورت سے دگنا" کے اصول پر تقسیم کر دیا جائے گا۔ اس صورت میں کسی دور کے وارث کو کچھ نہیں ملے گا۔

(ب) اگر مرنے والی عورت ہے تو:

(۱) اگر اس کا وارث صرف ایک ہی بھائی ہو تو متوفیہ کے پورے ترکے کا حقدار ہو گا۔

۱- ۱۹۲۳ء میں حافظ اسلم جیراجپوری نے عربی میں ایک چھوٹا سا رسالہ " الوراثۃ فی الاسلام " کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس میں انہوں نے آیت ۱۲ میں اخیافی بھائی بہن مراد لینے پر کچھ اعتراضات کئے تھے مگر اس کے بعد آیت کا جو مفہوم خود انہوں نے پیش کیا وہ نہایت غیر مستند اور ناقابل قبول ہے- ومن شاء فلیراجع۔

Marfat.com

(۲) اگر وارث بہت سے بھائی بہن ہوں تو ورثہ سب میں "مرد کو عورت سے دوگنا" کے اصول پر تقسیم ہو گا۔

کلالہ کے ورثہ کی یہ صورتیں تو اس آیت سے ظاہر ہیں۔ مزید تفصیلات کتب فرائض سے معلوم ہو سکتی ہیں۔

سورۃ النساء کی اس آخری آیت کے بارے میں کتب تفسیر و روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی سب سے آخر نازل ہونے والی آیت یہی ہے۔ اگرچہ روایات میں اختلاف بھی ہے بعض نے آیت الرباء (البقرہ: ۲۷۸) کو آخری آیت قرار دیا ہے۔ یہ بھی مشہور روایت ہے کہ قرآن کی آخری آیت آیت اکمال (المائدہ: ۳) ہے جس کے نازل ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۸۱ دن زندہ رہے۔ مگر بعض روایات میں اس آیت کلالہ (سورۃ النساء کی آخری آیت) کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ۹ دن پہلے نازل ہونے کا ذکر بھی ہے۔ بہرحال اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ آیت بلحاظ نزول قرآن کی آخری آیتوں میں سے ضرور ہے اور ممکن ہے آخری ہی ہو۔ اور صحابہؓ میں اس مسئلے کے مشکل مشہور ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی جیسا کہ ہم آیت ۱۲ کے تحت بیان کر چکے ہیں۔

من بعد وصيّة يّوصىٰ بها او دين غير مضار :—

۱۔ یہاں چوتھی دفعہ اس بات کی تصریح کر دی کہ تقسیم میراث بہرحال ادائے قرض اور اجرائے وصیت کے بعد ہو گی۔ اور چاروں جگہ وصیت کی تاکید سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ وصیت کنندہ صاحب اولاد ہو یا بے اولاد مرد ہو یا عورت' قریبی رشتہ دار اس کے وارث بن رہے ہوں یا دور کے' بہرحال وصیت نافذ ہو گی۔

۲۔ وصیت اور قرض کی اس اہمیت کے ساتھ ان کو ناجائز طریقے سے اور بدنیتی پر مبنی مقاصد کے لیے استعمال کرنے سے بھی منع کر دیا۔ اپنے اوپر خواہ مخواہ فرضی قرضوں کا اقرار کرنا' وصیت کرنے میں شرعی قیود کی پابندی نہ کرنا یا قانون کی ظاہری حدود کے اندر رہتے ہوئے ایسی چال چلنا جس کا اصل مقصد کسی حق دار کو میراث سے کلا یا

Marfat.com

جزءاً محروم کرنا ہو، یہ سب ضرار کی قسمیں ہیں جو گناہ کبیرہ ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بعض دفعہ آدمی عمر بھر نیک کام کرتا ہے مگر آخر عمر میں یا مرتے وقت وصیت (وغیرہ) کے ذریعے (اپنے وارثوں کے حق میں) ضرر رسانی کا مرتکب ہو کر دوزخی ہو جاتا ہے"۔ اسلام قدم قدم پر اپنے پیروؤں سے قانون کی پابندی (عمل) کے ساتھ ساتھ نیت و ارادہ میں اخلاص و صداقت کا تقاضا کرتا ہے۔

۳- اگرچہ وارثوں کی حق تلفی ہر حال میں گناہ ہے لیکن یہاں کلالہ کے سلسلے میں اس سے نہی غالباً اس مناسبت سے وارد ہوئی ہے کہ ایسے بے اولاد آدمی میں جس کے والدین بھی زندہ نہ ہوں، عموماً اپنی جائداد کو کسی نہ کسی طرح تلف کر جانے اور نسبتاً دور کے رشتہ داروں کو میراث سے محروم کرنے کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ وصیۃ من اللہ ۔ واللہ علیم حلیم :- پھر یاد دلا دیا کہ وصیت و میراث کا یہ قانون خود اللہ کا مقرر کردہ ہے۔ کسی انسانی دماغ کی اپج نہیں ہے۔ اس لیے یہ بالکل بے عیب، مکمل اور ناقابل ترمیم بھی ہے اور واجب الاطاعت بھی۔ اللہ اپنے بندوں کی مصلحتوں کو بھی خوب جانتا ہے اور اس کے قوانین میں ناروا سختی اور تنگی بھی نہیں کیونکہ وہ علیم بھی ہے اور حلیم بھی۔

تلك حدود الله .... عذاب مهين (آیت ۱۳-۱۴)۔

احکام میراث کے معاً بعد اللہ کے مقرر کردہ ضابطوں کی پابندی پر اجر و انعام کا وعدہ مگر خدائی احکام کی خلاف ورزی کرنے اور شرعی حدود و قیود کو توڑنے پر اس قدر سخت وعید اپنے اندر ایک دعوتِ فکر رکھتا ہے۔ مسلمانوں نے خدا کے جن قوانین کو بدلنے اور اس کی جن حدوں کو توڑنے کی جسارت کی ہے، ان میں قانون وراثت تقریباً سرفہرست ہے کہیں "رواج" کو شریعت پر ترجیح دے کر عورت کو میراث سے محروم کر دیا، اور کہیں جوش افراط میں عورتوں اور مردوں کا حصہ برابر کر دیا۔ یہ بڑے افسوس اور عبرت کا مقام ہے کیونکہ قرآن نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ مسلمانوں کی دنیوی و اخروی کامرانی کا راز اطاعتِ خدا اور رسولؐ میں ہے اور خدا کے قانون سے بغاوت،

Marfat.com

اس کے احکام سے سرتابی اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کا نتیجہ دونوں جہان میں ذلت و رسوائی ہے۔

اسلامی قانون وراثت کی امتیازی خصوصیات

قرآن کریم کے جو قوانین انسان کے معاشی و معاشرتی مسائل کا بہترین عملی حل تجویز کر کے اسلامی نظامِ حیات کو دیگر تمام نظامہائے حیات پر واضح فوقیت دیتے ہیں، ایسے قوانین میں اسلامی قانونِ وراثت تقریباً سرفہرست ہے۔ کیونکہ :

۱- اس قانون میں ہر قسم کے رشتہ داروں کے دعاویٔ قرابت و وراثت کو اپنے اپنے موقع و محل پر زیر نظر رکھا گیا ہے۔ اس طرح معاشرے کے افراد کو باہمی خیر خواہی و نفع رسانی کی بنا پر ایک مضبوط رشتے میں مربوط کرنا اس قانون کی اہمیت کا ایک اہم پہلو ہے۔

۲- یہ قانون دورانِ دولت (Circulation of Wealth) کے بہترین اصولوں پر مبنی ہے، یہ جائداد اور دولت کو کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہونے دیتا۔ اور اس طرح ایک نہایت معتدل و متوازن اقتصادی نظام قائم کرنے میں مدد دیتا ہے۔

۳- اقتصادی و معاشرتی اہمیت کے علاوہ یہ قانون اس لحاظ سے بھی اسلام کی صداقت کی دلیل ہے کہ کسی آسمانی یا انسانی قانون میں اس سے پہلے اس کی نظیر موجود نہیں ہے۔ مستشرقین اکثر بغیر سوچے سمجھے یہ کہہ دیتے ہیں کہ اسلام یہودیت یا عیسائیت کی نقل ہے۔ ان لوگوں کے اس دعویٰ کی لغویت، دوسرے دلائل سے قطع نظر، قرآن کے قانون وراثت سے ظاہر ہوتی ہے کیونکہ یہودیت، عیسائیت، عرب جاہلیت بلکہ کسی دوسرے مذہب میں بھی اس کی مثال اور نمونہ نہیں پایا جاتا۔

۴- اس قانون میں حصوں کی تقسیم اس طرح سادہ اور سہل رکھی گئی ہے کہ ناخواندہ اور غیر متمدن سوسائٹی میں بھی اس کا نفاذ ناممکن نہیں ہے یعنی ۱/۸، ۱/۴، ۱/۲، ۱/۶، ۱/۳، ۲/۳ اس کے ساتھ ہی اس میں متوقع حسابی پیچیدگیوں کی بنا پر ایک

Marfat.com

مخصوص فن بننے کے تمام امکانات بھی موجود ہیں (اور حقیقتاً ایسا ہوا)۔

اسلامی قانون وراثت کے اہم بنیادی اصول (خلاصہ)

علم الفرائض (اسلامی قانون وراثت) ایک نہایت اہم علم اور مستقل مضمون ہے جس کی تفصیلات کے لیے مستقل تصانیف موجود ہیں۔ وراثت کے بنیادی قرآنی اصولوں کی ضروری وضاحت پچھلے صفحات میں کر دی گئی ہے - یہاں تعلیمی اور امتحانی نقطہ نظر سے ان اصولوں کا خلاصہ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ تمام اصول بالکل ظاہر آیات سے سمجھے جا سکتے ہیں۔ اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ بالاتفاق یہی وہ اصول ہیں جن پر ہر مذہب فکر نے اپنی فقہ فرائض (قانون وراثت) کی عمارت کھڑی کی ہے۔ اگرچہ ان قواعد کو بنیادی طور پر مان لینے کے باوجود ان کے عملی اطلاق اور تعبیر و توضیح میں اختلاف کی بنا پر مسائل میں بھی اختلاف ضرور پیدا ہو گیا ہے۔

یہ بنیادی اصول حسبِ ذیل ہیں:

۱- وراثت کے حق دار صرف مرد ہی نہیں عورتیں بھی ہوں گی۔

۲- سبب میراث دو ہوں گے۔

الف- اولاد ہونا یعنی میت اپنے وارث کا باپ ہو یا ماں - والوالدان

ب- اقرب ہونا یعنی میت وارث کا زیادہ قریبی رشتہ دار ہو - والاقربون والدین - زوجین اور بھائی بہن سب اسی دوسری قسم میں آ جاتے ہیں۔

۳- وراثت کا قانون ہر قسم کے املاک پر جاری ہو گا۔(۱)

۴- مرد کا حصہ عورت سے دگنا ہو گا۔ جب کہ قرابت مساوی درجے کی ہو مثلاً بیٹی بیٹا - ماں باپ۔ خاوند بیوی اور بھائی بہن۔

۵- بعض وارثوں کو ہر حالت میں ترکہ کا صرف ایک "متعین حصہ" ملتا ہے - مثلاً ماں - بیوی یا خاوند اور بعض وارثوں کو کبھی تو ترکہ کا ایک مقررہ حصہ دیا جاتا ہے اور

۱- شیعہ بیوہ کو زمین سے حصہ نہیں دیتے۔ دیکھئے حاشیہ ۸۲

Marfat.com

کبھی وہ "باقی" کے مالک بن جاتے ہیں یا باقی میں دوسروں کے ساتھ شریک ہو کر (مرد و عورت سے دگنا کے اصول پر) حصہ پاتے ہیں۔ مثلاً باپ ' بیٹا اور بیٹی پہلی قسم یعنی متعین حصہ پانے والوں کو فقہ فرائض کی اصطلاح میں "ذوی الفروض" کہتے ہیں۔ اور دوسری قسم یعنی "باقی" یا باقی میں شامل ہو کر حصہ پانے والوں کی اصطلاح میں "عصبات" کہتے ہیں۔

۶- بعض دفعہ ایک نسبتاً زیادہ قریبی وارث کی موجودگی کا دوسرے نسبتاً دور کے رشتہ دار وارث ' کے حصے پر اثر پڑتا ہے (مثلاً والدین کے ہوتے ہوئے بھائی بہنوں کو کچھ نہیں ملتا یا اولاد کی وجہ سے خاوند اور بیوی کا حصہ کم ہو جاتا ہے) اسے اصطلاح میں "حجاب" کہتے ہیں۔(۱)

۷- ماں۔ باپ۔ خاوند اور بیوی کو ہر حال میں جائداد سے حصہ ملے گا چاہے میت کی اولاد ہو یا نہ ہو۔

۸- ہر قسم کی وراثتیں وصیت اور قرض کے پورا کرنے کے بعد تقسیم کرنے کا حکم جاری ہو گا۔

۹- کل متعین حصے چھ ہیں ۱/۸' ۱/۴' ۱/۲' ۱/۶' ۱/۳' ۲/۳۔

۱۰- ہر متعین حصہ کے حق داروں کی ابتدائی فہرست یہ ہے۔

الف- ۱/۸ کی حق دار بیوی ہے (جب کہ میت صاحبِ اولاد ہو)۔

ب- ۱/۴ کے حق دار دو ہیں۔

۱- شوہر (جب میت صاحب اولاد ہو)

۲- بیوی (جب میت بے اولاد ہو)۔

۱- "محجوب الارث" پوتے کے مسئلے کی بنیاد یہی ہے اس موضوع پر تفصیلی بحث مصنف کی دوسری کتاب "یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ" میں کی گئی ہے۔ ومن شاء فلیرجع۔

Marfat.com

ج- ۱/۲ کے حق دار تین ہوں گے۔

۱- بیٹی (جب ایک ہی ہو۔

۲- شوہر (جب میت بے اولاد ہو)۔

۳- بہن (جب ایک ہی ہو اور میت کلالہ ہو۔

نوٹ: اس تیسری قسم کا ذکر سورہ کی آخری آیت میں ہے۔

د- ۱/۶ کے حق دار بھی تین ہیں :-

۱- باپ (جب کہ میت صاحب اولاد ہو)۔

۲- ماں (جب کہ میت صاحب اولاد ہو یا اس کے بھائی بہن موجود ہوں)۔

۳- اخیافی بہن یا بھائی (جب کہ میت کلالہ ہو)۔

ہ- ۱/۳ کے حق دار دو ہیں۔

۱- ماں (جب کہ میت بے اولاد ہو اور اس کے بھائی بہن بھی نہ ہوں)۔

۲- اخیافی بھائی بہن (جب کہ ان کی تعداد دو سے زائد ہو اور میّت کلالہ ہو)۔

و- ۲/۳ کے حق دار دو ہیں۔

۱- دو یا دو سے زائد بیٹیاں (جب کہ اولاد میں سے صرف وہی وارث ہوں)۔

۲- دو بہنیں (جب کہ اور کوئی بھائی بہن نہ ہو اور میّت کلالہ ہو)۔

☆☆☆

Marfat.com

مرد کی قوامیت

یہاں موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر، پہلے کچھ تمہیدی کلمات ضروری معلوم ہوتے ہیں:

۱- انسان کی اجتماعی زندگی میں کنبہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ کوئی بھی اجتماعی نظام حیات اپنے افراد کی عائلی زندگی کو اپنے مجموعی نظریاتی مزاج سے ہم آہنگ کیے بغیر چل نہیں سکتا - اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نظامِ اجتماعی کے (کلّی) اصول زندگی کی حقیقتوں اور فطرتِ انسانی کی مصلحتوں پر مبنی ہونے چاہئیں، قطع نظر اس بات کے کہ خود ان حقیقتوں اور مصلحتوں کا تعین کرنے میں محض عقل انسانی پر بھروسہ کیا جائے یا وحیٔ الٰہی پر - مگر یہ عجیب بات ہے، اور مرد و عورت کے تعلق کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے، کہ عائلی زندگی کے متعلق دستوری یا قانونی انداز میں سوچتے وقت بھی حقائق سے زیادہ جذبات غالب آ جاتے ہیں۔

۲- سورۃ النساء کی ان دو آیتوں (۳۴ و ۳۵) میں بھی عائلی زندگی کے متعلق نہایت اہم احکام بیان ہوئے ہیں - خصوصاً اس "ہیجان انگیز" سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ عائلی زندگی میں بالادستی مرد کو حاصل ہونی چاہیے یا عورت کو ؟ اور کیوں؟ - لہٰذا ان آیات کو سمجھتے وقت ایک مسلمان مرد یا عورت کو جنسی تعصب کے جذبات سے خالی ہو کر ان تکوینی حقیقتوں - تشریعی حکمتوں اور انسانی مصلحتوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے جن پر یہ احکام مبنی ہیں اور جن کی طرف خود وحی الٰہی نے رہنمائی بھی فرما دی ہے۔

۳- آیت ۳۴ کے شانِ نزول میں جو واقعہ مروی ہے۔ اس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی اسی اصول کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ عائلی قوانین کے بارے میں

Marfat.com

جذبات سے مغلوب عقل کی بجائے علم الٰہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

واقعہ کچھ یوں کیا گیا ہے کہ ایک صحابی سعید بن الربیع انصاری نے کسی بات پر ناراض ہو کر اپنی بیوی کو ایسا طمانچہ مارا کہ عورت کے منہ پر نشان پڑ گیا - زیادتی خدا جانے کس کی تھی - لیکن یہ بی بی اپنے باپ (محمد بن مسلمہ انصاری) کو ہمراہ لے کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئی اور اپنی شکایت پیش کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اسی طرح تھپڑ مار کر بدلہ لینے کی اجازت دی۔ یہ باپ بیٹی وہاں سے نکل کر ابھی گھر بھی نہیں پہنچے تھے کہ حضورؐ نے آدمی بھیج کر راستے سے ہی واپس بلا لیا۔ انہیں یہ آیت پڑھ کر سنائی اور فرمایا ابھی جبرئیلؑ یہ آیت لے کر آئے ہیں۔ پھر بدلہ لینے سے منع فرماتے ہوئے فرمایا: ولقد اردنا امرا واراداللہ أمرا۔ والّذی اراد اللہ خیر"۔ (یعنی ہم نے کچھ اور چاہا مگر اللہ کو کچھ اور منظور ہوا۔ مگر جو اللہ کو منظور ہوا ہے بہتری اسی میں ہے)۔

اب ان آیات کے ایک ایک جملہ کو لیجیے :-

الرّجال قوّامون علی النّساء .... النساء / ۳۴-۳۵:- قوام کا ترجمہ عموماً حاکم کیا جاتا ہے اور گو اصل عربی لفظ کی سی وسعت و بلاغت اس میں نہیں تا ہم یہ بالکل درست ترجمہ ہے۔ مگر بد قسمتی سے ہمارے یہاں حاکم کے معنی ہی یہ سمجھے جاتے ہیں۔ "جسے کسی کو خواہ مخواہ تنگ کرنے کا اختیار ہو"۔ حالانکہ لفظ "حاکم" کے درست مفہوم میں اختیارات کے ساتھ ذمہ داریوں کا تصور بھی شامل ہے اور یہی معنی قوام کے ہیں۔ قوام اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کے معاملات کو درست طریقے پر چلانے ' اس کو تکلیف اور نقصان سے بچانے اور اس کی جملہ ضروریات بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔-اور وہ اس ذمہ داری کا اہل بھی ہو۔ ان معنوں میں مرد عائلی زندگی میں عورت کا قوام یعنی حاکم ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے اسی لیے قوام کا ترجمہ "تدبیر کار کنندہ" کیا ہے - حفاظت۔ نگرانی اور تدبیر کار کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اختیارات حاصل ہونا ضروری ہیں اور ان اختیارات میں حقِ اطاعت سب سے مقدم ہے۔

Marfat.com

۲- عورت پر مرد کی یہ حاکمیت ہر قابل ذکر تمدن میں تسلیم کی گئی ہے - کم و بیش تمام مذاہب بھی اسی پر متفق ہیں۔ افراط اور تفریط سے قطع نظر اقوام و مذاہب کی ساری تاریخ اس اصول کو تسلیم کرتی نظر آتی ہے کہ عورت کو مرد کی اس حاکمیت کی ضرورت ہے۔

نے پردہ نہ تہذیب نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا محافظ ہے فقط مرد

۳- مرد کی "قوامیّت" کا یہ حق عورت کے جائز قانونی حقوق اور شرعی واجبات پر کسی طرح اثرانداز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مرد کے یہ حاکمانہ اختیارات خود "معروف" کی شرعی قید سے مقید اور ازدواجی زندگی کی حد تک محدود ہیں۔ اس کی بہترین تفسیر خود قرآن نے ہی سورۃ البقرہ کی اس آیت میں نہایت بلیغ انداز میں کر دی ہے۔ ولھن مثل الّذی علیھن بالمعروف وللرّجال علیھن درجة (عورتوں کے لیے معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے ان پر حقوق ہیں البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے)۔ جو اقتصادی اور مدنی حقوق عورت کو اسلام نے دیئے ہیں اور کسی دوسرے مذہب یا قانون نے اتنے حق عورت کو نہیں دیئے - مرد ان میں سے کوئی حق عورت سے نہیں چھین سکتا۔

۴- تمدنی زندگی میں کنبہ سب سے پہلا اجتماعی یونٹ ہے جس میں کم از کم ایک مرد اور ایک عورت شامل ہوتے ہیں۔ ضروری ہے کہ یہ طے کر لیا جائے کہ متنازعہ فیہ امور میں اس یونٹ کے کس فرد کو حکم نافذ کرنے کا اختیار ہو گا۔ یہ کہنا کہ "دونوں اتفاق رائے سے کام کریں" لایعنی ہے۔ اتفاق رائے سے روکا کب گیا ہے؟ سوال تو یہی ہے کہ جب اتفاق رائے نہ ہو سکے تو کیا کیا جائے؟ یہاں ضروری ہے کہ ایک کی رائے کو مقدم کیا جائے اور قرآن نے یہی حق مرد کو دیا ہے ۔ جس جس مسئلے میں شرعی قانون مرد و عورت دونوں کے لیے موجود ہے اس میں تو کسی کو بھی اپنی رائے نافذ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ وما کان لمؤمن وّلا مؤمنة اذا قضی اللہ ورسولہ امراً

Marfat.com

ان یکون لھم الخیرۃ من أمرھم (کسی مومن مرد یا عورت کو حق نہیں کہ کسی معاملے میں اللہ اور اس کے رسول کے فیصلے کی موجودگی میں اپنا اختیار استعمال کرنے لگیں)۔ رہی یہ بات کہ یہ حق مرد کو کیوں دیا گیا ہے تو قرآن پاک اس کو دو وجہیں بیان کرتا ہے :-

۱- بما فضّل اللہ بعضھم علیٰ بعض :- اول تو وہ طبعی ووہبی برتری جو مرد کو عورت پر اللہ نے عطا فرمائی ہے۔ اس سے پہلے آیت ۳۲ میں یہ مضمون بیان ہو چکا ہے کہ روحانیت کی دنیا میں یعنی قربِ حق اور حسنِ عمل کے لحاظ سے تو مرد و عورت کی حیثیت اللہ کے سامنے مساوی ہے- البتہ بعض طبعی امور میں تفاوت ہے۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ تفاوت اللہ کے ہاں اعمال کی مقبولیت پر تو اثر انداز نہیں ہوتا۔ مگر دنیوی معاملات اور انتظامی امور میں ضرور ایک کو دوسرے پر غلبہ اور تفوق دیتا ہے اور ہر ایک کا دائرہ عمل متعین کر دیتا ہے۔ مرد و عورت میں یہ "فطرتی فرق" اور مرد کا یہ "قدرتی تفوق" محض سطحی اور صوری قسم کا بھی نہیں ہے کہ مثلاً چونکہ مرد کی مونچھیں ہوتی ہیں اور عورت کی نہیں اور اختیارات کے لیے موزوں مونچھوں والا ہی ہوتا ہے ۔ لہٰذا مرد حاکم ٹھہرے۔ ہر گز نہیں۔ قرآن کا نظریۂ تفضیل مرد" محض اٹکل پچو اور فرضی بات نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت کا اظہار ہے جس کی صداقت پر حیاتیات (Biology) نفسیات (Psychology) اور عمرانیات (Sociology) کے جدید ترین انکشافات گواہ ہیں۔ مرد کی جسمانی قوت اور عورت کی نزاکت ' مرد کی شجاعت و جرات اور عورت رقتِ قلب و شفقت - مرد کا فکر و ادراک اور عورت کی جذباتیت ' مرد میں حفاظت کی قدرت اور عورت کو حفاظت کی ضرورت ' مرد میں مستقل صلاحیت کارکردگی اور عورت میں حمل و رضاعت کی مجبوریاں ' یہ تو اس فرق کی صرف چند عامیانہ سی مثالیں ہیں۔ مستثنیات کا ہر جگہ امکان ہے ' مگر بات جہاں اصولِ عام کی ہو تو مجموعی صورت حال اور کلی حیثیت کا لحاظ رکھا جائے گا ' نہ کہ کسی منفرد کیفیت کا - اس طرح قرآن کریم عورت کو اس کا ٹھیک فطری و طبعی مقام دیتا ہے جس میں نہ تو جاہلانہ تحقیر

Marfat.com

و تذلیل کا کوئی پہلو ہے اور نہ فاسقانہ زن پرستی کی کوئی گنجائش ۔ عورت کا مقصد تخلیق لیڈر جننا ہے نہ کہ لیڈر بننا ۔ جتنی عزت دنیا میں لیڈر جننے والیوں کی ہوتی ہے اتنی لیڈر بننے والیوں کو کہاں نصیب ہے؟

(ii) وبما انفقوا من اموالهم :- مرد کو عورت پر فوقیت کی دوسری وجہ اقتصادی و معاشرتی ہے یعنی ازدواجی زندگی میں مرد پر عورت کا نان و نفقہ واجب ہے اور وہ اس کے اخراجات کا کفیل ہوتا ہے۔ اور زیرِ کفالت کو اپنے کفیل کے احکام کے تابع ہونا چاہیے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسلام میں عورت کو مستقل حقوق ملکیت حاصل ہیں۔ اور ان حقوق کے نتیجے میں چاہے وہ کتنی ہی امیر کیوں نہ ہو ' ازدواجی زندگی کی مالی ذمہ داریوں کے بارے میں اس پر قطعاً کوئی قانونی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ صرف یہی نہیں بلکہ خاوند اپنی بیوی کی اجازت کے بغیر اس کے ذاتی مالی امور میں دخل دینے کا حقدار نہیں ہے - اس طرح مسلمان عورت بیک وقت دوہرے اقتصادی و مدنی حقوق سے متمتع ہوتی ہے۔ ہر قانونی حق (Right) کے مقابلے پر ایک قانونی واجب(Duty) بھی ہوتا ہے۔ عورت کو خاوند پر نفقہ وغیرہ کا جو حق حاصل ہے اس کے مقابل اس پر خاوند کا حقِ اطاعت واجب ہے۔

آیت سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اسلامی نظام میں روزی کمانا اور بیوی بچّوں کے خرچ کا بوجھ اٹھانا مرد کے ذمّے ہے ۔ بنیادی طور پر اسلام نے عورت کو غم روزگار کی تلخیوں اوز نسوانیت کش معاشی مشقتوں(Economic Drudgery) سے الگ ہی رکھا ہے اور اس کے مادرانہ فرائض اور پرورش و تربیت کی ذمہ داریوں کا تقاضا بھی یہی ہے ۔ کیونکہ عائلی زندگی کی گھریلو ذمہ داریوں سے باحسن وجوہ عہدہ برآ ہونے کے لیے محض جزوقتی توجہ کافی (Part-time job) نہیں ہے۔ اس کے لیے تو ہمہ وقتی جاں فشانی کی ضرورت ہے۔

فالصّٰلحٰت قٰنتٰت حٰفظٰت لّلغیب بما حفظ الله :--

پس اس اصول کی بناء پر کہ ازدواجی زندگی میں سربراہ مرد ہو گا ' اسلامی

Marfat.com

معاشرے میں عورت کی صلاحیتوں کو جاہلی مقاصد کی جستجو میں غارت ہو جانے کی بجائے نیکی اور پارسائی اور ایمان و عمل صالح کی صورت میں بروئے کار آنا چاہیے۔ اس نقطہ نظر سے نیک بخت بیبیاں اور مثالی خواتین وہ سمجھی جائیں گی جن میں کم از کم یہ دو صفات ہوں۔

(۱) ایک تو یہ کہ وہ قانتات یعنی فرماں بردار ہوں قنوت کے معنی ہیں ادب اور اطاعت اور اس سے مراد خاوند اور خدا دونوں کی فرماں برداری ہے۔ قرآن مجید میں نماز کے متعلق حکم میں ہے۔ وقوموا لله قٰنتين (اور اللہ کے آگے ادب سے کھڑے رہو) اسی طرح مریم علیہا السلام کے متعلق ہے وكانت من القٰنتين (وہ اللہ کے فرمان برداروں میں سے تھیں) اس طرح لفظ قانت سے یہ بات خود بخود معلوم ہو گئی کہ عورت پر اپنے شوہر کی (اطاعت خدا کی اطاعت کے تابع ہے۔ گناہ اور معصیت کے کام میں خاوند کی اطاعت ضروری نہیں ہے۔ بلکہ ایسی اطاعت خود گناہ ہے - خدا کی فرماں برداری میں شوہر کی فرمانبرداری بھی شامل ہے مگر شوہر کی فرمانبرداری میں خدا کی نافرمانی شامل نہیں ہے - قانت کے لفظ میں یہ بات بھی آ جاتی ہے کہ عورت اپنے خاوند کی مزاج شناس بنے اور اس بات کی کوشش کرے کہ وہ مرد کے لیے ذہنی و نفسیاتی سکون کا باعث ہو اسے چاہیے کہ وہ ازدواجی زندگی اور اس کے گرد گھومنے والے تمام مسائل میں مرد کے ساتھ ہمدردانہ تعاون کر کے اس کی الجھنوں میں کمی اور اس کی مسرتوں میں اضافہ کرے۔

(۲) نیک بیویوں میں دوسری خوبی یہ ہونی چاہیے کہ وہ حٰفظٰت للغيب بما حفظ الله کی مصداق ہوں یعنی وہ خاوند کی غیر موجودگی میں بھی اس کے حقوق کی حفاظت کریں۔ انہیں معلوم ہو کہ اللہ نے کن چیزوں کی حفاظت کا حکم دیا ہے۔ وہ اس بات پر شکر گزار ہوں کہ اللہ نے ان کو گھر کی محفوظ زندگی کا موقع دیا ہے وہ گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں اور وہ اللہ کی توفیق سے اپنی عصمت ' خاوند کے راز امانت ' اس کے مال و جائداد اور اس کی عزت و ناموس کی نگہداشت ' اس کی پیٹھ پیچھے بھی کرتی ہیں -

Marfat.com

الغرض وہ نہایت ذمہ دار اور ذمہ داری کے اعتماد کی اہل ثابت ہوں "بہترین بیوی" کے اوصاف کے بارے میں یہ حدیث نبوی اس آیت کی بہترین تفسیر ہے:- "خیر النساء ان نظرت الیھا سرّتك وان امرتھا اطاعتك وان غبت عنھا حفظتك فی مالھا ونفسھا (بہترین بیوی وہ ہے کہ جب تم اسے دیکھو تو تمہارا جی خوش ہو جائے۔ جب تم اسے کوئی بات کہو تو وہ فوراً مانے اور جب تم گھر میں نہ ہو تو وہ تمہارے پیچھے اپنے مال اور اپنے جسم کی حفاظت کرے)۔

لمحۂ فکریہ :- ہماری یونیورسٹیاں اور کالج جو اعلیٰ تعلیم یافتہ فرنگیت مآب مائیں تیار کر رہے ہیں ' ان کو قرآن کے اس "نظریۂ صالحات" سے کتنی مناسبت ہے؟(فاین تذھبون؟ سوچو رخ کدھر ہے؟)

والّتی تخافون نشوزھن :- (مگر جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم ان کی سرکشی سے اندیشہ مند ہو۔ نیکی اور شائستگی سے عاری بلکہ نہایت بدمزاج اور بدخصلت عورتوں سے کوئی سوسائٹی کبھی یکسر پاک نہیں ہو سکتی۔ اور ایسی عورتیں ہمیشہ عائلی زندگی میں ایک "مسئلہ دشوار" ثابت ہوتی ہیں۔ قرآن کریم کے کامل اور ہمہ گیر قانون ہونے کا یہ تقاضا تھا کہ وہ اس "عالمگیر" مسئلے پر خاموش نہ رہتا۔ چنانچہ اب اس آیت میں عورتوں کی اسی "چوتھی قسم" کا تذکرہ ہے کہ جن کی سرکشی تمہارے لیے ایک خوفناک مسئلہ بن جائے۔خائف ہونا (تخافون) سے مراد محض بدگمانی یا دور کا احتمال نہیں کیونکہ ظن و وہم تو خود ہی قرآن میں ممنوع ہیں ان پر کسی شرعی حکم کی بنیاد کیوں رکھی جا سکتی ہے؟ - عورت کا اپنے جائز شرعی حقوق پر اصرار کرنا بھی نشوز میں داخل نہیں ہے ۔ بلکہ نشوز (سرکشی) سے مراد یہ ہے کہ عورت شوہر کی نافرمانی پر کمر ہی باندھ لے - خاوند کو ناجائز طریقوں سے ستانے لگے۔ محبت و تعاون کی بجائے بغض و مخالفت اور پر مسرّت و پر سکون ازدواجی زندگی کی بجائے ایک تصادم اور بغاوت کی صورت پیدا ہو جائے۔ اور اس ساری صورت حال کی ذمہ دار عورت ہی ہو تو کیا کیا جائے؟ (نشوز مرد کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے اور اس کا ذکر اسی سورہ کی آیت ۱۲۸ میں آ رہا ہے)۔

Marfat.com

فعظوھنّ :- ایسی سرکش و نافرمان بیویوں کا پہلا نفسیاتی علاج یہ ہے کہ انہیں نرمی اور سلیقے سے سمجھاؤ۔ اس میں مرد کے لیے بھی نصیحت ہے کہ غصہ میں آکر فوراً کوئی سخت کاروائی نہ کر گزرے۔ فوراً بدخوئی پر اتر آنا جتنا عورت کے لیے مذموم ہے اتنا ہی مرد کے لیے بھی۔ خیال رہے یہاں لفظ "وعظ" ہے۔ جس کے معنی ڈرانا دھمکانا یا زبانی وارننگ دے دینا نہیں بلکہ ازراہ خیر خواہی سمجھانا اور راہِ راست پر لانے کی مخلصانہ کوشش کرنا اس کے مفہوم میں شامل ہے۔

واھجروھنّ فی المضاجع:- اگر وعظ و نصیحت کا کچھ اثر نہ ہو تو اس نفسیاتی علاج کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ ایسی عورتوں سے روٹھ جاؤ' اور اس روٹھنے کا اظہار کرو کہ ان سے بولنا ترک کر دو اور ان سے تعلقاتِ ہمبستری منقطع کر لو۔ خیال رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے موقع پر مرد کو گھر چھوڑنے سے منع فرمایا ہے۔ ضروری ہے کہ وہ اسی گھر میں رہتے ہوئے یہ تادیبی بائیکاٹ کرے۔ "وصال میں ہجر" کی اس "سزا" میں جو نفسیاتی و معاشرتی حکمتیں ہیں ان کو اصحاب بصیرت بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ اگر عورت محض تریاہٹ کی بناء پر شوخی کا مظاہرہ کر رہی ہو گی اور اس کی اصل نیت میں خرابی نہیں ہو گی تو مرد کا یہ اقدام اس پر یقیناً بہت شاق گزرے گا۔ اس لحاظ سے ترکِ تعلقات کی یہ تدبیر ایک علاج بھی ہے اور عورت کا "درجہ فساد" معلوم کرنے کا ایک پیمانہ یا اس کی "ہوائے نفس" کا رخ متعین کرنے کا بیرومیٹر بھی۔

واضربوھنّ :- اب اگر یہ "بستری مشاہدہ" (ا) (Clinical Observation) بھی "مرض" کے لا علاج ہونے کا پتہ دے یعنی عورت اپنے خاوند کے ترکِ تعلقات کر لینے اور روٹھ جانے پر بھی ٹس سے مس نہ ہو تو آخری چارۂ کار کے طور پر ایسی عورتوں

ا- کسی مرض کے حالات و علامات کتاب میں پڑھنے کی بجائے خود مریض کے بستر پر کھڑے ہو کر مشاہدہ کرنے کے لیے طبی اصطلاح ہے۔ اس کی اصل لاطینی لفظ (Clinicus) - معنی "بستر" ہے۔ وفیہ مافیہ۔

Marfat.com

پر جسمانی سزا کا "نسخہ" بھی استعمال کر کے دیکھ لیا جائے کیونکہ بعض انسانی طبائع پر ڈنڈے کے "شفابخش" اثرات فوراً ظاہر ہوتے ہیں۔

عورت کو مارپیٹ کی اس اجازت میں بعض غیر مسلم مغربی مفکرین کو (جو ہمیشہ سے اونٹ کو نگلنے اور مچھر کو چھاننے کے عادی ہیں) اسلام کے "وحشیانہ مذہب" ہونے کے دلائل میں سے ایک "زبردست" دلیل نظر آئی، جس پر اپنے کچھ "روشن خیال" بھی جھیپنے لگے ہیں - اس لیے یہاں اس مسئلہ کی ذرا وضاحت کر دینا ضروری ہے۔

۱- مارنے کی یہ اجازت صرف اس عورت کے لیے دی گئی ہے جس میں اچھی اور نیک بیوی کی لازمی صفات، مثلاً خاوند کی فرماں برداری اور اس کی غیبت میں اس کے حقوق، مال، ناموس کی حفاظت نہ پائی جائیں۔ بلکہ جو غلط راستے پر پڑ کر احساس ذمہ داری سے اتنی عاری ہو چکی ہو کہ خاوند سے رغبت و دلبری کا اظہار اور چاہت و گرمجوشی کا سلوک تو درکنار، وہ رشتہ ازدواج کے کم از کم قانونی اور معاشرتی تقاضوں کا بھی لحاظ نہ کرے۔

۲- اصلاح حال کی ان تینوں تدبیروں (سمجھانا، روٹھنا اور پیٹنا) کا استعمال لازمی اور ضروری نہیں بلکہ اس کی صرف مشروط اجازت ہے۔ پھر ان تینوں تدبیروں کو بیک وقت نہیں بلکہ درجہ بدرجہ اختیار کرنا چاہیے۔ جہاں پہلی کارگر ہو وہاں دوسری کی ضرورت نہیں۔ تیسری تدبیر (پٹائی) تو آخری چارۂ کار کے طور پر بیان ہوئی ہے۔

۳- مارپیٹ کی یہ بدرجہ مجبوری اجازت بھی بطور ایذاء و انتقام نہیں بلکہ بغرض اصلاح حال دی گئی ہے۔ اسی لیے آیت میں اول تو نصیحت اور کنارہ کشی کو سزا پر مقدم کیا گیا ہے اور پھر سزا کی اجازت کے فوراً بعد (جیسا کہ آگے آرہا ہے) یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر سزا سے مطلوبہ نتائج (اطاعت زوج) حاصل ہو جائیں تو آئندہ سزا کا استعمال، بلکہ بیوی کو ستانے کے لیے بہانوں کی تلاش بھی مت کرو۔ اگلی آیت ۳۵ میں اس بات کا صاف قرینہ موجود ہے کہ اگر مار پیٹ بھی بے سود ثابت ہو تو اس تدبیر کو بار بار دہرانے کی ضرورت نہیں بلکہ اب اس جھگڑے کو دوسرے طریقے (ثالثی) پر حل کرنے

Marfat.com

کی کوشش کرو۔

۴- چونکہ اس سزا کا مقصد انتقام نہیں بلکہ اصلاح ہے اس لیے سزا کے اس "حق" کو بھی اندھا دھند استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں عورتوں کے بارے میں نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ عورتوں کو ایسی چیز سے نہ مارا جائے جس سے جسم پر زخم پڑ جائے یا جو جسم پر نشان چھوڑ جائے۔ اسی طرح حضورؐ نے عورت کے منہ پر مارنے اور بے رحمی سے مارنے سے بھی منع فرمایا ہے - اور یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ان ارشادات کی بنا پر ہے کہ تمام مفسرین نے اس حصہ آیت کی تفسیر میں "اس مار" کے بالکل ہلکی ہونے پر زور دیا ہے اور سب اس بات پر متفق ہیں کہ یہ سزا ایسی نہیں ہونی چاہیے جس سے شدید چوٹ آ جائے۔ سزا ایسی بھی نہ ہو کہ کوئی برا نشان چھوڑ جائے۔ اور نہ ہی ایسی کہ جس کا درد بے چین کر دے۔ بلکہ بعض سے تو یہ بھی منقول ہے کہ یہ مار مسواک یا رومال جیسی ہلکی پھلکی چیز سے ہو اور بعض دوسرے ائمہ (جن میں امام شافعیؒ بھی شامل ہیں) نے ترکِ ضرب کو مستحسن قرار دیا ہے۔

۵- قرآن مجید ساری دنیا کے لیے کتابِ ہدایت ہے ترقی یافتہ اور پس ماندہ ' ہر ملک و قوم کے لوگ ' ادنیٰ و اعلیٰ ہر ذہنی سطح کے لوگ ' نیک و بد ہر مزاج و طبیعت کے لوگ ' شائستہ و گنوار ہر طبقے کے لوگ اس کے مخاطب ہیں۔ مزید برآں ہر دور اور ہر زمانے میں بشری ضروریات اور انسانی ماحول کی بیشمار صورتیں پیش آ سکتی ہیں۔ دنیا میں بہت سے طبقے اور بہت سے معاشرے ایسے ہیں (مہذب یورپ اور مسیحی دنیا بھی اس سے خالی نہیں ہے) جہاں عورت کے لیے جسمانی سزائیں عام ہیں اور اپنے مفید نتائج کے ساتھ عام ہیں - مزاج زن کو درست رکھنے کی یہ تدبیر ظاہر ہے کہ اس قسم کے طبقوں کے لیے ہے۔ اور یوں فلسفہ بگھارنا الگ بات ہے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ انسانی زندگی کے کسی بھی شعبہ اور کسی بھی مرحلے میں جسمانی سزا کی عملی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس کے درست یا غلط استعمال پر بحث ہو سکتی ہے۔

Marfat.com

۶- حاکم اور نگرانِ امور کو اس کی ذمہ داریوں کے اعتبار سے کچھ ایسے اختیارات بھی حاصل ہوتے ہیں جن کا استعمال بدرجہ مجبوری ہی جائز ہوتا ہے - ایسے اختیارات کا غلط استعمال نہایت خطرناک ہوتا ہے ' جیسا کہ ہم اپنی سیاسی و معاشرتی زندگی میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ مگر محض غلط استعمال کے خطرے کی بناء پر "حاکم" کو ایسے اختیارات سے کلیتہً محروم کر دینا بھی خلاف مصلحت ہوتا ہے۔ مرد کی عورت پر "قوامیت" اور اسے نافرمان عورت کو ایک مرحلے پر سزا دینے کی اجازت ' اسی اصول کی بناء پر ہے۔ مندرجہ ذیل واقعہ اس سلسلے میں مقصدِ شارع کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اسے مشکوٰۃ المصابیح میں ابو داؤد ابن ماجہ اور دارمی کے حوالے سے ایاسؓ بن عبداللہ کی روایت پر بیان کیا گیا ہے:- ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کو عورتوں کے پیٹنے سے منع فرما دیا۔ زمانۂ جاہلیت میں ہر قسم کے حقوق سے محروم عورتوں کو جب رحمت عالمؐ نے ' دوسرے حقوق کے علاوہ یہ رعایت بھی دلائی تو غالبًا بعض عورتوں پر اس کا رد عمل کچھ ایسا ہی ہوا جیسے اپنے ہاں اپوا والیاں اسمبلی میں کوئی میدان مار لیں۔ چنانچہ حضورؐ تک یہ شکایت بھی پہنچنے لگیں کہ عورتیں "شیر" ہو گئی ہیں۔ اس پر حضورؐ نے دوبارہ ایسی نافرمان عورتوں کی طرف سے اپنے خاوندوں کی زیادتی کی شکایات موصول ہونے لگیں۔ اس پر حضورؐ نے ایک تقریر فرمائی جس میں ارشاد کیا - "لوگو ! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر والوں کے پاس بہت سے عورتیں اپنے خاوندوں کی زیادتیوں کی شکایات لائی ہیں۔ ایسے خاوند ہر گز تمہارے (معاشرے کے) اچھے آدمیوں میں سے نہیں ہیں"۔

۷- اور سچی بات تو یہ ہے کہ رشتہ ازدواج کو انقطاع سے روکنے اور ایک کنبہ کی گھریلو زندگی کو تباہی سے بچانے کے لیے ہر ناخوشگوار اقدام ' حتی کہ مارپیٹ بھی ' گوارا ہے۔ فرد کے جس فعل کے نتائج معاشرے کے دوسرے لوگوں کے لیے نقصان دہ ہوں اس فرد کو اس فعل سے روکنے کی ہر کوشش مستحسن ہے۔

واضربوھنّ کو دونوں آیتوں (۳۴ : ۳۵) کے پورے مضمون اور سیاق و سباق کے ساتھ پڑھیے تو واضح ہو جاتا ہے کہ جسمانی سزا کا یہ اقدام بھی ایک کنبہ کی عائلی زندگی

Marfat.com

کو انتشار بے بچانے کے لئے چند مؤثر اقدامات میں سے ایک اقدام ہے جنہیں نہایت حکیمانہ بصیرت اور مصلحانہ احتیاط کے ساتھ ایک منطقی ترتیب میں تجویز کیا گیا ہے۔

فان اطعنکم فلا تبغوا علیھنّ سبیلا : - اگر عورت اپنا رویہ درست کر لے۔ کم از کم بظاہر ہی فرماں بردار بن جائے تو اب تمام تادیبی کاروائی (ترکِ تعلق ہو یا مار پیٹ) فوراً بند کر دو۔ اپنے آپ کو کسی مزید تادیبی کاروائی میں حق بجانب ثابت کرنے ' اور عورت کو ستانے اور تکلیف پہنچانے کے لیے خواہ مخواہ بہانے نہ ڈھونڈتے پھرو - کیونکہ اس صورت میں سزا یا سزا کو کوشش ' اصلاح کی بجائے ' فساد کا کام دے گی اور ان تدبیروں سے مقصود اصلاح تھی نہ کہ فساد۔

إنّ الله کان علیاً کبیراً :- انسان کی یہ ایک کمزوری ہے کہ جب وہ ایک دفعہ ڈنڈے کے زور سے کسی اچھے مقصد میں بھی کامیاب ہوتا ہے تو وہ ڈنڈے کو ہی اپنا نشان عظمت سمجھ لیتا ہے۔ پھر وہ اپنے تمام جائز و ناجائز مطالبات منوانے کے لئے اس کا استعمال کرنے لگتا ہے۔ لیکن اگر خدائے بزرگ و برتر کی رفعت و عظمت کا احساس دل میں ہو اور آدمی یہ سوچے کہ اس علیّ و کبیر کے حقوق میں کتنی کچھ کوتاہیاں مجھ سے نہیں ہوئیں؟ تو کسی پر ظلم و زیادتی کجا ' ایسا آدمی تو اپنے مطالبات میں بھی یقیناً نرم پڑ جائے گا۔

وان خفتم شقاق بینھما فابعثوا حکما مّن اھله وحکماً مّن اھلھا :-

۱- اور اگر میاں بیوی کی باہمی ضد سے تعلقات اتنے بگڑ گئے ہوں کہ اب ان جونوں سے گھر کے گھر اس کشمکش کو سلجھا سکنے کی توقع نہ ہو تو اصلاح حال کی ایک تدبیر یہ ہے کہ میاں اور بیوی میں سے ہر ایک کے خاندان کا ایک ایک قابلِ اعتماد اور نیک آدمی اس غرض کے لیے مقرر کیا جائے کہ وہ دونوں مل کر اسبابِ اختلاف کی تحقیق کریں پھر آپس میں سر جوڑ کر بیٹھیں اور خلوص نیت کے ساتھ تصفیہ کی کوئی صورت نکالنے کی کوشش کریں۔

۲- یہ ثالث یہ حکم مقرر کون کرے گا؟ فابعثوا میں خطاب "تم" سے ہے جس

Marfat.com

کا مطلب یوں تو ساری امت اسلامیہ ہے مگر صاف ظاہر ہے کہ اس سے مراد ان میاں بیوی کے خاندان کے لوگ ' یا ان کے آس پاس رہنے والے مسلمان یا اسلامی حکومت کے مقامی حکام و عدالتیں ہیں - قرآنِ کریم میں نکاح و طلاق سے متعلق متعدد احکام میں جمع مخاطب کے صیغے میں تمام مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔کہ ایسا ہو تو "تم" یوں کرو(ا)۔ اس کے ساتھ اگر اس حقیقت کو بھی سامنے رکھا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانے میں کئی دفعہ مسلمان عورتیں اور مرد اپنی عائلی شکایات حضورؐ کی خدمت میں لاتے تھے اور حضورؐ اس میں مناسب فیصلے فرماتے تھے۔ حضورؐ کے بعد خلفاء راشدین کے دور میں بھی اس قسم کے واقعات کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں۔ ان آیات اور ان واقعات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی حکومت میں قرآن کے عائلی قوانین کا نفاذ اور مسلمانوں کے ازدواجی زندگی سے متعلق تنازعات از قسمِ نکاح ' طلاق ' عدت ' رجعت ' تعدد ' رضاعت ' نشوز ' خلع ' ثالثی ' مہر ' نفقہ ' حضانت' قذف' لعان وغیرہ کے متعلق فیصلے بذریعۂ عدالت ہونے چاہئیں۔

۳- من اهله اور من اهلها کی شرط سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان ثالثوں کو چاہے برادری والے خود مقرر کریں یا اسلامی عدالت کے "چوہدریوں" اور "وڈیروں" پر مشتمل کوئی مصالحتی بورڈ اس کا بدل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ یہ لوگ میاں بیوی کے اس جھگڑے کو بھی اپنی مقامی سیاست کے زیر اثر طے کرنے کی کوشش کریں اور مزید فساد پھیلائیں۔ ہاں اگر میاں بیوی کے خاندانوں میں سے کوئی آدمی بھی موجود نہ ہو تو عام مسلمانوں میں سے دو ایسے آدمی لے لیے جائیں جن میں سے ایک مرد کے لیے قابل قبول ہو دوسرا عورت کے لئے:-

۴- ان ثالثوں کے سامنے دریافت طلب امور (Terms of Reference) کیا ہوں گے؟ اور ان کے اختیارات کیا ہوں گے؟ کیا وہ صرف صلح کرا سکتے ہیں یا مناسب

ا- مثلاً دیکھیے سورہ البقرہ /۲۲۹' ۲۳۲ ' ۲۳۹ ؛ الطلاق /۲ وغیرہ

Marfat.com

سمجھیں تو علیحدگی بھی کروا سکتے ہیں۔ اور وہ صرف تجاویز و سفارشات پیش کر سکتے ہیں یا ان کا فیصلہ نافذ کیا جائے گا؟ اس بارے میں ائمہ کی آراء مختلف ہیں مگر متعدد تفسیری و فقہی اقوال اور خلفاء راشدین کے بعض فیصلوں سے یہ معلوم ہوتا ہے ۔ثالثوں کو مقرر کرتے وقت برادری یا عدالت خود ہی ان چیزوں کی وضاحت کر دے جنہیں ثالثوں نے طے کرنا ہو گا۔

ان یّریدا اصلاحاً یوفّق الله بینهما۔ ان الله کان علیماً خبیرا :- اگر ان دونوں کی نیت واقعی مصالحت و مفاہمت کی ہو گی تو اللہ ان دونوں کے درمیان موافقت کی صورت پیدا کر دے گا۔ یہاں بظاہر پہلے "دونوں" (ان یریدا کی ضمیر تثنیہ) سے مراد ثالث ہیں اور دوسرے "دونوں" (بینهما کی ضمیر تثنیہ) سے مراد زوجین ہیں اور یہی مفہوم زیادہ موزوں ہے۔

مگر دونوں جگہ زوجین یا ثالث بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ کسی بھی جھگڑے میں صلح صفائی کا امکان اس بات پر منحصر ہے کہ فریقین کے دل میں بھی اصلاح حال کی خواہش اور بیچ والوں کی نیت بھی درست ہو اور وہ دل سے یہ چاہتے ہوں کہ فریقین میں کسی طرح صفائی ہو جائے۔ اور نیتوں کو درست رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ دونوں میاں بیوی اور دونوں ثالث اس بات کا خیال کر لیں کہ وہ اپنے غلط رویہ یا اپنے فیصلہ کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے کتنے ہی اچھے "قانونی دماغ" کا ثبوت کیوں نہ دیں۔ خدائے علیم و خبیر سے اصل حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

☆☆☆

Marfat.com

اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

وما ارسلنا من رّسول الّا لیطاع باذن الله .(النساء/٦٤)

۱- منصب رسالت کے بارے میں اہلِ عرب (مشرک اور اہل کتاب سب ہی) بعض شدید غلط فہمیوں اور باطل تصورات میں گرفتار تھے۔ مثلاً مشرکین عرب کسی بشر کے رسول ہونے کے منکر تھے۔ عیسائی اپنے رسول (مسیح علیہ السلام) کی بشریت کے منکر تھے۔ یہودی "آلِ رسول" ہونے کو گناہوں کا لائسنس اور پروانۂ نجات سمجھتے تھے۔ غالباً یہودیوں ہی کے زیر اثر منافقینِ مدینہ بھی رسولؐ اور اس کے پیغام پر صرف ظاہری ایمان کو کافی سمجھتے تھے اور اطاعتِ رسولؐ سے صرف جی ہی نہیں چراتے تھے بلکہ اسے دین کی اصل اور ایمان بالرسول کی ضروری شرط بھی نہیں مانتے تھے - قرآن نے مشرکین اور اہل کتاب کے، رسولؐ و رسالت سے متعلق، تمام شبہات اور غلط عقاید کی تردید کی۔ اور اس کے ساتھ مسلمانوں کو رسالت کے درست تصور، اس کے آداب اور اس کے تقاضوں سے آگاہ کیا - یہ قرآن کریم کا ایک نہایت اہم موضوع ہے جس پر متعدد سورتوں میں اور مختلف پیرایوں میں بات کی گئی ہے - آیت زیر مطالعہ میں اطاعتِ رسولؐ کو مقاصد رسالت میں شمار کیا گیا ہے - اور خلوص و وفاداری کو اس کی شرط ٹھیرایا گیا ہے۔

۲- خدا کی طرف سے رسول محض اس لیے نہیں بھیجا جاتا کہ بس اس کی رسالت کا اقرار کر لو اور پھر اطاعت چاہے کسی کی کرتے پھرو۔ اور نہ ہی خود رسولؐ کو کسی الیکشن لڑنے والے سیاست دان کی طرح، اپنے ووٹروں (پیرؤوں) کے اعمال سے کوئی سروکار نہیں ہوتا - بلکہ رسول کے آنے کی غرض ہی یہ ہے کہ زندگی کا جو قانون وہ لے کر آیا ہے، دوسرے تمام قوانین چھوڑ کر، صرف اسی کی پیروی کی جائے۔ امت کے لیے

Marfat.com

ضروری ہے کہ رسول کو مطاع اور مقتدا تسلیم کر کے اس کی بتلائی ہوئی شریعت پر چلنا بھی سیکھے اور یہ اس لیے کہ رسول کے احکام الٰہیکے احکام ہیں۔ اور اللہ کے احکام بندوں تک پہنچانے کے علاوہ ' رسول ان احکام کا بہترین سمجھنے والا اور ان پر سب سے پہلے عمل کرنے والا ہوتا ہے۔

۳- رسولؐ کی اطاعت شخصیت پرستی نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی اطاعت کی واحد صورت ہے اور صرف اطاعتِ رسولؐ کے ذریعے ہی آدمی ہر طرح کی شخصیت پرستی ' نفس پرستی اور کئی طرح کی "پرستیوں" سے نجات پا سکتا ہے۔

ولو انهم اذ ظلموا انفسهم جاء وك فاستغفروا الله واستغفر لهم الرّسول لوجدوا الله توّاباً رّحيما :-(النساء/٦٤)-

۱- شانِ نزول کے پس منظر میں بات اسی یہودی اور منافق والے مقدمے پر چل رہی ہے ۔ ایک یہودی اور ایک نام نہاد مسلمان یعنی منافق کے درمیان کسی معاملے میں جھگڑا ہوا ۔ یہودی حق پر تھا اور اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیانت پر اعتماد کرتے ہوئے کہا کہ چلو حضورؐ کے پاس ہی تصفیہ کرالیں منافق کا پہلو (Case) کمزور تھا اس لیے اس نے یہودی سردار کعب بن اشرف کے پاس چلنے کے لیے آمادگی ظاہر کی (یہ کعب بن اشرف اپنی رشوت خوری و بددیانتی کے لیے مشہور تھا)۔ آخر یہودی کے اصرار پر وہ مقدمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے پاس لے گئے ۔ حضورؐ نے فیصلہ یہودی کے حق میں دیا کیونکہ حق پر وہی تھا ۔ وہاں سے نکل کر منافق نے کہا چلو اب ذرا حضرت عمرؓ سے بھی پوچھ لیں ۔ حضرت عمرؓ ان دنوں ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مدینہ کے قاضی تھے اور شاید منافق کو یہ بھی خیال ہوا کہ حضرت عمرؓ بڑے " متعصب" مسلمان ہیں ضرور یہودی کے مقابلے پر ایک " مسلمان " کا ساتھ دیں گے ۔ حضرت عمرؓ کو جب یہ معلوم ہوا کہ پہلے بارگاہ رسالت سے یہودی کے حق میں فیصلہ ہو چکا ہے تو انہوں نے اس منافق مسلمان کو سزائے موت دے دی اور کہا ۔" جو مسلمان ہو کر رسولؐ کے فیصلے پر راضی نہ ہو اس کا یہی فیصلہ ہے "--- دوسرے

Marfat.com

منافقین حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر قسمیں کھانے لگے کہ وہ شخص آپؐ کے فیصلے سے ناراض نہیں تھا بلکہ وہ تو حضرت عمرؓ کے پاس صرف اس لیے گیا تھا کہ شاید ان کے ذاتی دباؤ سے فریقین میں راضی نامہ ہو جائے گا۔ اور ہم جو کوئی مقدمہ وغیرہ دوسری جگہ لے جاتے ہیں تو اس خیال سے نہیں کہ فیصلہ کا حق رسولؐ کے سوا کسی اور کو حاصل ہے بلکہ ہم تو صرف اس لیے جاتے ہیں وہاں انصاف و قانون سے زیادہ فریقین کے درمیان مفاہمت و مصالحت (Compromise) کی توقع ہوتی ہے۔

ان لوگوں کا جرم یہ کچھ کم نہیں تھا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مان لینے کے باوجود آپؐ کے واضح فیصلے سے اعراض کیا اس سنگین جرم کے ارتکاب کے بعد انہیں چاہیے تھا کہ فوراً نادم ہو کر بارگاہ نبوی میں پیش ہوتے۔ پھر وہاں بہانے بنا بنا کر اور قسمیں کھا کھا کر اپنے آپ کو بے گناہ اور بری الذمہ بلکہ مخلص قرار دینے کی کوشش نہ کرتے بلکہ وہ اپنے کیے پر ندامت اور دلی پشیمانی کا اظہار کرتے اور معافی مانگتے - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایمان کے ساتھ حاضری اور پھر اللہ سے طلبِ مغفرت - یہ دونوں چیزیں یقیناً رحمۃ للعالمینؐ کے قلب مبارک سے اس ایذاء کے اثر کو دور کر دیتیں، جو ان لوگوں کے پہلے رویے سے پیدا ہوا تھا، اور آپؐ ضرور ان لوگوں کے لیے بارگاہِ الٰہی سے مغفرت طلب کرتے - اس طرح ان کی توبہ قبول ہو گئی ہوتی اور وہ اللہ کی رحمت اور توجہ کے مستحق ٹھیرتے۔

۲۔ عموم کے اعتبار سے آیت میں ہمارے لیے یہ سبق بھی ہے کہ جب کسی مسلمان سے کسی غلطی کا ارتکاب ہو یا کوئی برائی سرزد ہو تو اسے اس کی معافی اور تلافی کے لیے کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اس لیے نہیں کہ اس غلطی پر اڑ جانے اور اپنے موقف کو جائز قرار دینے کے لیے، کتاب و سنت سے "دلائل" اور حیلے ڈھونڈتا پھرے۔ بلکہ خدا اور رسولؐ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق، اپنی غلطی کی معافی اللہ سے مانگنی چاہیے۔ مسلمان کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قسم کا ہو، چاہیے کہ برائی کر بیٹھنے پر اسے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے شرم

Marfat.com

محسوس ہو۔ آقاؐ کے حضور خجالت کا یہ احساس اس کے اشک ہائے ندامت کو بارگاہِ الٰہی میں قابلِ قدر اور باعث مغفرت بنا دے گا۔

۳- بعض حضرات نے جو اس آیت سے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حاضر ناظر ہونے اور مشکلات میں حضورؐ کو پکارنے کا استدلال کیا ہے وہ، امکان اور عدمِ امکان کی بحث سے قطع نظر، اس لیے غلط ہے کہ کتاب اللہ اور خود آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس قسم کے اعتقاد و عمل سے منع فرما دیا ہے۔ اطاعت کی عملی شکل وہی اور صرف وہی درست ہے جسے کتاب اللہ اور سنتِ خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم کی منظوری حاصل ہے اپنے اپنے ذہن کے مطابق "خدا و رسول کی اطاعت اور چاہے کچھ ہو "اطاعت" ضرور نہیں ہے۔ آقاؐ کی تعظیم اس کے حکم کی تعمیل میں ہے نا کہ تاویل میں - اس کے بعد یہ بحث کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فلاں فلاں اختیار حاصل ہے یا نہیں یہ کچھ اس قسم کی فضول بحث ہے جیسے کوئی ڈگری دلا سکتا ہے یا نہیں۔ کیا انکار کرنے والا کسی توہین کا مرتکب ہے؟

۴- اس کے برعکس ان لوگوں کی تفریط اور "ضلالتِ کبریٰ" بھی مقامِ عبرت ہے جو، قرآن و سنت کے علاوہ لغت سے بھی تمسخر کرتے ہوئے، توبہ، مغفرت اور رسول کا "مفہوم" بھی اب "ایجاد" کرتے پھرتے ہیں جو اپنی بے بصیرتی سے روحانیت اور تعلق باللہ کو ایک ڈھکو سلا خیال کرتے ہیں، اور جن کے "مارکسی' فکر کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ قرآن میں رسول سے مراد صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ مہدیٔ موعود کا ہمزاد "مرکز ملت" ہے (جس کا مدعی اور مصداق، مہدیت کی طرح کوئی طالع آزما دینی یا سیاسی لیڈر ہو سکتا ہے)۔ دیکھیے؟ اس فکر نے مندرجہ بالا آیت کا مفہوم کیا نکالا ہے:- " نہ مجرم براہِ راست خدا سے معافی طلب کر سکتا ہے نہ خدا اسے براہِ راست معافی دیتا ہے۔ یہ سب کچھ اس نظام کی وساطت سے ہوتا ہے جو قوانینِ خداوندی کے نفاذ کے لیے قائم ہوتا ہے اور جب یہ نظام اسے معافی دیتا ہے تو یہ معافی اس نظام کی طرف سے نہیں ہوتی بلکہ خدا کی طرف سے ہوتی ہے کیونکہ یہ اس کے قانون کے

Marfat.com

مطابق ملی تھی" - فما ذا بعد الحقّ الّا الضّلل (حق کو چھوڑنے کے بعد گمراہی نہیں ہو گی تو اور کیا ہو گا؟)۔

فلا وربك لا يؤمنون حتّیٰ يحكّموك فيما شجر بينهم :(النساء/٦٥)۔

ایمان کا تقاضا اطاعتِ رسولؐ ہے اور ایمان کا یہ تقاضا ' حیاتِ رسولؐ میں ظاہری نیازمندی سے اور بعد از وفاتِ رسولؐ محض "نیازوں" کی نمائش ہے پورا نہیں ہوتا۔ جب تک کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے تمام باہمی اختلافات میں ' وہ افراد کے باہمی ذاتی جھگڑے اور مقدمے ہوں یا کسی قومی و ملی مسئلے پر اختلافِ آراء ' حکم اور ثالث نہ تسلیم کیا جائے۔ اور آپ کے فیصلے کو آخری سند مان کر اس کے آگے سر تسلیم خم نہ کیا جائے۔ حضورؐ کی حیات مبارک میں تو آپؐ کا حکم بننا ظاہر تھا ' بعد از وفات آپؐ کی سنت اور آپؐ کی شریعت حکم بننے کے لیے کافی ہے۔ اسی لیے ائمہ فقہ نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ جو کوئی اللہ یا اس کے رسولؐ کے کسی حکم اور فیصلے کی صحت میں شک و شبہ کرے یا اسے ماننے سے انکار کرے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

ثم لا يجدوا فی انفسهم حرجاً مّمّا قضيت و يسلّموا تسليما:(النساء/٦٥)

ا- رسولؐ اللہ کی خدمت میں اپنے مقدمات محض لے آنا ہی کافی نہیں ' بلکہ رسولؐ کے صادر کردہ فیصلے پر عقلی اور اعتقادی حیثیت سے ' اطمینان قلب بھی ہونا چاہیے اور آپؐ کے فیصلے کو شرح صدر کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔ ہر چند کہ وہ فیصلہ اپنی خواہشات اور اپنے مفادات کے خلاف ہو اس پر دل میں بھی ادنیٰ سی ناراضگی یا تنگی پیدا نہیں ہونی چاہیے(ا) کیونکہ حضورؐ کے فیصلوں کو بطیّب خاطر قبول نہ کرنا نفیِ ایمان کی شہادت اور علامت ہے۔

ا- اس آیت کے شانِ نزول کی روایات میں یہ واقعہ بھی مذکور ہے کہ زبیرؓ بن العوام اور ایک منافق کے درمیان زمین و پانی کا کوئی جھگڑا ہوا۔ آنحضورؐ نے حق کے مطابق زبیرؓ کے حق میں فیصلہ دیا تو وہ منافق باہر جا کر یہ کہنے لگا کہ "رسولؐ نے اپنی پھوپھی کے بیٹے کی حمایت کی ہے"۔

Marfat.com

۲- آیت میں ان لوگوں کے لیے بھی سامانِ ہدایت اور دعوتِ فکر ہے جو اپنے دل پسند نظریات ، اور چند "ہر دلعزیز" جاہلی آراء کی تائید کے لیے بوقت ضرورت سنت و حدیث سے مفید طلب "دلائل" بھی تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ مگر جہاں سنت کا فیصلہ خلافِ مرضی ہو وہاں سنت اور اطاعتِ رسولؐ سے انکار کر دیتے ہیں۔

۳- آیت کا مطلب یہ بھی ہے کہ اسلام کی حکومت ، عام قانون کی طرح ، محض "جسم" تک محدود نہیں رہنی چاہئیے بلکہ روح اور قلب و ذہن پر ہونی چاہیے - جب تک آدمی کی ذہنی کایا پلٹ نہیں ہوتی۔ جب تک اس کے اندر ایک داخلی انقلاب پیدا نہیں ہوتا ، جب تک ایمان اس کی زبان سے گزر کر اس کے دل کی گہرائیوں تک نہیں پہنچتا اور جب تک وہ خدا اور رسولؐ کے آگے ظاہراً باطناً مجسم تسلیم و رضا نہیں بن جاتا - وہ دنیا کو نہ کوئی نظامِ ربوبیت دے سکتا ہے نہ صالح قیادت - بلکہ وہ خود اور اس کے سب دعاوی ہیچ ہیں۔

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ ...(النساء/ ۸۰-۸۱)

(۱) اطاعت رسول ہی میں اطاعت خدا ہے۔ اور یہ صاف ظاہر ہے کیونکہ عام انسانوں کے پاس احکام الٰہی سے واقف ہونے کا کوئی زریعہ ہی نہیں ۔ جیسا کہ پہلے آیات ۵۹، ۶۰، ۶۴، اور ۶۹ میں بوضاحت بیان ہوچکا ہے ، رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی خدا کے احکام پہنچانے اور اسکی اطاعت کا عملی طریقہ سکھانے کا واحد ذریعہ ہیں۔ اللہ کے احکام کی اطاعت ہی اصل مقصود ہے ۔ مگر اللہ کے احکام بھی صرف رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعے معلوم ہوسکتے ہیں اور ان پر درست طریقے سے عمل کرنا بھی ۔

(۲) اللہ کی اطاعت رسولؐ کی اطاعت سے الگ اور جدا نہیں ہے اور اس آیت کے بعد ان لوگوں کو گمراہی میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی جو اللہ کی اطاعت کے ساتھ رسولؐ کی اطاعت ضروری نہیں سمجھتے -- کیونکہ اگر رسولؐ کی اطاعت ہی اللہ کی اطاعت ہے تو رسولؐ کی نافرمانی ضرور اللہ کی نافرمانی --- البتہ اس زمانے کے منافقوں کو عہدِ رسالت کے منافقوں پر یہ "برتری" (Advantage) حاصل ہے کہ "رسول" اور

Marfat.com

"اطاعت" کا جو مفہوم ان کی "لغات" میں ہے وہ اس سے پہلے نہ منافقوں کو معلوم تھا نہ مومنوں کو۔

(۳) آیت سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا معصوم عن الخطا ہونا بھی ثابت ہوتا ہے کیونکہ اگر رسولؐ غلطی اور خطاء کا امکان ہوتا تو ان کی اطاعت کو عین اطاعت الٰہی نہ قرار دیا جاتا --- اور اس سے ان لوگوں کو بھی تردید ہوتی ہے جو رسولؐ کے احکام اور سنت سے ثابت تفصیلات کو مشورے کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ انسانوں کے مشورہ پر مبنی فیصلہ بہر حال غلطی کے امکان سے بری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مگر آیت ان احکام کو خدا کے احکام کے برابر اور ان کی اطاعت کو ٹھیک اطاعت الٰہی کا درجہ دے رہی ہے۔ جو ان کی قطعیت اور معصومیت عن الخطأ کی دلیل ہے۔

پس اس ساری وضاحت کے بعد بھی (اے پیغمبرؐ!) اگر کوئی آپ کا کہنا نہیں سنتا یا آپ کی اطاعت سے روگردانی کرتا ہے تو آپ اس کے لیے زیادہ فکرو غم میں نہ پڑیئے۔ ان لوگوں کی پاسبانی کرنا انہیں زبر دستی راہ راست پر چلانا اور انہیں پکڑ پکڑ کر اور گھیر گھیر طر ہلاکت و تباہی سے بچانا آپکی ذمہ داری نہیں ہے۔ آپ تبلیغ کے ذمہ دار ہیں اس کے بعد یہ لوگ اپنے عمل اور اس کے نتائج کے لیے خود ذمہ دار ہیں۔

(۱) ذکر' اطاعتِ رسول کے اولین منکروں یعنی منافقین مدینہ کا چل رہا ہے۔ جہاں تک باتوں اور زبانِ قال کا تعلق ہے۔ یہ لوگ بس " مجسم اور سراپا اطاعت" تھے۔ مجلسِ نبوی میں حاضر ہوتے تو ہر وقت " بسرو چشم حضور !" --- " تعمیل ارشاد بدل وجان منظور !" کی قسم کے کلمات ان کے منہ سے نکلتے تھے۔

(۲) کیا آج بھی منافق کی ایک پہچان یہ نہیں ہے کہ وہ اسلام کی "زبانی خدمات" اور اپنے "تقریری و تحریری بیانات" کی حد تک "کسی سے کم مسلمان" نہیں ہیں۔

(۱) بارگاہِ نبوی سے باہر نکل کر' ان منافقوں کی لیڈر شپ یعنی ان کے سر برآورد سرغنے عموماً رات کی تاریکی میں' یا اپنے مخصوص اڈوں پر 'اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔ یہاں اس قسم کے منصوبے تیار کئے جاتے

Marfat.com

تھے "کہ جس بات کے پابند ہونے کا وہ اقرار کر چکے ہیں" کس طرح، جھوٹے ہوئے بغیر، اس سے جان چھڑائی جائے؟

(۲) "زبانی خدمات" کے ساتھ ساتھ اپنے ہی سابقہ اسلامی اعلانات کی پابندیوں، اور ان کے نفاذ کی مسئولیت، سے فرار کی راہیں بھی سوچتے اور نکالتے چلے جانا۔ آج کے منافق کا بھی شناختی نشان ہے۔ عہدِ رسالت کے منافق بارگاہِ نبوت میں کچھ اور کہتے تھے مگر اپنے "حلقوں" میں جاکر ان کی اصلیت سر گرم کار ہوتی تھی۔ کیا آج ہماری بھی یہ حالت نہیں ہے۔ دینی جلسوں، اسلامی مذاکروں، کانفرنسوں کانود کشینوں، اسمبلیوں اور انتخابی مہموں میں ہم اسلام کا نام کس طرح استعمال کرتے اور کیا کچھ وعدے اور اعلان نہیں کرتے۔ مگر بڑے کلبوں، اونچے ہوٹلوں، کاروباری حلقوں "ثقافتی تقریبوں" اور ایوانِ حکومت میں پہنچ کر ہم کیا کرتے اور کس انداز میں سوچنے لگ جاتے؟

"اور اللہ سب کچھ لکھتا جارہا ہے"۔ اس نے غفلت پر تنبیہ بھی ہے اور منافق کی "ہوشیاری" (جس پر اسے اکثر ناز ہوتا ہے) پر طنز بھی۔ منافقین مدینہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ ان کے "پسِ پردہ اعمال" پر دیکھنے والی آنکھ اور ہر سننے کان سے پوشیدہ ہیں --- اس اعلان یا تنبیہ پر بھی ان میں سے اکثر باز نہیں آئے۔ اور مجرمانہ ذہنیت تو فرد حقیقت (History Sheet) کھل جانے کی پروا بھی کم ہی کرتی ہے ---۔ مگر ہر ہوش مند اور نیک بخت انسان اپنا ریکارڈ داغدار کرنے سے پرہیز ہی کرے گا۔

۱- سوائے پیغمبرؐ! علیہ السلام آپ ان لوگوں کے بارے میں زیادہ غم و فکر میں نہ پڑیئے اور نہ ہی ان کی سازشوں اور خفیہ منصوبوں کی پروا کیجئے۔ اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے کام کرتے جایئے اور یقین رکھیے کہ دشمن کی ساری سکیمیں اور سارے منصوبے اللہ کی کارسازی کے آگے یونہی دھرے رہ جایا کرتے ہیں۔

Marfat.com

۲- آیت میں دین کے لیے کام کرنے والوں کو بالواسطہ نصیحت بھی ہے کہ اس قسم کے لوگوں سے زیادہ الجھنے ' یا ان کی عیارانہ تدبیروں سے خائف ہونے کی بجائے خدا کو بھروسہ پر اپنا کام کرتے چلے جائیں - ان سے زیادہ الجھنے میں اپنی نفسانیت کے ابھرنے کا خطرہ ہے اور ان سے ڈرنا خدا کی کارسازی پر ایمان کے منافی ہے -

☆☆☆

Marfat.com

صلوٰۃِ قصر

سورت النساء آیات (۱۰۱-۱۰۴) جہاد کے سلسلے کی آخری کڑی ہیں - یہاں یہ بات تو صرف سفر میں نماز قصر کرنے اور جنگ میں نمازِ خوف پڑھنے کے طریقے کی ہوئی ہے، مگر سیاق و سباق کے لحاظ سے اور اندازِ تعبیر سے تہ کی بات یہ نکلتی ہے کہ مومن کا تعلق ہر حال میں اپنے رب کے ساتھ استوار ہوتا ہے۔ اور نماز ہی اس تعلق کی واضح اور مضبوط ترین صورت ہے۔ اعدائے اسلام کے ساتھ معرکہ آرائی کے دوران، عین میدانِ کارزار میں، نماز ادا کرنے اور ہتھیار سنبھالے رکھنے، کا حکم ایک ساتھ دیا گیا ہے۔ حقیقتاً نماز ہی مومن کا اصل ہتھیار ہے، یہی اس کی نصرت و کامرانی کی ضمانت ہے اور نماز سے غفلت، میدانِ جنگ میں اپنا اسلحہ گنوا بیٹھنے سے زیادہ مہلک ہے۔ یہ نماز ہی ہے جو مومن کے اصل نصب العین - رضاء الٰہی - کو اس کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی - اور نماز اور ذکر اللہ کے ذریعے ہی پروردگار کے ساتھ وہ مستقل تعلق پیدا ہوتا ہے جو بندۂ مومن کے اندر، اس کے نصب العین کے حصول کی راہ میں پیش آنے والی، تمام مشکلات کا مقابلہ کرنے اور ان پر غالب آنے کی ہمت پیدا کرتا ہے۔ وإذا ضربتم فی الارض (النساء/ ۱۰۱) جب تمہیں سفر کا اتفاق ہو تو...- "ضرب فی الارض" کے معنی "تلاشِ معاش یا جہاد کے لیے گھر سے نکلنا" اور "سفر میں جلدی اور تیزی سے راستہ طے کرنا" ہیں۔ یہاں مراد مطلقاً سفر ہے اور برّی، بحری یا ہوائی ہر طرح کا سفر اس میں شامل ہے۔ الأرض یہاں خاص خشکی کے لیے نہیں بلکہ بطور محاورہ ہر قسم کی "جائے سفر" کے لیے استعمال ہوا ہے۔

۲- آیت کے نزول کے وقت مسلمانوں کے لیے، دوسری ضرورتوں کے علاوہ، ہجرت، تبلیغ اور جہاد کے لیے سفر" تقریباً معمول ہی بن چکا تھا۔ روایات سے یہ معلوم

Marfat.com

ہوتا ہے کہ "سفر میں قصر صلوٰۃ" کا یہ حکم (آیت زیر مطالعہ کا ابتدائی حصہ) نماز خوف کے حکم سے (جو اس کے بعد مذکور ہے) ایک سال پہلے نازل ہوا تھا۔

۳۔ ائمہ فقہاء نے سنتِ نبوی اور عمل صحابہؓ سے حاصل ہونے والی معلومات اور اپنے اجتہادات کی بناء پر "سفر" کو مختلف پہلوؤں سے واضح طور پر محدود و معین کر دینے (Definition) کے سلسلے میں حسب ذیل مباحث کو چھیڑا ہے۔ اختلاف آراء سے قطع نظر، یہ مباحث، دقت و وسعتِ نظر اور "مسئلہ کے کسی بھی پہلو کو تشنہ نہ چھوڑنے" کی نہایت عمدہ مثال ہیں۔

(i) مقصدِ سفر (Propriety of Purpose) یعنی کیا صرف جائز مقاصد کے لیے سفر میں قصر کی اجازت ہو گی یا حرام اور ناجائز اغراض کے لیے اختیار کیے ہوئے سفر میں بھی؟

(ii) مقدار سفر (Distance Restrictions) یعنی کم از کم کتنے فاصلے کے سفر کو "سفر قابلِ قصر" سمجھا جائے گا؟

(iii) قیام اثنائے سفر (Break of Journey Period) یعنی سفر میں کسی جگہ عارضی قیام کی صورت میں زیادہ سے زیادہ کتنے دنوں کے لیے قصر کی اجازت ہو گی؟

(iv) پیشہ وارانہ سفر (Professional Travelling) یعنی جب آدمی کا پیشہ ہی اس قسم کا ہو مثلاً ریلوں، بسوں، جہازوں اور کسی قسم کی ٹرانسپورٹ سروس کا سفری عملہ (Running Staff) تو اس صورت میں قصر کی اجازت ہو گی یا نہیں؟

ان سوالوں کے جواب اور ہر ایک کے دلائل، فقہ کی مبسوط کتب میں درج ہیں - یہاں اس کا موقع نہیں اور نہ ہی بہت سے مختلف اقوال لکھ دینا چنداں مفید

Marfat.com

ہے(۱)۔

فلیس علیکم جناح أن تقصروا من الصّلوٰة (النساء/۱۰۱)۔

۱- پس حالتِ سفر میں نماز قصر کرنا قطعاً کوئی باعثِ ملامت یا قابلِ گرفت بات نہیں ہے۔ اور نہ اس سے اجر میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے۔

۲- صلوٰۃ (یعنی وہ نماز جس میں قصر کرنا ہوگا) سے مراد یہاں فرض نماز کی رکعات ہیں -

۳- قصر کا مطلب یہ ہے کہ جن اوقات کی نماز میں فرض رکعتوں کی تعداد چار ہے۔ (یعنی ظہر ' عصر اور عشاء) ان میں صرف دو رکعتیں پڑھی جائیں۔ فجر اور مغرب کے فرض پورے پڑھے جائیں گے۔ سنتوں میں کوئی قصر نہیں ہوتا البتہ اس میں اختلاف ہے کہ سفر میں صرف فرض (قصر کر کے) پڑھ لیے جائیں یا سنتیں بھی پڑھنی ہوں گی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سفر میں بھی فجر کی سنتیں اور رات کے وتر ضرور پڑھا کرتے تھے اس لیے اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مگر دوسرے اوقات میں آپ کا بالالتزام سنتیں پڑھنا ثابت نہیں ہے۔ اسی لیے ان کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ بعض صحابہ و ائمہ کے نزدیک ' سفر کی حالت میں ' ان اوقات کی سنتیں پڑھنا ممنوع بعض کے نزدیک اختیاری اور بعض کے نزدیک افضل ہے۔

۴- قصر کے سلسلے میں یہ بحث بھی پیدا ہوتی ہے کہ جب قصر کی پوری شرائط موجود ہوں تو نماز میں قصر کرنے کی صرف اجازت ہے یا ایسا کرنا واجب ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں ہمیشہ ہی نماز قصر فرماتے تھے۔ اور بیشتر صحابہ کا

۱- بطور نمونہ صرف دو فقہی مذاہب یعنی حنفیہ اور جعفریہ کا مسلک بیان کیا جاتا ہے۔ مقدم الذکر کے نزدیک مقصدِ سفر ' اجازت قصر پر اثر انداز نہیں ہوتا' شرعی سفر کی مقدار تقریباً ۵۵ میل اور عارضی قیام زیادہ سے زیادہ ۱۵ دن ہونا چاہیے موخر الذکر ہر قسم کے سفر میں قصر کے قائل نہیں اور ان کے نزدیک شرعی سفر کی مقدار تقریباً ایک سو میل عارضی قیام کی زیادہ سے زیادہ مدت ۱۰ دن ہے۔

Marfat.com

بھی یہی عمل تھا۔ اس لیے حنفیہ اور شیعہ کے نزدیک نماز میں قصر کرنا واجب ہے۔ بعض دیگر ائمہ اسے واجب تو قرار نہیں دیتے مگر پھر بھی قصر کو افضل اور قصر نہ کرنے کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ اس اختلاف کی وجہ دراصل "فلیس علیکم جناح" (تم پر کچھ مضائقہ نہیں) کا ظاہر مفہوم ہے - حالانکہ ان الفاظ کا مقصد لوگوں کے اس شبہ کو دور کرنا ہے کہ کیا نماز میں قصر کرنا محض آسانی کا بہانہ۔تو نہیں ؟ یا اس سے نماز کے ثواب میں کمی تو نہیں ہو گی؟

إن خفتم أن يفتنكم الّذين كفروا – إنّ الكٰفرين كانوا لكم عدوّا مّبينا (النساء/١٠١)-

١- ان حالات میں جب کہ تمہیں ہر وقت ان کافروں کی طرف سے ضرر رسانی کا اندیشہ بھی لگا رہتا ہے ' قصر کا یہ حکم ' تمہارے لیے ایک دفاعی اہمیت اور خدا کے انعام کی حیثیت رکھتا ہے اور کافروں کی تمہارے ساتھ دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔

٢- اس آیت میں "ان خفتم" (اگر تمہیں اندیشہ ہو) سے مسلمانوں کے بعض مذاہب فکر مثلاً اہل ظواہر اور خوارج نے یہ مطلب نکالا ہے کہ نماز قصر کرنا ' صرف خطرے کی حالت میں جائز ہے ورنہ نہیں کیونکہ قرآنِ کریم نے اسے حالتِ خوف کے ساتھ مشروط بیان کیا ہے - مگر ائمہ مذاہب کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ قصر صرف سفر کے ساتھ مشروط ہے چاہے یہ سفر زمانہ جنگ میں ہو یا زمانۂ امن میں - اس لیے کہ :-

(i) اول تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ نے امن کے زمانے میں - فتح مکہ کے بعد بھی - سفر میں ہمیشہ نماز قصر فرمائی ہے - بلکہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے یہی سوال کیا تو آپؐ نے قصر کی اجازت کو خدا کا انعام کہہ کر اسے قبول کرنے کا حکم دیا ہے۔ گویا قصر نہ کرنے میں ایک پہلو بے ادبی کا نکلتا ہے۔

(ii) دوسرے شرط کا مفہوم اکثر صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ اس وقت مشروط موجود

Marfat.com

تھا - یہ نہیں کہ آئندہ جب شرط نہ پائی جائے تو مشروط موجود نہیں ہو گا - شرط کا اس طرح کا استعمال قرآن کریم ' عربی زبان بلکہ دوسری زبانوں میں بھی عام ہے۔ اور ہر بات کا مفہوم مخالف مراد لینا ' ہمیشہ درست نہیں ہوتا ' اس طرح - آیت میں صرف زمانۂ نزول کے وقت کی ایک واقعی موجودہ حالت کو بیان کیا گیا ہے۔

۳- زمانۂ امن اور زمانۂ خوف کا قصر ایک جیسا نہیں ہوتا۔ زمانۂ امن میں تو قصر کا مطلب صرف فرض رکعتوں کو نصف کر دینا ہے۔ اور وہ آدھی رکعتیں پوری طرح ' تمام ارکان شرائط کے ساتھ ' ادا کی جاتی ہیں مگر سفر جب زمانۂ خوف اور حالتِ خوف (جنگ ' جنگل وغیرہ) میں کیا جا رہا ہو تو نماز کو حالات کے مطابق قصر کر لیا جاتا ہے - ایسی صورت میں صرف ایک رکعت بھی پڑھی جا سکتی ہے - اور طہارت ' قبلہ ' حرکت اور رکوع سجود کے احکام کو بھی موقع کی مناسبت سے بدلا جا سکتا ہے(۱)۔ بلکہ اشد مجبوری میں نماز کو موخر بھی کیا جا سکتا ہے جیسا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ خندق میں کرنا پڑا تھا۔

واذا کنت فیھم فاقمت لھم الصّلوٰۃ ۔ فلتقم طائفۃ مّنھم مّعک ' ولیا خذوا اسلحتھم. فإذا سجدوا فلیکونوا من وّرآئکم. ولتات طائفۃ اخریٰ کم یصلّو فلیصلوا معک ' ولیاخذوا حذرھم واسلحتھم(النساء/۱۰۲)۔

☆ یہ عین میدانِ جنگ میں نمازِ خوف کے ادا کرنے کا ایک طریقہ ہے جسے اختصار اور وضاحت دونوں کا لحاظ رکھتے ہوئے یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱- مثلاً نماز کی حالت میں ہتھیار چلانے ' جگہ بدل لینے ' خون آلود کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھ لینے ' اشارہ سے رکوع و سجود کر لینے اور قبلہ رخ نہ ہو سکنے کی صورت میں کسی طرف منہ کر لینے کی اجازت ہے گویا زمانۂ امن کا قصر صرف رکعات میں ہے اور زمانۂ خوف کا قصر نماز کی جملہ کیفیات میں ہو سکتا ہے۔

Marfat.com

☆ "جب آپ (خطاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے) میدانِ جنگ میں مسلمانوں کو نماز پڑھانے لگیں تو سب کے سب جماعت میں شریک نہ ہوں۔

☆ بلکہ پوری فوج کے دو حصے کر لیں - ایک حصہ تو پوری ' مستعدی اور ہوشیاری کے ساتھ دشمن کے سامنے سینہ سپر رہے۔ دوسرا حصہ آپ کے ساتھ نماز میں شامل ہو جائے۔ مگر یہ لوگ بھی اپنا اسلحہ سنبھالے رکھیں اور نماز کی حالت میں بھی ہتھیار بند رہیں۔

☆ جب پہلی رکعت پوری ہو چکے تو سجدے کے بعد دوسری رکعت میں کھڑے ہونے کی بجائے یہ لوگ خود بخود پیچھے چلے جائیں اور پہلے حصہ فوج کی جگہ ڈیوٹی سنبھال لیں اور انہیں نماز میں شامل ہونے کے لیے بھیج دیں اس دوران میں آپ بدستور اپنی دوسری رکعت جاری رکھیں۔

☆ اب وہ دوسرا حصۂ فوج ' جس نے ابھی تک نماز میں شرکت نہیں کی تھی ' آکر آپؐ کے ساتھ نماز میں شریک ہو جائے اور ایک رکعت نماز پوری کر لے۔ مگر یہ لوگ بھی ہتھیار بند اور کسی ناگہانی صورت حال میں فوری کاروائی کے لیے مستعد رہیں - اس طرح ہر حصۂ فوج آپ کے ساتھ مل کر صرف ایک رکعت نماز ہی پڑھے گا - اس کے بعد (اور یہ تفصیل کتبِ حدیث سے معلوم ہوتی ہے) جب آپ سلام پھیر چکیں - اور نماز تو بوجہ قصر دو رکعت ہی ہو گی - تو یہ دوسرا گروہ واپس اپنی ڈیوٹی پر حلا جائے اور پہلا گروہ (جو پہلے ایک رکعت پڑھ کر گیا تھا) نماز کی جگہ آ جائے اور یہ لوگ اب انفرادی طور پر - کیونکہ اب جماعت نہیں ہو رہی - اپنی دوسری رکعت پوری کر لیں - پھر یہ بھی سلام پھیرتے ہی دوبارہ واپس جا کر دشمن کے سامنے پوزیشن لے لیں اور وہاں کھڑے گروہ کو (جو صرف دوسری رکعت با جماعت ادا کر چکے ہیں) نماز کے لیے بھیج دیں - اب یہ حصہ فوج نماز کی جگہ پر آ کر اپنی دوسری رکعت (جو شروع میں رہ گئی تھی) کو انفرادی طور پر اسی طرح پورا کر لیں جس طرح نماز کی کچھ رکعتیں با جماعت پڑھنے والا - (جسے اصطلاح میں مسبوق کہتے ہیں) - بعد میں کھڑا ہو کر اپنی نماز

Marfat.com

پوری کر لیتا ہے۔

کتب احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف موقعوں پر، مندرجہ بالا طریقے کے علاوہ، تین چار اور مختلف طریقوں سے بھی نمازِ خوف ادا کی ہے اور ائمہ فقہاء میں سے کسی نے ایک روایت کو ترجیح دی ہے اور کسی نے دوسری کو - مندرجہ بالا طریقے کی روایت، جو آیت قرآنی کی تفسیر کر دیتی ہے، عبداللہ بن مسعودؓ سے ہے اور حنفیہ اسے ترجیح دیتے ہیں - در اصل اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ نمازِ خوف کا انحصار جنگ کو موقع و محل اور فوجی صورت حال پر ہے اور اس کی ترکیب میں وسعت اس لیے رکھی گئی ہے تاکہ بوقت ضرورت ان طریقوں میں سے جو موزوں و مناسب معلوم ہو اسے اختیار کر لیا جائے۔ نماز خوف کی تمام صورتوں میں فوج کا دو حصوں میں تقسیم ہو کر نماز پڑھنا اور نماز کر دوران ہی اپنی پوزیشن بدلتے رہنا بنیادی اصول ہے۔

۴- چونکہ اس آیت میں تمام تر خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، اس سے بعض لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ نماز خوف کا حکم صرف حضورؐ کے ساتھ مخصوص تھا - مگر قرآن کریم کا یہ اندازِ خطاب عام ہے۔ اور بھی احکام ایسے ہیں جن کے مخاطب حضورؐ ہیں مگر حکم آپ کے بعد جو دوسرے مسلمانوں کے لیے بھی ہے - اور نماز خوف تو صحابہؓ نے حضورؐ کے بعد بھی پڑھی ہے اور کسی صحابی سے اس کے متعلق کوئی اختلاف منقول نہیں ہے - لہٰذا نماز خوف کے حکم کو آئندہ کے لیے متروک قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

۵- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد فوج کے مختلف حصے کر کے ہر ایک کے لیے الگ امام بھی مقرر کیا جا سکتا ہے اور اس طرح سب حصے الگ الگ اور باری باری سے بھی نمازِ خوف ادا کر سکتے ہیں - مگر یہ سب اس صورت میں ہے جب دونوں فوجیں آمنے سامنے موجود ہوں لیکن ابھی جنگ نہ شروع ہوئی ہو - عین معرکۂ قتال میں، جب لڑائی زور سے شروع ہو، نماز کو مؤخر بھی کیا جا سکتا ہے - اور جماعت کو ترک کر کے

Marfat.com

ہر آدمی الگ الگ اپنی نماز خوف پڑھ سکتا ہے - اور استقبالِ قبلہ اور قیام بھی ضروری نہیں رہے گا۔

ودّ الّذین کفروا لو تغفلون عن اسلحتکم وامتعتکم فیمیلون علیکم مّیلة وّاحدة — فلا جناح علیکم غن کان بکم اذی مّن مطر او کنتم مّرضیٰ ان تضعوا اسلحتکم — وخذوا حذرکم انّ الله امدّا للکفرین عذاباً مّھینا ۔(النساء/ ۱۰۲)

۱- کفار اور دشمنانِ اسلام، مسلمانوں کی کسی بھی غفلت سے فائدہ اٹھانے میں کبھی غفلت نہیں کریں گے۔ میدانِ جنگ میں تو وہ ایسے موقع کی تلاش میں رہیں گے ہی کہ ان کا بس چلے تو مسلمانوں کو سنبھلنے سے ہی پہلے کچل دیں - لہٰذا یہ تمہارا فرض ہے کہ احتیاطی تدابیر اور چستی و. مستعدی میں فرق نہ آنے پائے۔ بارش، بیماری اور کسی عذر کی وجہ سے ہتھیار اتار کر الگ بھی رکھے جا سکتے ہیں -اصل بات ہتھیاروں کا چوبیس گھنٹے بدن پر رہنا نہیں بلکہ ذہن کا ہر وقت بیدار رہنا ہے - بس اتنی بات تم کر دو - پھر دیکھو تمہارے مقابلے پر اللہ تعالیٰ کفار کو کیسی رسوا کن سزا دیتا ہے۔

۲- آج بھی اعدائے اسلام مسلمانوں کو ان کے دفاعی مسائل سے غافل رکھ کر ان کے خلاف خفیہ فوجی تیاریوں میں لگے رہتے ہیں - جنگ بندی لائنوں پر بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مسلمانوں کو بے خبری میں نقصان پہنچانے کی کوشش ہوتی ہی رہتی ہیں - مسلمانوں کو، خصوصاً اسلامی ریاستوں کو اپنے علاقوں کے اندر اقامت صلوٰۃ اور احکامِ الٰہی کے نفاذ کے ساتھ ساتھ اپنے دفاعی انتظامات سے لمحہ بھر کے لیے غافل نہیں ہونا چاہیے۔

فاذا قضیتم الصّلوٰة فاذکروا الله قیماً وّ قعودا وّ علیٰ جنوبکم(النساء/ ۱۰۳)

۱- اس قسم کی ہنگامی نماز میں تخفیف و آسانی کے ان احکام کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ذکر الٰہی میں بھی کمی کی اجازت ہے۔ سفر ہو یا جنگ ذکر الٰہی دل سے تو ہر وقت اور ہر صورت میں جاری رکھا جا سکتا ہے۔

۲- نمازِ خوف میں "ادائے فرض" تو ہو جاتا ہے "باضابطہ ذکر الٰہی" میں کمی ضرور

Marfat.com

واقع ہوتی ہے اس لیے اس کی تلافی یہ ہے کہ نماز پڑھ چکنے کے بعد اٹھتے بیٹھتے ' چلتے پھرتے حتیٰ کہ گرتے یا لیٹتے وقت بھی دل اور زبان سے اللہ کا ذکر جاری رکھو(۱)۔

۳- صرف نماز کی صورت میں اور نماز کے وقت ہی نہیں بلکہ ہر وقت اللہ کے احکام پیش نظر رکھو۔ اور ان احکام کا اتباع کرتے رہو۔

فاذا اطمانِنتم فاقیموا الصلوٰة ان الصلوٰة كانت على المؤمنين كتٰبا مّوقوتا ۔(النساء/۱۰۳)۔

ہنگامی حالات میں تو نماز کا تخفیف کے ساتھ ادا کر دینا - بھی کافی ہے مگر جب خوف ' سفر یا جنگ کی حالت نہ رہے تو پھر نماز کو اس کی پوری شرائط کے ساتھ اور اصل قاعدے کے مطابق ادا کرو - اہل ایمان کو دونوں طرح نماز کا پابند کیا گیا ہے اول تو نماز کا پڑھنا بھی ضروری اور واجب ہے دوسرے اس نماز کے لیے جو اوقات مقرر کر دیے گئے ہیں ان اوقات میں ہی پڑھنا ضروری ہے ۔ افسوس ہے کہ ہم نے آج کل نماز کو "موقوت" سمجھنے کی بجائے اسے سرے سے "موقوف" ہی کر رکھا ہے۔

۴- ہنگامی حالات کے لیے "اداء نماز (قضیتم) اور حالتِ اطمینان میں "اقامتِ نماز" (فاقیموا)کے حکم سے یہ بات بھی معلوم ہوئی ہے کہ قرآنی اصطلاح "اقامت صلوۃ" کا مطلب یہ ہے کہ نماز کو اس کی جملہ شرائط ظاہری و باطنی کے ساتھ ادا کیا جائے۔

۱- قرآن کریم میں ذکر الہٰی کے احکام بکثرت ہیں اور ذکر میں ' اللہ کی نعمتوں اور اس کے حکموں کو یاد رکھنے کے علاوہ اس کے نام کا ذکر بھی شامل ہے۔ ذکر زبان سے بھی ہو سکتا ہے اور دل سے بھی۔ مگر بہترین ذکر وہی ہے جس میں دل و زبان دونوں شامل ہوں۔

Marfat.com

تدبّرِ قرآن

سورۃ النساء کی آیات ۸۲ ' ۸۳ میں نفاق کے ایک اور پہلو ' یعنی بزدلانہ اور غیر ذمہ دارانہ افواہیں پھیلانے کی عادت ' پر تبصرہ کرتے ہوئے ملی حیاتِ اجتماعی کے بارے میں ایک نہایت اہم نصیحت کی گئی ہے۔

أفلا یتدبّرون القرآن : النساء/۸۲- (۱) اگر یہ منافق قرآن کریم کی تعلیمات اور اس کی آیات کے مضمرات پر غور و فکر کرتے تو ان کے وہ شبہات دور ہو جاتے جو نفاق کا باعث تھے۔

۲- قرآن کریم کو صرف کلام الٰہی مان لینے سے ' جیسا کہ ظاہراً منافق بھی اقرار کرتے تھے ' وہ پختگیٔ ایمان پیدا نہیں ہو سکتی جو اس کے احکام پر غور و فکر اور تدبّر سے حاصل ہوتی ہے۔ قرآن کی لفظی و معنوی خوبیوں سے آگاہ ہونے اور اس کی برکتوں سے بہرہ مند ہونے کے لیے اس میں غور و فکر ضروری ہے۔ تدبر قرآن ایک طرح سے مکاشفۂ الٰہی ہے۔ قرآن کے مطالب میں صحیح تدبر کرنے سے آدمی پراسرار قرآن کھلتے ہیں۔ قرآن اس کے رگ و پے میں سرایت کرتا چلا جاتا ہے۔ یہی انوارِ معرفت ہیں اور یہی تجلّیات ربانی ۔

۳- قرآن حکیم نے ' کائنات میں تفکر کی طرح خود قرآن کی آیات پر تدبر اور غور و فکر کا حکم متعدد مقامات پر دیا ہے(۱)۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ زیادہ تر بیانِ نفاق و منافقین کے سلسلے میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے اور تدبّر قرآن کو کفر و نفاق کے لیے ایک تریاق بیان کیا گیا ہے۔

۱- مثلاً المؤمنون : ۶۸ ' ص : ۲۹ ' محمد : ۲۴

Marfat.com

۴- قرآن کریم میں تدبّر کی یہ دعوت مسلمان اور کافر سب کے لیے ہے۔ یہ قرآن کا ایک عقلی چیلنج ہے جو اس کی صداقت پر قطعی دلیل بھی ہے۔

۵- قرآنِ کریم میں تدبّر کی یہ دعوت مسلمان اور کافر سب کے لیے ہے۔ یہ قرآن کا ایک عقلی چیلنج ہے جو اس کی صداقت پر قطعی دلیل بھی ہے۔

ولو كان من عند غير الله لوجدوا فيه اختلافاً كثيرا :(النساء/۸۲)۔

۱- اس طرح اس انداز میں اور اس نقطہ نظر سے غور و فکر کے بعد انہیں قرآن کے من جانب اللہ ہونے میں کوئی شک نہ رہ جاتا۔

۲- منافقوں کی اس دو رخی کے ذکر کے بعد - کہ سامنے کچھ پیٹھ پیچھے کچھ تھے، دن کو کچھ کہتے اور رات کو کچھ کرتے تھے۔ اس دو رنگی کے ذکر کے فوراً بعد (۱) قرآنِ کریم کے کلام الٰہی ہونے پر اس چیلنج اور اس دعوتِ غور و فکر کی مناسبت یہ ہے کہ منافقوں کی اس روش کا باعث ہی یہ تھا کہ در اصل انہیں دل سے اس بات کا یقین ہی نہیں تھا کہ رسولؐ پر واقعی وحی آتی ہے، اور یہ حقیقتاً کلام الٰہی ہے صاف ظاہر ہے اس عقیدے کے بعد قرآن کے اطاعتِ رسولؐ سے متعلق احکام (جو اس سورت میں بھی اوپر مسلسل بیان ہوئے ہیں) کے بارے ان کی رائے کیا ہو سکتی تھی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول تسلیم کرنا اور قرآن کو ایک بشری تالیف (ہر چند کہ بلند مرتبہ ہی سہی) بھی قرار دینا (جیسا کہ بعض "روشن خیال" مرتدین عظام اور اسلام سے بے "نیاز" مگر مسلمان کہلانے پر اصرار کرنے والے بعض شاعر اور انشاء "نگار" حضرات اب بھی سمجھتے ہیں) غالباً نفاق کا وہ مرتبہ ہے جس پر "کئی کفر" قربان کیے جا سکتے ہیں۔

۳- قرآن مجید میں الحمد سے لے کر والناس تک ایسی یکسانیت وہم آہنگی، اتنا تناسب و تناسق اور ایک ایسا توازن و اعتدال پایا جاتا ہے جو خود اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ یہ خدا کے سوا کسی اور کا کلام نہیں ہو سکتا۔ پھر اس یکساں روی ویک رنگی میں

۱- دیکھیے سورۃ النساء/۸۱

Marfat.com

بڑی وسعت اور جامعیت ہے۔ ادب و بلاغت اور زبان و اسلوب کے لحاظ سے دیکھو تو متنوع مضامین اور مختلف موضوعات کے باوجود کسی جگہ قرآن کے معیارِ فصاحت، شیرینیٔ زبان اور عبارت کی بندش و ترکیب میں فرق نہیں آنے پاتا - مضامین و تعلیمات کے پہلو سے غور کرو تو کہیں فکر میں کوئی تبدیلی، آراء میں کوئی تصادم اور نظریات میں کوئی تناقض و تضاد نہیں - بلکہ ایک ہی بنیادی فکر اور ایک ہی کلی اصول ہے جو ہر حکم، ہر نصیحت، ہر قصے اور ہر جزئی تفصیل میں جھلکتا نظر آتا ہے۔

۴- اس آیت میں قرآن عزیز نے ساری دنیا کے سامنے اور ہمیشہ کے لئے اپنی یکتائی کا چیلنج پیش کیا ہے۔ کہ ہر طرح ٹھونک بجا کر دیکھ لو کسی پہلو اور کسی رخ سے جانچ پڑتال کر لو کہیں کوئی ناہمواری یا کمی اور کوتاہی اس میں نہیں پاؤ گے۔ معنوی اور صوری کسی طرح کی بے ہم آہنگی اور جھول جھال اس میں نہیں ملے گی۔ تقریباً ایک چوتھائی صدی کے طویل عرصے میں مختلف حالات، مختلف مواقع اور مختلف مسائل پر پیش کیے ہوئے اس کلام میں اتنا گہرا فکری ربط اور معنوی تسلسل قائم رکھنا ہر گز ایک بشر کے اختیار کی چیز نہیں ہے۔ قرآن کا کلام اللہ ہونا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعووں میں سے ایک دعویٰ بھی ہے اور حضورؐ کے دعووں کی صداقت کی ایک دلیل بھی۔

۵- مگر قرآن کریم کی صداقت اور اس میں پیش کردہ صداقتوں کا صحیح علم تدبر سے حاصل ہو گا۔ تدبر یعنی عمیق غوروفکر اور گہرے مطالعہ کے بغیر محض سطحی قرآن فہمی تو الٹا خطرۂ ایمان ثابت ہو سکتی ہے - قرآن کی بات سمجھنے کی بجائے اپنی بات کی تائید کے لیے قرآن سے کچھ نہ کچھ ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کرنا تدبر قرآن نہیں تمسخر قرآن ہے۔

۶- تدبر قرآن کا تقاضا ہے کہ قرآن فہمی کے سارے اسباب جمع کیے جائیں۔ مسلمانوں نے اسی تدبر قرآن کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے عربی لغت و نحو اور حدیث و تفسیر پر بیش بہا کتابیں لکھیں، جو ہمارا بہترین تہذیبی، دینی اور علمی ورثہ ہیں- تعجب ہے ان لوگوں پر

Marfat.com

جو ناظرہ قرآن بھی درست نہیں پڑھ سکتے مگر اس سارے "ذخیرۂ تدبر قرآن" سے بے نیاز ہو کر قرآن کے من مانے مفہوم نکالنے کی "تدبیریں" کرتے ہیں۔

وإذا جآء هم أمر مّن الأمن أو الخوف أذاعوا به:(النساء/ ۸۳)۔

۱- منافقوں اور کمزور ایمان کے مسلمانوں کی ایک غیر ذمہ دارانہ اور حالات کے لحاظ سے خطرناک ' عادت یہ تھی کہ وہ افواہوں کو "دلچسپی" سے سنتے اور "تندہی" سے پھیلاتے تھے۔ دشمن کے متعلق کوئی اطمینان بخش خبر سنتے (جو بعض دفعہ مسلمانوں کو غفلت میں رکھنے کے لیے دشمن کی چال ہوتی تھی) تو - اور اگر مسلمانوں کی کسی ہزیمت' یا دشمن سے کسی خطرے ' کی کوئی بے بنیاد اطلاع پاتے (جس سے بعض دفعہ دشمن کا مقصد مسلمانوں میں خوف و دہشت پھیلانا ہوتا تھا) تو - یہ لوگ تحقیقات کے بغیر یا نتائج پر غور کیے بغیر اس خبر کو آناً فاناً پھیلا دیتے تھے۔

۲- جیسا کہ پہلے سورت کے تعارف میں بیان ہو چکا ہے - یہ زمانہ (جنگ احد کے بعد) مسلمانوں کے لیے بڑا ہنگامی زمانہ تھا۔ اسلام اور کفر کا معرکہ نہایت اہم مرحلے میں پہنچ چکا تھا - اعصابی جنگ اور اشتہاری حربوں یعنی(Propaganda) سے کام لینا کچھ عصر حاضر کی خصوصیات ہی نہیں - چالاک دشمن مدینہ کو ' افواہوں کے ذریعے ' کبھی خوف و دہشت اور کبھی غفلت و بے فکری میں مبتلا رکھنا چاہتا تھا۔ اسی طرح غیر ذمہ دارانہ طریقے پر بات کو مشہور کرنے میں بعض دفعہ اپنے قیمتی راز بھی دشمن تک پہنچ سکتے تھے۔ اور بعض دفعہ اپنی ہی بعض اندرونی "خبروں" کی غلط تشہیر سے سوسائٹی کے امن و چین کو خواہ مخواہ نشانۂ اضطراب بنا دیا جاتا تھا(۱)۔ ان حالات میں عسکری اور اجتماعی تقاضوں کے پیش نظر یہ تنبیہ کی گئی اور محض صحافیانہ انداز میں اور ہنگامہ پسندی کی خاطر ہر طرح کی خبریں پھیلانے پر ملامت کی گئی۔

۱- آیت کے شانِ نزول میں یہ واقعہ بھی بیان ہوا ہے کہ ایک دفعہ کسی غلط فہمی سے مدینے میں یہ خبر پھیل گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سب بیویوں کو طلاق دے دی ہے اس خبر نے تمام اہل ایمان کو پریشان کر دیا۔ آخر حضرت عمرؓ نے حقیقت حال معلوم کر کے بآواز بلند اس افواہ کی تردید کی اور لوگوں کو اطمینان ہوا۔

Marfat.com

ولو ردّوہ الی الرّسول وإلیٰ اولی الامر منهم لعلمہ الّذین یستنبطونہ منهم :—

۱- ان حالات میں ان منافقوں یا کمزور ایمان کے مسلمانوں کے لیے بہترین طریق کار یہ تھا کہ اس قسم کی کوئی اطلاع ملنے پر اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یا (حضورؐ کی غیر حاضری میں) ذمہ دار صحابہ تک بات پہنچا کر خاموش ہو جاتے - یہ کام پھر ان اصحابِ امر کا تھا کہ وہ اس بات کی تحقیق کر لیتے کہ خبر صحیح ہے یا غلط اور اگر صحیح بھی ہے تو اس کی فوری اشاعت کس حد تک قرینِ مصلحت ہے؟

۲- آیت میں عموم کے اعتبار سے ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کو یہ نصیحت ہے کہ عام حالات میں بھی اور خصوصاً ہنگامی حالات میں افواہوں کے سننے اور پھیلانے سے پرہیز کریں۔ بلکہ اگر کوئی ایسی بات ہو بھی تو اسے اپنے اہل حل و عقد اور ذمہ دار و با اختیار لوگوں تک پہنچا دیں۔ (اولی الامر سے مراد، آیت ۵۹ کی طرح، یہاں بھی علماء اور امراء دونوں ہو سکتے ہیں)۔

۳- ملت کے عام افراد کو بھی چاہیے کہ وہ ایک سنجیدہ اندازِ فکر اختیار کریں۔ ہنگامہ پسندی، سنسنی خیزی، سستی شہرت اور محض اخبار فروشانہ ذہنیت سے پرہیز کریں۔ اس کے برعکس انہیں اپنے اندر ملی مسائل کا شعور اور ہنگامی حالات میں دینی اور اسلامی مفاد کو اپنی کم تر درجے کی دلچسپیوں پر ترجیح دینے کی عادت، پیدا کرنی چاہیے۔

۴- آیت میں بالواسطہ یہ بھی اشارہ ہے کہ ملت کے سیاسی امور کی نگرانی اور زمامِ کار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہونی چاہیے جو بہتر ذہنی استعداد کے ساتھ ساتھ استنباط مسائل اور ملی و دینی امور میں مرتبۂ تحقیق رکھتے ہوں۔ ہر فردِ امت اس نعمت سے بہرہ ور نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی ہر "صاحب امر" اس صلاحیت کا مالک ہو سکتا ہے۔ یہ بات آیت میں دو دفعہ لفظ منهم کے آنے سے نکلتی ہے۔ پہلے منهم کا مطلب یہ ہے کہ ایسے معاملات صرف "اپنے" مسلمان اولی الامر کے نوٹس میں لاؤ۔ دوسرے منهم کا ظاہر مطلب یہ ہے کہ ان اولی الامر میں سے جو اصحابِ استنباط ہوں گے وہ بات کی حقیقت پا لیں گے۔

Marfat.com

۵- چونکہ آیت میں ملت کے سیاسی مفادات کے تحفظ اور دشمنان اسلام کے مقابلے پر مؤثر فوجی و سیاسی مفادات کے تحفظ اور دشمنان اسلام کے مقابلے پر موثر فوجی و سیاسی پالیسی، اختیار کرنے کا ذکر ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ یہ کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اسلامی حکومت کے سربراہ اولی الامر کی حیثیت سے ہمیشہ سرانجام دیتے رہیں گے - اس آیت اور اس قسم کی دوسری آیتوں سے ہی منکرینِ سنت نے منصبِ رسالت اور منصبِ امارت کو خلط مبحث (Confuse) کر کے یہ فاسد عقیدہ نکالا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اسلامی ممالک کی مرکزی حکومت کو ہر لحاظ سے "رسولؐ کا درجہ حاصل ہے اور وہ دنیوی و سیاسی امور میں ہی بااختیار نہیں بلکہ خالص دینی امور مثلاً نماز کے اوقات و تعداد، روزوں کی مدّت اور حج کی تاریخیں وغیرہ بھی بدل سکنے کے مجاز ہیں - حالانکہ قرآنِ کریم کی رو سے یہ اولی الامر خود اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے پابند ہیں -

۶- آیت سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت میں کوئی آدمی وحی والہام کی بناء پر اور معصوم عن الخطاء ہونے کے دعوی کے ساتھ ملت کے امور میں حکم نہیں دے سکتا۔ تمام نئے مسائل (جن کے بارے میں کوئی نص موجود نہیں) استنباط و اجتہاد سے حاصل کیے جائیں گے اور یہ استنباط ایک مشروط شرعی حجت ہو گا۔

ولو لا فضل الله عليكم ورحمته لا تّبعتم الشّيطن إلّا قليلا :(النساء/۸۳)-

۱- یہ محض خدا کی مہربانی اور عنایت ہے کہ اے مسلمانوں ! تمہارے اندر ایک دینی و ملی شعور پیدا ہو گیا ہے اور تمہاری اکثریت اس قسم کی افواہوں کے سننے اور پھیلانے سے پرہیز کرتی ہے۔ ورنہ ایسی انسانی کمزوری اتنا دلکش شیطانی پھندا ہے کہ تم میں سے بہت کم ہی اس سے بچ سکتے۔

۲- یہ بھی خدا کا فضل و کرم ہی ہے کہ اس نے اپنا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تم میں مبعوث کر کے تمہیں راہِ ہدایت دکھا دی ورنہ تم میں سے معدودے چند ایک کے

Marfat.com

سوا سب شیطان کی پیروی میں لگے ہوتے۔

۳۔ آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ برائی اور بدی سے بچنے کی توفیق محض اللہ کے فضل و کرم سے حاصل ہوتی ہے۔ ورنہ اتباعِ شیطان کی اتنی مختلف صورتیں اور ایسے ایسے غیر شعوری طریقے ہیں کہ بہت کم لوگ اس سے بچ سکتے ہیں۔

☆☆☆

Marfat.com

سورہ محمدؐ

تعارف

اس سورت کا نام محمدؐ ہے ۔ کیونکہ حضور حضور علیہ الصلواۃ والسلام کا اسم گرامی محمدؐ اس سورت کی دوسری آیت میں آیا ہے۔ اس میں چار رکوع اور ۳۸ آیات ہیں طبرانی نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام نماز مغرب میں یہ سورت پڑھتے تھے ۔ قرآن مجید کی سورتوں کے نام خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے منقول ہیں ۔ بعض سورتوں کے ایک سے زائد نام بھی آپ سے مروی ہیں ۔ خود اس سورت کا دوسرا نام قتال بھی آیا ہے ۔ یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ بالعموم قرآن مجید کی سورتوں کے نام ایسے عنوان (Heading) نہیں کہ ہر سورت کے تمام مضامین اس عنوان سے مترشح ہوتے ہوں۔ اکثر وہ نام اسی سورت کا کوئی لفظ ہوتا ہے۔ ہرسورت کا جدا نام رکھنے کی غرض غالباً اسے دوسری سورتوں سے متمیز کرنا ہی ہے ۔

سورت کا زمانۂ نزول اور تاریخی پس منظر

یہ سورت ہجرت کے بعد مدینے میں نازل ہوئی اگرچہ صحت تعین کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تاریخ نزول کیا ہے ۔ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ اس سورت کی تیرھویں آیت و کاین من قریۃٍ ... مکی ہے ۔

۱- ہجرت کے بعد جہاں مسلمانوں کو کفار کی اذیتوں سے نجات ملی ۔ وہاں کچھ نئی دشواریاں بھی ابھرنے لگیں ۔ کفار نے جب دیکھا کہ مسلمان ان کے چنگل سے یکسر نکل گئے ہیں اور آزاد فضا میں پنپ رہے ہیں تو وہ اسے برداشت نہ کر سکے اور مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے پر تُل گئے ۔ جنگ بدر ' احد اور خندق کا باعث کفار کا جارحانہ اقدام ہی تھا ۔

Marfat.com

ان حالات میں یہ ناگزیر ہو گیا کہ مسلمان اپنی ملی انفرادیت (National Individuality) کے تحفظ اور بقا کے لئے اپنی ساری قوتیں اور پورا سرمایۂ زندگی کھپا دینے کے لئے تیار ہو جائیں اور جس فوجی طاقت کے بل بوتے پر دشمن اپنے ناپاک منصوبوں کی تکمیل چاہتا تھا۔ اس فوجی طاقت ہی کو مضمحل کر دیا جائے۔ جہاد کا حکم وقت کا تقاضا تھا۔

جنگ بدر سے لے کر جنگ تبوک ۲-۹ھ تک کے زمانہ میں جتنی سورتیں نازل ہوئیں ۔ ان میں سے اکثر میں جہاد کے احکام موجود ہیں - یہ سورت بھی اسی دور کی سورتوں میں سے ہے ۔ اس میں جہاد کا مقصد ' اس کی اہمیت اس کی دشواریاں اور اس کے نتائج مذکور ہیں ۔

۲- مدنی زندگی میں کفار کے بیرونی حملوں کے علاوہ مسلمانوں کے لئے ایک اندورنی خطرہ بھی پیدا ہو گیا تھا اور یہ خطرہ منافقوں سے تھا ۔ مدینے کے کچھ عیار لوگ' قریش مکہ اور مسلمانوں کے اس تصادم میں کھلم کھلا کسی ایک فریق کا ساتھ دینے کو ابلہی اور نادانی سمجھتے تھے ۔ بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ اپنی وفاداریوں کو بدلتے رہنا ان کے ہاں دانشمندی تھی ۔ کچھ ایسی بات نہ تھی کہ وہ غیر جانبدار ہوں ۔ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف بغض و عداوت ضرور تھی ۔ بظاہر انہیں کفار مکہ کی کامیابی کے امکانات روشن تر نظر آ رہے تھے ۔ مگر مسلمانوں کو بہادری کے جوہر بھی وہ جنگ بدر میں دیکھ چکے تھے ۔ گو مسلمان بے سر و سامان تھے۔ مگر ان کے بھی غالب آجانے کے امکانات بالکل موہوم نہ تھے۔

ان منافقوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو بارہا سخت پریشان ہونا پڑا ۔ اس لئے منافقوں کے خصائص ' عادات اور اطوار مدنی سورتوں کا ایک اہم موضوع ہے ۔ مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس اندرونی خطرے سے آگاہ کیا جائے اور ساتھ ہی خود ان منافقوں کو ان کی اس دورخی کے نقصانات بتا کر اصلاح کی کوشش کی جائے ۔ اس سورت کا ایک موضوع سخن یہ بھی ہے ۔

Marfat.com

سورت کا اجمالی خاکہ

۱- سورت کے شروع میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ زندگی بسر کرنے کی راہیں دو ہی ہیں (۱) حق (۲) باطل۔

۲- حق کی راہ وہی ہے جو اللہ نے انبیاء کرام کے ذریعے سے انسانوں پر واضح کی اور جس کی جامع اور مکمل صورت حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے ہمیں بتائی۔

۳- اس راہ سے ہٹ کر جو راہ بھی اختیار کی جائے وہ باطل کی راہ ہے اور اس کا منبع ہوا و ہوس ہے۔

۴- سورت میں تین گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے:- (۱) اہل ایمان ' جنہوں نے مکمل اسلام خلوص کے ساتھ اختیار کیا -(۲) کفار جنہوں نے برملا اس سے انکار کیا اور دوسروں کو بھی اس راہ سے روکا- (۳) منافق ' جنہوں نے بظاہر اسلام قبول کیا مگر خلوص دل سے نہیں محض مصلحتاً۔

ان میں سے ہر ایک گروہ سے متعلق اس سورت میں جو باتیں کہی گئی ہیں۔

ان کا خلاصہ یہ ہے۔

اہل ایمان (بیشتر خطاب کیا گیا ہے)

۱- انبیاء کی تعلیم پر ایمان لانے کے بعد اپنے عمل بھی سنوارو کہ نیک عمل برائیوں کا کفارہ ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ' کی اطاعت کرو۔ تاکہ تمہاری سعی و عمل بار آور ہو۔

۲- تمہیں ضرور آزمائش کی بھٹی میں ڈالا جائے گا۔ تاکہ مجاہدوں اور صبر کرنے والوں کی پرکھ کی جا سکے۔

۳- خدا کی راہ میں اپنے مال خرچ کرنے میں پیش و پس نہ کرو۔

۴- سچے ایمان والے تو اللہ کی راہ میں مال لٹانے اور جان دینے کی تمنائیں کرتے ہیں۔

۵- تم یقین رکھو کہ اللہ تمہارا حافظ و ناصر اور مربی و کارساز ہے وہ تمہیں صبر و استقامت کی توفیق بخشے گا۔ تم پر ہدایت و تقوی کی راہیں کھولے گا اور دشمن

Marfat.com

پر غلبہ و استیلاء بخشے گا۔

۶- اگر تم اس کی راہ میں مارے گئے تو یہ اس (غلبہ) سے بھی بڑھ کر کامرانی ہے

۷- پس جب باطل سے ٹکر ہو تو جم کر لڑو اور دشمن کو اس طرح کچل دو کہ اس میں پھر تمہارے مقابلے پر آنے کی سکت نہ رہے۔ جنگی قیدیوں کو مناسب ہو تو احسان رکھ کر چھوڑ دو اور مناسب ہو تو فدیہ لے کر۔

۸- تم ہی غالب اور سر بلند ہو، بودے مت بنو۔ ایسی صلح نہ کرو جس میں دین کی رسوائی ہو۔

کفار

۱- کفر کی راہ باطل کی راہ ہے۔ یہ نفسانی خواہشات کی اندھی پیروی ہے۔ ناعاقبت اندیشی اور کوتہ نظری ہے۔

۲- گذشتہ اقوام کی تاریخ شاہد ہے کہ کفر اپنی تمام قوتوں اور سطوتوں کے باوجود حق کے سامنے بالآخر سرنگوں ہوتا ہے اور دونوں جہانوں کی ذلت و رسوائی اور تباہی و بربادی اس کے حصہ میں آتی ہے۔

منافق

۱- منافق دین کی باتیں ہمیشہ از راہ تفنن سنتے ہیں۔ وہ سنجیدگی سے اس پر کبھی غور نہیں کرتے۔

۲- امن کے زمانے میں تو یہ لوگ خوب چکنی چپڑی باتیں کرتے ہیں مگر جہاد کا حکم ان کے نفاق کی قلعی کھول دیتا ہے۔

۳- ان سے کچھ بعید نہیں کہ موقع ملنے پر فساد پھیلائیں۔ ہر عہد و پیمان توڑ ڈالیں اور ہر رشتے رابطے سے دستبردار ہو جائیں۔

۴- وہ درپردہ دشمنان دین سے ساز باز میں لگے رہتے ہیں۔

۵- ان کی منافقت ان کے انداز گفتگو سے بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔

۶- ان کا انجام بھی کفار سے کچھ مختلف نہیں ... وہی دو جہانوں کی ذلتیں اور رسوائیاں۔

Marfat.com

سورۃ الفتح

تعارف

اس سورت کا نام الفتح ہے ۔ اس لئے کہ اس کا آغاز ہی صلح حدیبیہ کی " فتح مبین " کے ذکر سے ہوا ہے اور آگے چل کر بھی جا بجا عظیم الشان فتوحات اور غلبہ دین کی خوشخبریاں دی گئی ہیں ۔ اس سورت میں چار رکوع اور انتیس آیتیں ہیں ۔

سورت کا زمانہ نزول اور تاریخی پس منظر

یہ سورت ٦ھ میں سفر حدیبیہ سے لوٹتے وقت راستے میں نازل ہوئی ۔ یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام ٦ھ میں ذی القعدہ کی پہلی تاریخ کو اس سفر پر روانہ ہوئے تھے آپ کا قیام حدیبیہ میں کچھ اوپر دس دن رہا ۔ گویا ذی القعدہ ٦ھ کی آخری تاریخوں کو اس سورت کا زمانہ نزول قرار دیا جا سکتا ہے۔ گو یہ سورت مکے سے مدینے کی طرف سفر کے دوران میں نازل ہوئی لیکن اسے مدنی سورتوں ہی میں شمار کیا جاتا ہے ۔ اس لئے کہ قرآن مجید کا جو حصہ ہجرت کے بعد نازل ہوا اصطلاحاً مدنی کہلاتا ہے۔

اس سورت کی آیات میں جابجا بعض واقعات کی طرف اشارہ ہے ۔ پس سورت کا پس منظر سمجھنے کے لئے ناگزیر ہے کہ پہلے ان واقعات کو قلمبند کیا جائے ۔

۱- ہجرت کے بعد سے کفار مکہ نے مسلمانوں کو زیارت کعبہ سے محروم کر دیا تھا۔ گو عربوں کے ہاں یہ دستور چلا آتا تھا کہ " اشہر حرم " میں تمام قبائل کے لوگوں کو (باہمی عداوتوں اور جنگوں کے باوجود) مکے میں آنے کی اجازت ہوتی تھی اور ان کی جان اور مال بھی محفوظ ہوتا تھا- لیکن کعبہ کے یہ اجارہ دار قریش غریب مسلمانوں کے لئے اس بات کے بھی روا دار نہ تھے ۔

Marfat.com

جوں جوں دن گزرتے گئے بیت اللہ کی محبت اور اس کی زیارت کا شوق صحابہ کے جی میں تیز تر ہوتا گیا۔

سفر حدیبیہ کے کچھ دن پہلے حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے مدینہ میں خواب دیکھا کہ آپ صحابہؓ کے ہمراہ حرم کعبہ میں امن سے گئے ہیں۔ ارکان عمرہ باطمینان بجا لا رہے ہیں۔ بعض سر منڈا رہے ہیں' بعض بال کتروا رہے ہیں اور کسی کا کچھ خوف و خطر نہیں۔ آپ نے یہ خواب بعض لوگوں سے بیان بھی فرما دیا تھا۔ گو آپ نے وقت کی تعیین نہیں فرمائی تھی۔ مگر شدت اشتیاق سے اکثر صحابہؓ کو یہی خیال ہوا کہ اسی سال عمرہ کی توفیق ہو گی۔ اتفاقاً خواب کے بعد آپ کا عمرہ کرنے کا قصد بھی ہو گیا۔

۲- جب آپ مکہ روانہ ہوئے تو آپ کو خدشہ تھا کہ قریش مزاحمت نہ کریں۔ آپ نے ایک جم غفیر کی معیت میں جانا قرین مصلحت سمجھا۔ آپ نے نہ صرف مدینہ بلکہ مدینے کے مضافات میں بھی اعلان کرا دیا کہ مسلمانوں کو عمرہ کے لئے آپ کے ہمراہ چلنا چاہیے۔ چند قبائل غفار- مزینہ - جہنیہ - اشجع وغیرہ نے جو بظاہر مسلمان تھے آپ کے ساتھ چلنے سے جی چرایا۔ اور آپس میں کہنے لگے کہ یہ لوگ قریش مکہ کے ہاتھوں بچ کر نہیں آئیں گے۔

۳- آپ تقریباً ڈیڑھ ہزار آدمیوں کے ہمراہ مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ آپ نے احرام باندھا اور قربانی کے جانور بھی ساتھ لئے اور اس ہئیت میں آپ کے سفر سے یہ بات بالکل واضح تھی کہ آپ کا مقصد لڑائی نہیں بلکہ محض بیت اللہ کی زیارت تھا۔ یہ خبر مکہ پہنچی تو قریش گھبرائے۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ مسلمان چاہے محض عمرہ ہی کی غرض سے آئے ہوں' مکے میں ان کے داخل ہونے سے ہمارا وقار قبائل عرب میں اٹھ جائے گا۔ قریش نے مکے کے آس پاس پہاڑیوں پر کئی فوجی دستے بٹھائے اور ان سے کہا کہ تم گھات میں رہو اور جب مسلمان یہاں سے گزریں تو اچانک ان پر دھاوا بول دو۔"

حضور علیہ الصلوۃ والسلام کو بھی راستے ہی میں قریش کی تدبیروں کی خبر ہو گئی تھی - چونکہ آپ کا قریش سے الجھنے کا کوئی ارادہ نہ تھا' اس لئے آپ نے عام راستہ

Marfat.com

چھوڑ کر ایک غیر معروف راستہ اختیار کر لیا ۔ جب آپ حدیبیہ (۱) کے میدان میں پہنچے جو مکے سے قریب ہی ہے تو آپ کی اونٹنی ایک جگہ بیٹھ گئی اور باوجود کوشش کے وہ اٹھتی نہ تھی ۔ آپ نے فرمایا حبسها حابس الفیل (ابرہہ کے ہاتھیوں کو روکنے والے نے اسے بھی روک دیا) اور اپنے ساتھیوں کو اسی کشادہ میدان میں خیمے گاڑنے کا حکم دے دیا ۔

۴- قریش کے گھات میں بیٹھے ہوئے آدمیوں نے جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں نے ان کی زد میں آنے سے پہلے ہی پڑاؤ ڈال دیا ہے تو انہوں نے مکہ واپس جا کر رؤساء قریش کو اس صورت حال کی خبر دی۔

اب قریش مکہ نے پے در پے کئی اشخاص مسلمانوں کی طرف بھیجے کہ ان کے آنے کا صحیح مقصد معلوم کریں اور اگر وہ محض زیارت کعبہ ہی کی غرض سے آئے ہوں پھر بھی انہیں ڈرا دھمکا کر لوٹا دیا جائے ۔ تاکہ مکہ میں مسلمانوں کے داخل ہونے سے قریش کی عزت کو بٹہ نہ لگے ۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان لوگوں کو وضاحت سے بتا دیا کہ ہم لڑنے نہیں آئے - ہمیں شہر میں آنے دو' عمرہ کر کے چلے جائیں گے ۔ مگر قریش اجازت دینے پر آمادہ نہ ہوئے ۔

۵- گفت و شنید کے دوران میں قریش نے پچاس کے قریب اشخاص بھیجے کہ وہ مسلمانوں پر شب خون ماریں ۔ یہ لوگ جبل تنعیم کی طرف سے آکر مسلمانوں پر حملہ کرنا چاہتے ہی تھے کہ صحابہ کی ایک جماعت نے انہیں گھیر لیا اور سب کو گرفتار کر کے حضور کی خدمت میں پیش کیا ۔ آپ نے ان کو رہا کر دیا اور فرمایا " جاؤ قریش سے کہہ

۱- حدیبیہ مکے سے شمال مغرب کی سمت تقریباً ۱۵ میل کے فاصلے پر واقع ہے ۔ اس زمانے میں یہاں اس نام کا ایک کنواں تھا ۔ جس کی وجہ سے آس پاس کی آبادی اور میدانی علاقے کو حدیبیہ کہتے تھے ۔ آج کل اسے الشمیسی کہتے ہیں اور یہ جدہ سے مکہ آنے والی سڑک پر واقع ہے ۔ یہاں سے ایک میل کے فاصلے پر حرم کی حد شروع ہو جاتی ہے۔

Marfat.com

دو کہ ہم یہاں خونریزی کے لئے نہیں آئے ہیں"۔ مگر ان لوگوں نے واپس جا کر اپنی گرفتاری اور رہائی کا واقعہ بیان ہی نہیں کیا۔

۶۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے یہی پیغام دے کر حضرت عثمانؓ کو بھیجا۔ انہیں بھیجنے کی وجہ یہ تھی کہ اموی ہونے کی وجہ سے انہیں اہل مکہ کے ہاتھوں گزند پہنچنے کا احتمال نہ تھا۔ حضرت عثمانؓ اپنے چچا زاد بھائی اَبان بن سعید کے گھر گئے اور قریش کو بات سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر انہوں نے ایک نہ مانی اور مسلمانوں کو عمرے کی اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا۔ البتہ حضرت عثمانؓ سے یہ کہا" آپ چاہیں تو اکیلے طواف کر لیں"۔ حضرت عثمانؓ نے حضور علیہ الصلوۃ والسلام اور مسلمانوں کے بغیر طواف کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر قریش نے انہیں واپس جانے سے روک لیا' مگر مکہ میں یہ بات پھیل گئی کہ عثمانؓ کو قتل کر دیا گیا ہے۔

۷۔ یہ افواہ مسلمانوں تک بھی پہنچی' حالات مخدوش ہو گئے اور لڑائی کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس وقت حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہؓ سے جہاد کی بیعت لی۔ یہی بیعت " بیعت الرضوان " کہلاتی ہے۔

۸۔ جب قریش نے اس بیعت کی خبر سنی تو وہ خوف زدہ ہوئے اور سہیل بن عمرو کو مصالحت کی غرض سے آپ کے پاس بھیجا اور اسے یہ تاکید کر دی کہ یہ بات ضرور منوانا ہو گی کہ مسلمان اس سال عمرہ نہ کریں تاکہ قبائل عرب کے سامنے ہمارا بھرم رہ جائے۔

سہیل نے آکر بتایا کہ حضرت عثمانؓ زندہ ہیں انہیں قتل نہیں کیا گیا اور قریش آپ سے مصالحت پر آمادہ ہیں۔ باہم گفتگو کے بعد ان شرائط پر قریش اور مسلمانوں کے درمیان مصالحت ہونی قرار پائی۔

۱۔ اس سال مسلمان مکے میں داخل نہیں ہوں گے اور عمرہ نہیں کریں گے۔

۲۔ اگلے سال مسلمانوں کو طواف کعبہ کی اجازت ہو گی۔ وہ تین دن تک مکے میں ٹھہر سکیں گے۔ قریش اس عرصے کے لئے شہر سے باہر آجائیں گے۔ مگر مسلمانوں کو نیام میں ڈالی ہوئی تلواروں کے علاوہ اور کوئی ہتھیار لانے کی

Marfat.com

اجازت نہ ہو گی ۔

۳- دس سال تک جنگ نہیں ہو گی اور اس عرصے میں فریقین پرامن رہیں گے کوئی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔

۴- قبائل عرب کو اجازت ہو گی کہ جو چاہے قریش کا حلیف بنے اور جو چاہے مسلمانوں کے ساتھ معاہدے میں شامل ہو جائے۔

۵- اگر قریش میں سے کوئی شخص اپنے سرپرست کی اجازت کے بغیر مسلمانوں کے پاس چلا جائے تو اسے واپس کر دیا جائے گا اور مسلمانوں میں سے اگر کوئی شخص قریش سے جا ملے تو قریش اسے واپس نہیں کریں گے۔

۹- مسلمان کعبے کے قریب پہنچ کر بھی زیارت کعبہ سے روکے جا رہے تھے ۔ اس پر مستزاد یہ کہ صلح نامہ کی بعض دوسری شرائط بھی بظاہر اہانت آمیز تھیں یہ بات صحابہ پر سخت گراں گذری ۔ خود حضرت عمرؓ بھی مضطرب ہو کر تحریر معاہدہ سے پہلے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے پاس پہنچے اور کہنے لگے "کیا آپ اللہ کے رسول نہیں ہیں"؟ آپ نے فرمایا کیوں نہیں "۔ عمرؓ کہنے لگے "کیا ہم مسلمان نہیں ہیں" حضور نے فرمایا یقیناً ہو " تو حضرت عمرؓ نے کہا " پھر ہم ان ذلت آمیز شرائط کو کیوں قبول کریں؟ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا " عمرؓ! میں اللہ کا بندہ اور اس کا پیمبر ہوں ۔ میں اس کے حکم سے سرتابی نہیں کروں گا ۔ اور وہ ہرگز مجھے ضائع نہیں کرے گا(۱)۔

۱۰- پھر آپ نے حضرت علیؓ کو صلح کی شرائط قلمبند کرنے کے لئے بلایا اور فرمایا پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھو- قریش کا نمائندہ سہیل بولا - ہم نہیں جانتے رحمٰن کیا ہے ۔ ہمارے رواج کے مطابق باسمك اللهم لکھو ۔ آپ نے سہیل کی بات

۱- گو حضرت عمرؓ نے یہ بات ازراہ تحیر و استعجاب کہی تھی ۔ مگر زندگی بھر ڈرتے رہے کہ کہیں بارگاہ رسالت میں ان سے سوء ادب تو نہیں ہو گیا- اور اس کی تلافی کے لئے صدقہ و خیرات کرتے رہے اور نوافل پڑھتے رہے ۔ خود فرمایا کرتے تھے " عملت لها اعمالا (میں نے اس کی تلافی کے لئے کئی نیکیاں کیں)-

Marfat.com

مان لی اور حضرت علیؓ کو یہی الفاظ لکھنے کا حکم دیا ۔ اس کے بعد جب حضرت علیؓ نے صلح نامہ پر "محمد رسول اللہ" لکھا تو سہیل اس پر بھی معترض ہوا ۔ اور کہنے لگا اگر ہم آپ کو اللہ کا رسول مانتے تو جھگڑا ہی کیا تھا۔ آپ اپنا نام محمد بن عبداللہ لکھوایئے۔ صحابہ اس بات کے ماننے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھے ۔ مگر چونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ کا حکم مصالحت ہی کا تھا اس لئے آپ نے سہیل کی یہ بات بھی تسلیم کر لی اور حضرت علیؓ سے فرمایا کہ وہ رسول اللہ کا لفظ کاٹ کر اس کی بجائے ابن عبداللہ ہی لکھ دیں۔ فرط ادب سے حضرت علیؓ ایسا نہ کر سکے تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے یہ الفاظ مٹا دیئے۔

۱۱۔ صلح نامے کی تکمیل کے بعد آپ نے حکم دیا کہ قربانی کے جانور اسی مقام پر ذبح کر دیئے جائیں اور سر کے بال بھی یہیں منڈوا یا کتروا کر احرام کھول دیا جائے ۔ اس کے بعد آپ مسلمانوں کے ہمراہ واپس مدینے تشریف لائے۔ اسی سفر میں سورہ الفتح نازل ہوئی۔

۱۲۔ قریش کے علاوہ یہودی بھی مسلمانوں کے سخت دشمن تھے ۔ اس وقت خیبر ' جو مدینے سے کوئی سو میل شمال کی طرف ہے ' یہودیوں کی ریشہ دوانیوں کا مرکز بنا ہوا تھا ۔ یہودی خیبر کے اطراف میں رہنے والے قبائل غطفان و فزارہ کر ساتھ ملا کر مدینے پر ایک زبر دست حملے کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے ۔ قریش کی طرف سے مطمئن ہو کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام یہود کے اس نئے مرکز کی طرف متوجہ ہوئے اور صلح حدیبیہ کو ایک ہی مہینہ گزرا تھا کہ آپ نے اچانک جا کر خیبر کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا۔ چند دن کی مزاحمت کے بعد یہود نے ہتھیار ڈال دیئے ۔ جن لوگوں نے حدیبیہ کے سفر میں آپ کا ساتھ نہ دیا تھا۔ آپ نے اللہ کے حکم کے مطابق انہیں غزوہ خیبر میں شریک ہونے کی اجازت نہ دی۔ اور خیبر کا مال غنیمت صرف ان صحابہ میں تقسیم کیا گیا جو سفر حدیبیہ میں آپ کے ہمراہ تھے ۔

۱۳۔ صلح نامہ حدیبیہ کے مطابق اگلے سال ۷ھ میں حضورؐ صحابہؓ کے ہمراہ مکہ میں تشریف لائے اور امن و امان کے ساتھ عمرہ ادا فرمایا۔

Marfat.com

۱۴۔ صلح حدیبیہ اپنے نتائج کے اعتبار سے مسلمانوں کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوئی ۔ عبداللہ ابن مسعودؓ اور بعض دیگر صحابہ کہا کرتے تھے کہ اسلام کی اصل اور بڑی فتح تو صلح حدیبیہ تھی ۔ یہ اسی صلح کا نتیجہ تھا کہ :

۱۔ قریش نے مسلمانوں کا الگ اور مستقل سیاسی وجود تسلیم کیا جو دراصل قریش کا اعتراف شکست تھا ۔

۲۔ مسلمانوں کو پُرامن فضا میں دین کے پرچار کا موقع ملا۔ حالات میں کشیدگی کے باعث مشرکین مسلمانوں کو قریب سے نہیں دیکھ سکے تھے اب باہم میل جول سے ان پر اسلام کی حقانیت واضح ہوئی۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد اسلام نہایت تیزی سے پھیلا۔ حدیبیہ میں حضور کے ہمراہ صرف ڈیڑھ ہزار کے قریب ساتھی تھے۔ مگر دو برس بعد فتح مکہ کے وقت دس ہزار کا جم غفیر آپ کے ہمراہ تھا ۔

۳۔ مسلمانوں کے دونوں دشمن قریش اور یہود آئندہ مسلمانوں کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کے قابل نہ رہے اور دونوں کو مسلمانوں کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا۔

۴۔ حالات ہموار ہوئے تو حضور علیہ الصلواۃ والسلام نے ہمسایہ ممالک کے بادشاہوں کو اسلام کی دعوت دی ۔ یوں آپ نے اسلام کی آواز ملک عرب سے باہر بھی دور دراز ممالک تک پہنچا دی ۔

۵۔ مدینے سے ہجرت کے بعد مسلمانوں کی مظلومیت کا دور ختم ہوا ۔ مگر ان کی ملی انفرادیت برابر خطرے میں رہی ۔ صلح حدیبیہ کے بعد یہ خطرہ ٹل گیا۔ اشاعت اسلام ، مسلمانوں کی معاشی خوشحالی اور ان کی سیاسی برتری کا ایک نیا دور شروع ہوا ۔ سورہ الفتح کے آخر پر کھیتی کی جو تمثیل بیان ہوئی ہے ۔ وہ حقیقتاً اس آنے والے دور کے آغاز کا اعلان ہے۔

Marfat.com

سورت کے مضامین کا اجمالی خاکہ

اس سورت کے مضامین کو مختصر طور مندرجہ ذیل پانچ عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ (۱) مقام پیمبر علیہ الصلواۃ والسلام (۲) اوصاف صحابہؓ (۳) منافقوں کی مذمت (۴) پیشین گوئیاں (۵) بعض تاریخی اشارات

۱- مقام پیمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام)

محمدؐ اللہ کے رسول ہیں ۔ وہ حق پر شاہد ہیں۔ وہ مبشر ہیں ۔ وہ نذیر ہیں ۔ اللہ نے آپ کی اگلی پچھلی تمام فروگذاشتیں بخش دیں ۔ خدا نے آپ کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا ہے ۔ آپ کی رسالت پر ایمان اور آپ کا غایت درجہ ادب و احترام ہر مسلمان پر واجب ہے ۔

۲- اوصاف صحابہؓ

حضور علیہ الصلواۃ والسلام کے تربیت یافتہ باہم نرم خو اور رحمدل مگر دشمنان دین کے ساتھ شدت برتنے والے تھے۔ وہ بارگاہ الہی میں عجز و نیاز کرنیوالے اور اللہ کی خوشنودی کو زندگی کا سب سے بڑا مقصد سمجھنے والے تھے ۔ وہ دین کی کھیتی کو اپنے خون سے سینچنے والے تھے ۔ وہ رسول اللہ کے ہاتھ پر اللہ کی راہ میں مرمٹنے کی بیعت کرنے والے اور رسول اللہ کے ہر حکم کے سامنے بطیّب خاطر سر تسلیم خم کر دینے والے تھے ۔ وہ جن کی جان نثاریوں کے عوض اللہ نے ان پر اپنی رحمتوں اور سکینتوں کی بارش کی اور دنیا و آخرت کی سعادتوں سے نوازا ۔

۳- منافقوں کی مذمت

منافق بصیرت سے محروم ہونے کی وجہ سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور مسلمانوں کی کامرانی کا یقین نہیں رکھتے تھے ۔ بلکہ ان کی شکست اور تباہی کا گمان رکھتے تھے ۔ اپنے غلط اندازوں کی بنا پر وہ جہاد میں شریک ہونے سے کنی کتراتے اور حیلے تراشتے تھے اور اگر مسلمانوں کا پلہ بھاری دیکھتے تو مال غنیمت

Marfat.com

بٹورنے کی خاطر اپنی " خدمات " پیش کرنے لگتے ۔

۴- پیشین گوئیاں

اس سورت میں بعض پیشینگوئیاں بھی کی گئی ہیں جو سب کی سب من و عن پوری ہوئیں۔

۱- صلح حدیبیہ کو " فتح مبین " قرار دیا گیا اور اسے غلبۂ دین کے نئے دور کا آغاز ٹھہرایا گیا۔

۲- مسلمانوں کو خوشخبری دی گئی کہ وہ عنقریب مسجد حرام میں پُرامن طریق پر داخل ہوں گے ۔

۳- مسلمانوں کو جلد ایک بہت بڑی فتح حاصل ہونے والی ہے اور بہت سا مال غنیمت ہاتھ لگنے والا ہے۔

۴- عنقریب مسلمانوں کا ایک سخت جنگ جُو قوم سے تصادم ہونے والا ہے ۔ اس وقت ان منافقوں کو بھی جہاد میں شریک ہونے کی دعوت دی جائے گی جو حدیبیہ میں پیچھے رہ گئے تھے ۔

۵- بعض واقعات کی طرف اشارے

اس سورت میں ان واقعات کی طرف اشارات کئے گئے ہیں (جن کی ضروری تفصیلات شروع میں بیان ہو چکی ہیں)۔

۱- صلح حدیبیہ کی شرائط پر مسلمانوں کا اضطراب۔

۲- بیعت الرضوان -

۳- منافقین کا سفر حدیبیہ سے گریز اور اس کی وجہ۔

۴- جبل تنعیم والے فوجی دستے کا واقعہ۔

۵- شرائط عہد نامہ لکھتے وقت کفار کے اعتراض۔

۶- مخلفین حدیبیہ کا غزوۂ خیبر میں شرکت سے روک دیا جانا -

۷- مکہ میں اس وقت خفیہ مسلمان ہونے والوں کو موجودگی۔

Marfat.com

سورۃ الحجرات

تعارف

اس سورت کا نام الحجرات ہے ۔ یہ لفظ اس سورت کی چوتھی آیت میں مذکور ہے ۔ اس میں دو رکوع اور اٹھارہ آیتیں ہیں۔

سورت کا زمانۂ نزول اور تاریخی پس منظر

یہ سورت بالاتفاق مدنی ہے ۔ اس سورت کی بعض آیات وفد نبی تمیم کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور یہ وفد فتح مکہ کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اس لئے قرین قیاس ہے کہ یہ سورت یا اس کا بیشتر حصہ فتح مکہ کے بعد غالباً ۹ھ میں نازل ہوا۔

ا- یہ وہ زمانہ تھا جب عرب قبائل غلبۂ اسلام سے متاثر ہو کر پے در پے مسلمان ہو رہے تھے اور اس سال ۹ھ داخل اسلام ہونے کے لئے اتنے وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ اس سال عام الموفود ہی کہنے لگے۔ ناگزیر تھا کہ ان بیشمار لوگوں کو جو اسلام میں نئے نئے داخل ہو رہے تھے اسلام کے نظام حیات سے آگاہ کیا جائے اور انہیں تلقین کی جائے کہ وہ اسلامی ضابطہ حیات کے سانچے میں پوری طرح ڈھل جائیں۔

چونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وجود گرامی اسلامی نظام حیات میں مرکز و محور کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اس (آخری) دور کی سورتوں میں حضورؐ کی مکمل اور پرخلوص اطاعت اور بارگاہ رسالت کے آداب پرزور دیا گیا ہے ۔ سورۃ الحجرات کا آغاز ہی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تکریم و تعظیم اور آپ کے ادب و احترام کی تلقین سے ہوتا ہے ۔

Marfat.com

۲- جب بھی کوئی جماعت آخری ارتقائی منازل طے کر رہی ہوتی ہے اور لوگ ہجوم کر کے اس میں داخل ہو رہے ہوتے ہیں ۔ اس وقت نوواردوں کی کثرت اس جماعت کے نظم و نسق کو بگاڑنے کا باعث بھی ہو سکتی ہے اور من حیث الجماعة اخلاقی معیار کے پست ہونے کا خدشہ ہوتا ہے ایسے حالات میں سختی کے ساتھ نظم و نسق قائم رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اسلام بھی اس زمانے میں ایسے ہی ارتقائی دور سے گذر رہا تھا اور ایسی تعلیم و تربیت کی ضرورت تھی جس سے دین لوگوں کے رگ و پے میں اتر جائے ۔ سورہ الحجرات کا ایک موضوع سخن یہ بھی ہے ۔

۳- یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ دین اس وقت آخری ارتقائی منزلوں میں سے تیزی کے ساتھ گزر رہا تھا ۔ اس لئے یہ بھی ضروری تھا کہ تزکیۂ باطن اور روحانیت کے آخری ارتقائی اسباق بھی منتہی مسلمانوں کو دیئے جاتے۔

سورہ الحجرات میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ادب و تعظیم پر جو خاص زور دیا گیا ہے اور جن اخلاقی و روحانی اقدار کی تلقین کی گئی ہے ان کی اہمیت اور وقت کا احساس ایک منتہی مسلمان ہی کر سکتا ہے۔

سورت کا اجمالی خاکہ

یہ سورت دو باتوں پر مشتمل ہے ۔

۱- بارگاہِ رسالت کے آداب

۱- اپنی خواہشات اور جذبات احکام خدا و رسول کے تابع رکھو۔ ہر معاملے میں اپنے فیصلے سے پہلے اللہ اور اس کے رسول کا حکم معلوم کرو۔

۲- حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بات کرو ۔ یا ان کی موجودگی میں آپس میں بات کرو تو دھیمے اور شائستہ لہجے میں بات کرو۔

۳- حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فیصلہ تج کر اپنی رائے منوانا خود تمہارے ہی لئے باعث وبال ہے ۔

۴- حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فیصلوں کو بلاتردد مان لینا ہی جی میں

Marfat.com

ایمان کے راسخ ہونے کی نشانی ہے اور آپ کے فیصلوں سے سرتابی کفر ہے ' فسق ہے ' عصیان ہے۔

۵- ایسا رویہ مت اختیار کرو جس سے یہ معلوم ہو کہ گویا مسلمان ہو کر تم نے پیغمبر خدا ﷺ پر کوئی احسان کیا ہے۔

۲- مسلم معاشرہ کی سالمیت اور استحکام

۱- غیر ذمہ دار اور فاسق لوگوں کی بات بغیر تحقیق نہ مان لیا کرو کہ یہ ندامت کا باعث ہو سکتا ہے۔

۲- دو گروہ جھگڑیں تو محض تماشائی نہ بنو۔ پہلے تو ان میں صلح کی کوشش کرو اور اگر ایک گروہ سرکشی پر ڈٹ جائے تو تم اس کے خلاف لڑو اور پھر بھی اسے ذاتی وقار کا سوال نہ بناؤ- اس لئے جب وہ سرکش گروہ اپنی ضد سے باز آجائے تو عدل و انصاف سے کام لے کر دونوں گروہوں میں صلح کرا دو۔

۳- سب مسلمان بھائی بھائی ہیں ایک دوسرے کو صلح صفائی سے رہنے کی تلقین کرو۔

۴- کسی کا ٹھٹھا نہ اڑاؤ۔ تحقیر نہ کرو اور برے برے لقب نہ دو۔

۵- بات بات پر بدگمانیاں نہ کرو۔ کسی کے عیبوں کی ٹوہ میں نہ رہو اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔

۶- سب انسان اولاد آدم ہیں اور انسان ہونے کی حیثیت سے اللہ کی نظر میں یکساں ہیں۔ اللہ کے ہاں فضیلت صرف کردار کی بلندی اور پرہیز گاری سے ہے۔

۷- اللہ کسی کا ایمان اور اسلام اس کی نمائشی نعرہ زنی۔ شاطرانہ ریاکاری اور عیارانہ بیان بازی سے نہیں ناپتا۔ اور اس علیم و خبیر کو اس کی ضرورت ہی کیا؟ اس کی بارگاہ میں تو صرف یقین و عمل اور خلوص و اطاعت کی قدر ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

مشاہدۂ کائنات

"مشاہدۂ کائنات" مشاہدے کے لفظی معنی ہیں "ایک دوسرے کو آمنے سامنے دیکھنا۔ اردو زبان میں یہ لفظ "ذرا غور و فکر کے ساتھ دیکھنے" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کائنات کے معنی ہیں تمام وہ چیزیں جن کا وجود ہے اور اس سے مراد ہے زمین یا آسمان میں پائی جانے والی تمام چیزیں ہیں اس طرح "مشاہدۂ کائنات" کا مطلب بنتا ہے "اپنے ارد گرد پائی جانے والی تمام چیزوں کو غورو فکر کے ساتھ دیکھنا۔"

چیزوں کو غور و فکر سے دیکھنے یا انہیں دیکھ کر غوروفکر سے کام لینے کی بناء پر انسان کچھ نتائج نکالتا ہے۔ انسان کے تمام علوم اور خاص طور پر وہ علوم جنہیں ہم سائنسی علوم مثلاً طبعیات ' کیمسٹری ' حیاتیات ' زراعت' طب اور انجینئرنگ وغیرہ کہتے ہیں یہ سب کائنات کی مختلف چیزوں مثلاً سورج ' چاند ' ستاروں ' روشنی ' حرارت ' ہوا' پانی ' بارش' مٹی ' نباتات ' حیوانات ' معدنیات وغیرہ میں صدیوں تک کے انسانی غوروفکر کا نتیجہ ہیں۔ مشاہدۂ کائنات کے ذریعے انسان نے آہستہ آہستہ مختلف چیزوں کے اندر پائی جانے والی مستقل خاصیّات اور صفات دریافت کیں اور یہ معلوم کیا کہ کائنات کی ہر شے کسی نہ کسی قاعدے اور قانون کی پابند ہے۔ چیزوں کے بارے میں اس قسم کی معلومات ہی انسان کی تمام ایجادات کا باعث بنی ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے کیونکہ کائنات کے بارے میں جس قدر باتیں معلوم ہو چکی ہیں اس سے کہیں زیادہ ابھی تک نامعلوم ہیں۔

قرآن مجید نے بار بار انسانوں کو مشاہدۂ کائنات کی طرف توجہ دلائی ہے اور ایک طرح سے بالواسطہ ان تمام علوم کے پڑھنے کا شوق دلایا ہے جن کی بنیاد مشاہدۂ

Marfat.com

کائنات پر ہے اور جنہیں عام طور پر سائنس کہتے ہیں۔ خیال رہے کہ قرآن کریم سائنس کی کتاب نہیں ہے۔ سائنسی معلومات اور ایجادات اس کا اصل موضوع نہیں ہیں اور نہ ہی صرف سائنس پڑھ لینے سے قرآن کریم کے سارے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں۔

قرآن کریم تو ہدایت کی کتاب ہے۔ انسانوں کو زندگی بسر کرنے کا درست طریقہ بتاتی ہے۔ مزید برآں قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے اور اس میں بتایا ہوا طریقِ زندگی یا دستور حیات اس کائنات کے پیدا کرنے والے کا اپنا مقرر کیا ہوا ہے۔ تاہم قرآن مجید مشاہدۂ کائنات کی طرف اس لیے توجہ دلاتا ہے کہ مشاہدہ اور غوروفکر سے انسان کو کائنات کی ہر شے میں اس کے خالق اور مالک کی زبردست صنعت و قدرت اور بے پایاں حکمت و ہدایت کارفرما نظر آتی ہے اور یہ بات اس کے ایمان کی پختگی کا سبب بنتی ہے۔

مشاہدہ کائنات سے جب انسان یہ معلوم کرتا ہے کہ کائنات کی ہر شے اس کے فائدے کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ وہ اپنی زندگی کی بہت سی ضروریات کے لیے کائنات کی بے شمار چیزوں کا محتاج ہے مگر کائنات کی کسی چیز کو اس کی ضرورت نہیں ہے تو اسے ضرور یہ بھی خیال آتا ہے کہ آخر وہ خود کس لیے پیدا کیا گیا ہے؟ اور اس کی زندگی کا اصل مقصد کیا ہے؟ وہ سوچتا ہے کہ جس خالق و مالک کے قوانین کے ذریعے اس کائنات کا سارا نظام اتنے اچھے طریقے پر چل رہا ہے۔ یقیناً "انسانی نظام" "یا انسانی معاشرہ" بھی اسی کے دیے ہوئے قوانین کے ماتحت ہی ٹھیک طرح چل سکتا ہے۔ یہ سوچ اور یہ جستجو انسان کو اسلام کی دہلیز پر لا کھڑا کرتی ہے اور تب انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ مشاہدہ کائنات کے لیے بھی قرآن کا محتاج ہے۔ چنانچہ مشاہدہ کائنات کے متعلق قرآن نے جو رہنمائی دی ہے آیئے اس کا مختصر سا مطالعہ کرتے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

ان فی خلق السموات والارض و اختلاف اللیل والنهار والفلك التی تجری فی

Marfat.com

البحر بما ينفع الناس وما انزل الله من السماء من ماء فاحيا به الارض بعد موتها وبث فيها من كل دآبة وتصريف الرياح والسحاب المسخر بين السماء والارض لآيٰت لقوم يعقلون :(البقرہ/۱۶۴).

بے شک آسمانوں اور زمین کی ساخت (اور مخلوقات) میں اور رات دن کے ادل بدل میں (جہازوں اور) کشتیوں میں جو لوگوں کے فائدے کی چیزیں (مال تجارت وغیرہ) لئے (دریاؤں اور) سمندروں میں چلتی (پھرتی) ہیں۔ اور مینہ کے پانی میں جسے اللہ آسمان سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعے زمین کو (ایک طرح سے) اس کی موت کے بعد (دوبارہ) زندگی بخشتا ہے اور (جس طرح) اس نے ہر قسم کی جاندار مخلوق (روئے) زمین پر پھیلا رکھی ہے اور ہواؤں کی (مختلف سمتوں میں) گردش (اور رخ بدلتے رہنے) میں اور بادلوں (اور آبی بخارات). میں جو آسمان اور زمین کے درمیان پابند فرمان (بنا رکھے گئے) ہیں۔

(الغرض ان سب چیزوں میں) عقل سے کام لینے والوں کے لیے (خالق کی عظمت و قدرت کی) بہتیری نشانیاں (موجود) ہیں۔ البقرہ : ۱۶۴)

(۱—ب)ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف الّیل و النّهار لآيٰت لاولی الالباب۔ اَلّذین یذکرون الله قیاماً وّ قعوداً و علیٰ جنوبهم ویتفکرون فی خلق السمٰوٰت والارض ربنا ما خلقت هٰذا باطلا. سبحٰنك فقنا عذاب النار (آل عمران :۱۹۰—۱۹۱)۔

یقیناً آسمانوں اور زمین کی ساخت (اور مخلوقات) میں' اور رات دن کی ادل بدل میں ان اہل عقل و دانش کے لئے تو بہت سے دلائل (اور نشانات) جو اٹھتے ' بیٹھتے ' لیٹتے (ہر حال میں)اللہ کو یاد رکھتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی ساخت(اور مخلوقات) میں غوروفکر کرتے (رہتے ہیں)۔ (اور وہ بول اٹھتے ہیں)ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ فضول (اور بے مقصد) نہیں بنایا تو پاک ہے (اس قسم کے عیب سے) سو تو ہم کو (دوزخ کی) آگ کے عذاب سے بچا لیجیو!

Marfat.com

ا- ان دو آیات میں مجموعی طور پر اس کائنات کی سات چیزوں میں پائے جانے والے نشاناتِ قدرت پر غوروفکر کی دعوت دی گئی ہے اور وہ یہ ہیں:

(۱) آسمانوں اور زمین کی پیدائش

(۲) رات اور دن کا ادل بدل

(۳) بحری جہاز رانی

(۴) بارش کا پانی

(۵) کرۂ ارض پر نباتاتی اور حیوانی زندگی

(۶) ہواؤں کی گردش

(۷) بادلوں کی دنیا

ان میں سے نمبرا کا ذکر دو دفعہ آیا ہے۔ ان چیزوں میں سے ہر ایک میں کئی دلیلیں اور بہت سی نشانیاں ہیں جن کی تعداد آدمی کے علم کی وسعت کے مطابق بڑھتی جاتی ہے۔

(۲) بظاہران مناظراور مظاہر کو کم و بیش تمام انسان شب و روز دیکھتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن ان کے اندر پائی جانے والی ایک عجیب یک رنگی اور باقاعدگی کی دریافت اور ان اصول و قوانین کی تلاش و جستجو ' جو ان تمام اشیاء کو گویا اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہیں' تو یہ اہل عقل و دانش ہی کا کام ہے۔ اور ہر زمانے میں اور ہر جگہ ایسے لوگوں کا کائنات میں غوروفکر ان کو ہمیشہ ایک ہی نتیجے پر پہنچاتا رہا ہے کہ اس سارے کارخانے کا کوئی ایسا پیدا کرنے والا ہے جو زبردست قوت اور حکمت کا مالک ہے اور جس نے یہ سب کچھ بے مقصد اور بے کار نہیں بنایا ہے--- اور وہی ہمارا رب ہے۔

(۳) کائنات کے جن عجائبات کی طرف ان دو آیتوں میں اشارہ کیا گیا ہے ' ان کو پوری طرح سمجھنے کے لیے عمریں درکار ہیں۔ انسان نے گزشتہ چار پانچ ہزار برس میں اپنے مشاہدات اور تجربات کی بناء پر صرف ان سات "موضوعات" پر جس قدر معلومات حاصل کی ہیں ' اور پھر ان معلومات کو مرتب اور منظم طریقے پر پیش کر کے جو سائنسی

Marfat.com

علوم نکالے ہیں (مثلاً حیاتیات و طبیعات ' جغرافیہ ' موسمیات ' فلکیات ' ریاضیات وغیرہ) اور ان تمام علوم کی بناء پر آج تک جو جو ایجادات ہوئی ہیں' اس پر دینا میں لاکھوں بلکہ کروڑوں صفحات کی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اور مسلسل لکھی جا رہی ہیں مگر کائنات کے ہنوز سربستہ راز ان تمام معلوم عجائبات سے کہیں زیادہ ہیں اور سائنسدانوں کے پاس ابھی سینکڑوں ایسے سوالات ہیں جن کے جوابات کی تلاش میں وہ سرگرداں ہیں---- شاید یہی وجہ ہے کہ اس سبق کی پہلی آیت ایسے سوالات ہیں جن کے جوابات کی تلاش میں وہ سرگرداں ہیں---- شاید یہی وجہ ہے کہ اس سبق کی پہلی آیت (البقرہ :۱۶۴) کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "ویل لمن قرأ هذه الآية و مج بها" یعنی افسوس صد افسوس ہے اس پر جس نے اس آیت کو پڑھا اور اس پر غورو تدبر نہ کیا۔ اسی طرح ایک دفعہ آپؐ سے بعض غیر مسلموں نے یہ پوچھا کہ دوسرے انبیاء کے کچھ خاص معجزے تھے۔ آپ کیا لائے ہیں؟ تو آپؐ نے سورہ آل عمران کی مندرجہ بالا آیات پڑھ دیں اور فرمایا۔ "میں تو یہ لایا ہوں"۔

۴۔ "تفکر" (کائنات میں غوروفکر) اور "معجزہ بینی" (اپنی آنکھوں سے کوئی معجزہ دیکھنا) دونوں کی حالت ایک جیسی ہے۔ یہ دونوں چیزیں آدمی کو مبہوت اور حیران کر کے کسی حقیقت کا قائل کر دیتی ہیں۔ پیغمبروں کے معجزات دیکھنے کا موقع تو کسی وقت پر چند آدمیوں کو ہی ملا۔ مگر قدرت کے عجائبات ہر وقت اور ہمیشہ مشاہدہ کے لیے موجود ہیں۔ پھر کائنات میں غوروفکر ایسی چیز ہے کہ اس کے ذریعے ان پڑھ سے لیکر بڑے سے بڑا "عالم" یکساں متاثر ہوتا ہے۔ اس عظیم الشان موجودات کے طبعی قوانین اور لگے بندھے قواعد سے اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت پر استدلال (دلیل لانا) یہ ایک علمی شرف ہی نہیں اعلیٰ عبادت بھی ہے۔ مخلوق میں تفکر اور خالق کا ہر وقت ذکر ایسے لوگوں کی صفت ہے جنہیں عقل کے ساتھ ایمان کی دولت بھی نصیب ہوئی ہے۔ یہی بات ان آیات میں بیان ہوئی (ایک دفعہ ترجمہ پھر پڑھ لیجئے)۔

(۲-الف) هو الذى جعل الشمس ضياء و القمر نورا و قدره منازل لتعلموا عدد

Marfat.com

السنين والحساب ما خلق الله ذلك الا بالحق يفصل الآيت لقوم يعلمون۔ إن فی اختلاف الیل والنهار وما خلق الله فی السموٰت والارض لآیت لقوم یتقون۔ (یونس:۵-۶)۔

اور وہ اللہ ہی ہے جس نے سورج کو (گرمی اور) چمک اور چاند کو چاندنی (کی دمک) دی اور چاند کی (حرکت کے لیے) ٹھیک ٹھیک منزلیں مقرر کر دیں (جس میں سر مو تفاوت نہیں ہوتا) تاکہ (اس کے ذریعے) تم برسوں کی گنتی اور (تاریخوں کا) حساب معلوم کرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ نے یہ (سارا کارخانہ) خاص مقصد (اور حکمت) کے ساتھ ہی تو بنایا ہے۔ (یوں) وہ ان لوگوں کے لیے جو اہل علم ہیں (اپنی قدرت کے) نشانات تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ یقیناً رات دن کے ادل بدل اور آسمانوں اور زمین کے اندر (پائی جانے والی) مخلوق میں پرہیزگار لوگوں کے لیے (بڑی) نشانیاں ہیں۔

۱- ان دو آیات میں

(۱) سورج اور چاند کی روشنی

(۲) وقت کے تصور سے تعلق

(۳) دن رات کا ادل بدل اور

(۴) زمین اور آسمان کی مخلوقات میں پائے جانے والے عجائبات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ جو آدمی علم کے ساتھ احساس ذمہ داری (تقویٰ) بھی رکھتا ہو وہ سمجھ جاتا ہے کہ سب چیزوں کا ایک بنانے والا ہے اور اس نے ان کو کسی حکمت اور مقصد کے ساتھ بنایا ہے۔

۲- سورج کے طلوع اور غروب سے یعنی رات اور دن کی باری باری ظاہر ہونے سے سب سے پہلے انسان نے ایک تاریخ (یا چوبیس گھنٹے کے دن) کا تصور لیا۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف قوموں اور لوگوں میں (تاریخ کے لیے) دن کی ابتداء اور انتہا کا شمار مختلف طرح سے کیا جاتا رہا ہے مثلاً کسی نے ایک صبح سے دوسری صبح تک، بعض نے غروب سے غروب تک بعض نے آدھی رات سے آدھی رات تک اور بعض نے دوپہر

Marfat.com

سے دوپہر تک ایک دن شمار کیا--- اس کے بعد نئے چاند سے اگلے نئے چاند تک کی مدت نے انسان کو ایک مہینے کا تصور دیا اور پھر انسان نے زیادہ طویل مشاہدہ سے یہ معلوم کیا کہ ۱۲ نئے چاند دیکھنے کے بعد پھر وہی موسم آ جاتا ہے اس مدت کا نام انسان نے سال رکھا۔ اس طرح دن (جس سے ایک دن اور رات مراد ہیں) مہینہ اور سال۔ یہ وقت کی ایک قدرتی تقسیم ہے جو سورج اور چاند کے طلوع اور غروب میں ایک باقاعدگی کی وجہ سے انسانی مشاہدہ میں آئی۔ بلکہ مہینے کے چار ہفتے بھی چاند کی گردش کے چار منظم ادوار سے لئے گئے ہیں۔

۳- برسوں کی اس گنتی (عدد السنین) یعنی کیلنڈر یا تقویم کو دور رکھنے اور اپنی سہولت اور ضرورت کے لئے وقت کے مختلف حصّے (مثلاً گھنٹہ منٹ سیکنڈ) اور مجموعے (صدیاں) مقرر کرنے میں انسان کو جس قدر "حساب" سے کام لینا پڑا ہے اور سورج اور چاند کی گردشوں اور ان سے متعلق وقت کو ناپنے کے لیے طویل ادوار سے لے کر لمحات کی دقیق تقسیم تک کے جو جو پیمانے انسانی ذہن نے آج تک مقرر کئے ہیں ان سب کی تفصیل کے لیے مستقل کتابیں لکھی جا چکی ہیں جن کا تعلق مختلف سائنسی مضامین مثلاً ریاضی، نجوم، فزکس، حیاتیات، جغرافیہ اور جیالوجی وغیرہ سے ہے۔ لتعلموا عدد السنین والحساب (تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کرتے رہو) میں نظامِ شمسی کے جن عجائبات اور انسانی ذہن کے جن امکانات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کو کماحقہ سمجھنے کے لیے تو دنیا بھر میں رائج مختلف کیلنڈروں کی تاریخ اور علم ہئیت (Astronomy) کا مطالعہ درکار ہے۔

(۳-الف)وهو الذی یرسل الریح بشراً بین یدی رحمته۔ حتیٰ اذا اقلت سحابا ثقالا سقنه لبلد میت فانزلنا به المآء فاخرجنا به من کل الثمرات. کذلك نخرج الموتیٰ لعلکم تذکرون (الاعراف/۵۷).

اور وہ (اللہ) ہی ہے جو اپنی (باران) رحمت کے آگے آگے (لوگوں کو مینہ کی آمد کا) مژدہ (جانفزا) سناتی ہوئی (ٹھنڈی) ہوائیں بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ (ہوائیں آبی

Marfat.com

بخارات سے لدے ہوئے) بوجھل بادلوں کو لے اڑتی ہیں تو ہم ان کو کسی مردہ سرزمین کی طرف حرکت دیتے ہیں اور وہاں (ان بادلوں سے) مینہ برسا کر اس (بارش کے پانی) کے ذریعے اسی خشک اور مردہ زمین سے ہر طرح کے پھل (سبزی' غلہ وغیرہ) نکالتے ہیں اسی طرح ہم (قیامت کے دن) مردوں کو (زمین سے) نکال کھڑا کریں گے ہو سکتا ہے کہ تم اس مشاہدہ سے کچھ) سبق لو۔

(۳- ب) هو الذی یریکم البرق خوفا و طمعا و ینشی السحاب الثقال. ویسبح الرعد بحمده و الملئكة من خیفته ویرسل الصواعق فیصیب بها من یشاء وهم یجادلون فی الله وهو شدید المحال (الرعد/۱۲-۱۳)۔

وہی (قادر مطلق) ہے جو تمہارے سامنے (آسمانی) بجلیاں چمکاتا ہے کہ (جنہیں دیکھ کر تمہیں) کچھ اندیشے بھی (لاحق) ہوتے ہیں اور کچھ امیدیں بھی (بندھتی ہیں)۔ اور وہ ہی (آبی بخارات سے لدے ہوئے) بادل اٹھاتا ہے اور (ان بادلوں کی) گرج (زبانِ حال سے) اس کو سراہتی اور اس کی تسبیح بیان کرتی ہے اور (اسی طرح) فرشتے (بھی) اس کی ہیبت سے (لرزاں اور تسبیح برزبان رہتے ہیں)۔ اور (وہی) آسمان سے گرنے والی کڑکتی ہوئی بجلیوں کو بھیجتا ہے۔ اور (بعض اوقات) انہیں جس پر چاہتا ہے گرا (بھی) دیتا ہے۔ یہ لوگ (اللہ تعالیٰ) کے بارے میں بھی جھگڑتے اور مباحثے کرتے (پھرتے) ہیں حالانکہ اس کی گرفت اور اس کی قوت اس کی چال (اتنی) سخت ہے (کہ اس کا توڑ نہیں)۔

۱- آپ نے اگر ترجمے پر غور کیا ہے تو آپ بآسانی بتا سکتے ہیں کہ ان آیات میں کائنات کی حسب ذیل چیزوں کا "نشاناتِ قدرت" کے طور پر ذکر ہوا ہے:

۱- ریاح (ہوائیں)

۲- سحاب (بادل)

۳- آسمانی پانی یا بارش

۴- برق (چمک) رعد (گرج) اور صواعق (بجلیاں)

Marfat.com

۵- نباتاتی زندگی خصوصاً پھل

آپ نے یہ بھی دیکھا کہ ان میں سے بعض چیزوں کا ذکر اس سے پہلے والی آیات میں بھی آیا ہے۔ آیات میں ان نشانات سے دو باتوں پر دلیل لائی گئی ہے۔

۱- مردوں کا دوبارہ زندہ ہونا (بارش کے ذریعے مردہ زمین کے پھر زندہ ہو جانے سے) اور

۲- اللہ کی زبردست اور قدرت (بجلی کی چمک یا کڑک اور بادل کی گرج سے)۔

۲- دوسری آیت(ب) میں یہ سبق بھی دیا گیا ہے کہ جس طرح مذکورہ بالا نشانات قدرت سے انسان کے اندر بیک وقت خوف اور طمع (ڈر اور امید) کی ملی جلی کیفیت پیدا ہوئی ہے اسی طرح آدمی کو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے بھی رہنا چاہیے اور ہمیشہ اس سے بھلائی کی امید بھی رکھنی چاہیے۔ ایمان خوف اور امید دونوں کے درمیان ہے ان نشاناتِ قدرت کو (جو یہاں مذکور ہوئے ہیں) عموماً ہر آدمی اکثر دیکھتا اور ان سے متاثر ہوتا ہے مگر اعلیٰ سطح پر ان میں سے ایک ایک مستقل سائنس کا موضوع ہے جس میں ان کے عجائبات کا باقاعدہ مطالعہ کیا جاتا ہے۔

هو الذى انزل من السماء ماء لكم منه شراب ومنه شجر فيه تسيمون. ينبت لكم به الزرع والزيتون والنخيل والاعناب ومن كل الثمرات. إن فى ذلك لآية لقوم يتفكرون. وسخر لكم الّيل والنهار. والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامره. إن فى ذلك لآينت لقوم يعقلون. وما ذرا لكم فى الارض مختلفا الوانه إن فى ذلك لآية لقوم يذّكرون. وهو الّذى سخر البحر لتأكلوا منه لحماً طرياً وتستخرجوا منه حلية تلبسو نها وترى الفلك مواخر فيه ولتبتغوا من فضله و لعلّكم تشكرون. وألقى فى الارض رواسى أن تميد بكم وأنهر وسبلا لعلكم تهتدون. وعلمٰت وبالنّجم هم يهتدون. أفمن يخلق كمن لا يخلق. أفلا تذّكرون وإن تعدوا

Marfat.com

نعمة الله لا تحصوها. إن الله لغفور رحيم. والله يعلم ما تسرون وما تعلنون.
والّذين يدعون من دون الله لا يخلقون شيئا وهم يخلقون. أموات غير أحياء
وما يشعرون أيّان يبعثون. (النحل/١٠-٢١).

وہی (قادر مطلق) ہے جس نے آسمان سے تمہارے لیے پانی برسایا۔ جس میں سے کچھ تمہارے پینے کے (کام آتا ہے) اور کچھ درختوں اور نباتات کی پرورش کے لئے ضروری ہے۔ جس میں تم (اپنے مویشی) چرانے چگنے کے چھوڑ دیتے ہو۔ اسی پانی کے ذریعے وہ کھیتیاں اگاتا ہے اور زیتون ' کھجور ' انگور اور ہر قسم کے پھل (سبزیاں وغیرہ پیدا کرتا ہے) جو لوگ غوروفکر سے کام لیتے ہیں ان کے لیے تو اس (مشاہدہ) میں (اللہ کی قدرت اور اس کی توحید پر) ایک بہت بڑی نشانی (اور زبردست دلیل) موجود ہے۔ اور اسی (ذات برتر) نے رات کو اور دن کو ' اور سورج کو اور چاند کو تمہارے (فائدوں کے) لئے مسخر اور (بے بس کر کے گویا کام پر لگا) کر رکھا ہے۔

سب ستارے بھی ' اسی کے حکم سے مسخر (اور اپنی اپنی ڈیوٹی پر لگے ہوئے) ہیں۔ اس میں عقل سے کام لینے والوں کے لیے (قدرتِ خالق) کی (بہت) بڑی نشانیاں ہیں۔

اور (یہ) جو اس نے بہت سی رنگ برنگ (اور انواع و اقسام) کی چیزیں تمہارے لئے زمین میں (بکثرت) پیدا کر رکھی ہیں۔ ان میں (بھی) ضرور نشانی (اور دلیل تو) ہے (مگر ان لوگوں کے لیے جو (بات کو سمجھتے اور اس سے) سبق حاصل کرتے ہیں۔

اور وہی (قادر مطلق) ہے جس نے سمندر کو (بھی) مسخر کر (کے کام پر لگا) رکھا ہے تاکہ اس میں سے (مچھلی کا) تازہ گوشت کھاؤ--- اور نیز اس میں سے زیور (اور زینت کے طور پر کام آنے والی وہ چیزیں) نکالو --- جنہیں تم پہننے کے کام لاتے ہو اور تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں اس میں (کس طرح پانی کو) چیرتی ہوئی چلتی ہیں (اس میں اللہ کا مقصد یہ بھی ہے) کہ تم اس کے فضل (سامان معاش) کی تلاش کرو اور یہ

Marfat.com

بھی ہو سکتا ہے (اور ہونا چاہیے) کہ تم شکر گزار (بندے) بن جاؤ۔

اور اس نے زمین میں (پہاڑوں کے) بھاری بوجھ ڈال دیئے تاکہ تک کو لے کے زمین اضطرابی حرکت نہ کرنے لگے---اور (اس نے) دریا (جاری کئے) اور (قدرتی) راستے (بنائے) تاکہ تم راہ (ہدایت) پاؤ اور (اسی طرح اس نے زمین میں راستوں کی شناخت کے لیے اور بھی) کئی علامتیں (رکھ دی ہیں) اور ستاروں کے ذریعے بھی لوگ راستہ معلوم کر لیتے ہیں۔

پھر کیا وہ جو (اتنی مخلوقات) پیدا کرتا ہے اور (دوسری طرف) وہ جو (کچھ بھی) پیدا نہیں کرتا (کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟) تو کیا اتنی سی بات بھی تمہاری سمجھ سے باہر ہے؟

اور (دیکھو) اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننے لگو تو کبھی ان کو (پوری طرح) شمار نہ کر سکو گے بے شک اللہ تعالی بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ اور اللہ تعالی جانتا ہے کہ تم چھپاتے کیا ہو؟ اور ظاہر کیا کرتے ہو۔

اور اللہ سے نیچے جن (معبودوں) کو یہ لوگ (دعاؤں میں) پکارتے ہیں وہ تو کسی چیز کے بھی خالق نہیں (بلکہ) خود مخلوق ہیں--- (پھر وہ) مردہ (اور بے جان) ہیں۔ زندہ (بھی) نہیں ہیں--- اور ان کو تو یہ بھی خبر نہیں کہ وہ (مرنے کے بعد دوبارہ) کب اٹھا کھڑے کئے جائیں گے۔

۱- اگر آپ نے مندرجہ بالا آیات کے تینوں ترجمے غور سے پڑھے ہیں تو آپ اب خود بھی ان چیزوں کی ایک فہرست بنا سکتے ہیں ' جن کو ان آیات میں بار بار "نشانات" کہا گیا ہے۔ غالباً آپ یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ ان میں سے کس کس چیز کا ذکر یونٹ کے گزشتہ سبقوں میں پہلے بھی آ چکا ہے۔ اگر آپ آگے پڑھنے سے پہلے ان چیزوں کے نام (ترجمہ کی مدد سے) ایک کاغذ پر لکھ لیں اور پھر نیچے دی گئی عبارت سے اسے ملائیں تو اس طرح آپ اپنی ذہانت کا ہلکا سا امتحان خود ہی لے سکتے ہیں۔ اپنے نمبر خود لگا لیجئے گا۔

Marfat.com

۲- ان آیات میں درج ذیل زمینی اور آسمانی عجائبات اور ''نشانات'' پر غور و فکر اور دانش مندانہ مشاہدہ کی دعوت دی گئی ہے:-

۱- بارش اور اس کے فوائد خصوصاً 'پیاس بجھانے'' اور '' نباتات اگانے'' سے اس کا تعلق ---- یہ کتنی عجیب بات ہے کہ زمین کا ۳/۴ حصہ سمندر کے پانی سے گھرا ہوا ہے لیکن ''پینے کے پانی'' اور آب پاشی کے لیے پانی'' کی فراہمی ہمیشہ سے انسان کا ایک مسئلہ ہے۔ ان مقاصد کے لیے ''واقعی آسمان سے آنے والا پانی'' ہی کام آتا ہے چاہے وہ بارش کی صورت میں آئے یا برف بن کر اور زمین پر یا زیر زمین اس غرض کے لیے پانی کے تمام ذخائر اسی ''آسمانی پانی'' کا نتیجہ ہیں اور اپنی بقاء کے لیے اس کے محتاج ہیں۔

۲- قسم قسم کے پھل دار درخت اور پودے۔

۳- رات دن 'سورج' چاند اور ستاروں کا مسخر ہونا یعنی بعض اٹل اور لگے بندھے قوانین کا پابند ہونا۔

۴- زمین پر پائی جانے والی مخلوق (حیوانات ہوں یا نباتات اور جمادات) میں رنگوں کی بو قلمونی (جو آنکھ کو دعوتِ نظارہ اور عقل کو دعوتِ فکر دیتی ہے۔

۵- سمندر' اس کے منافع اور انسان کی غذائی جمالیاتی ضروریات سے اس کا تعلق خصوصاً بحری جہازرانی کی اقتصادی و معاشی اہمیت۔

۶- پہاڑ اور چٹانیں اور زمین کی حرکت کو متوازن رکھنے میں ان کی اہمیت۔

۷- قدرتی سفری راستوں اور لمبے سفروں میں رہنمائی کے قدرتی نشانات کی حیثیت سے دریاؤں' زمین کے طبعی خدوخال اور ستاروں کا کردار۔

ان میں سے ایک ایک موضوع میں انسانی مشاہدہ اور سائنسی علوم کے کئی کئی گوشے شامل ہیں اگر آپ ''جنرل سائنس'' کی کوئی عام فہم سی کتاب ہی پڑھ لیں تو

Marfat.com

بہت فائدہ ہو گا۔

۳- آپ نے غور کیا کہ ان آیات میں بار بار کس طرح "غوروفکر کرنے والوں" "عقل سے کام لینے والوں" "نصیحت پکڑنے والوں"۔ "شکرگزار بننے والوں" اور " رہنمائی کے طلبگاروں "کو ان مظاہر فطرت کے اندر پوشیدہ عجائبات کی تلاش اور دریافت پر آمادہ کیا گیا ہے اس لئے ان میں خالق کائنات کی عظمت ' اس کی توحید' اس کے علم اور اس کی قدرت کے نشانات ہیں۔

۴- اللہ (تعالیٰ) کی ان قدرتوں اور اس کی انسان پر حدوشمار سے باہر نعمتوں کے اس مشاہدہ سے انسان کے دل پر توحید کا نقش گہرا ہوتا جاتا تھا۔ ایک طرف ہر شے کا پیدا کرنے والا ' ہر شے کے ظاہر اور باطن سے باخبر ' زندگی اور زندگی کی نعمتیں دینے والا معبود حقیقی--- اور دوسری طرف بے جان ' مردہ ' کچھ پیدا نہ کرنے والے بلکہ مخلوق (پیدا کئے ہوئے) اور خود اپنے بارے میں بھی بے خبر ' چند انسانوں کے خود ساختہ معبود ---(اور جو انہیں "معبود" سمجھتے ہیں وہ بھی ان کو من دون اللہ (اللہ سے نیچے ہی) رکھتے ہیں۔ مگر دعاؤں میں پھر بھی انہیں کو پکارتے ہیں)--- اب سوچو! عقل و تفکر کیا کہتے ہیں؟

۵- الله الذی رفع السموت بغیر عمد ترونها ثم استوی علی العرش وسخر الشمس والقمر. کل یجری لاجل مسمی. یدبر الامر یفصل الآیت لعلکم بلقاء ربکم توقنون وهو الذی مد الارض وجعل فیها رواسی و أنهرا. ومن کل الثمرات جعل فیها زوجین اثنین یغشی الیل النهار. إن فی ذلك لآیت لقوم یتفکرون. وفی الارض قطع متجورات و جنت من اعناب و زرع ونخیل صنوان و غیر صنوان یسقی بماء واحد ونفضل بعضها علی بعض فی الاکل. إن فی ذلك لآیت لقوم یعقلون. (الرعد/۲-۴)

اللہ (وہ) ہے جس نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے بغیر اونچا کھڑا کیا جو تمہیں نظر آتے ہوں پھر وہ عرش پر جلوہ فرما ہوا اور اس نے آفتاب اور مہتاب کو (بعض قوانین

Marfat.com

کا) پابند بنایا اور (اس نظام شمسی کی) ہر چیز ایک وقت مقرر تک کے لیے (بڑی باقاعدگی کے ساتھ) چل رہی ہے۔ ہر کام کی تدبیر (اور دنیا کا سارا انتظام) اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ وہ (اپنی قدرت کی نشانیاں اور) آیات تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم اپنے پروردگار کے پاس حاضر ہونے کا یقین کر لو---- اور وہ (ہی) ہے جس نے زمین پھیلا رکھی ہے اور اس میں پہاڑ (گاڑ) رکھے ہیں اور دریا (بہائے) ہیں۔ اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے جوڑے (نر و مادہ) پیدا کئے ہیں وہی دن کو رات سے (گویا ڈھانپ (کر چھپا) دیتا ہے۔

ان (سب چیزوں) میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں اور (پھر دیکھو کہ) زمین میں (کئی قسم کے) قطعے (اور رقبے) ہوتے ہیں جو (یوں تو) ایک دوسرے سے متصل واقع ہوتے ہیں (مگر زمین کا فرق ہوتا ہے پھر ان مین کہیں) انگور کے باغات ہوتے ہیں (تو کہیں) کھیتیاں (اور کہیں) کھجور کے درخت ہیں۔ جن میں بعض ایسے کہ ایک کی جڑ دوسرے سے ملی ہوئی اور بعض کی اکیلی جڑ (بن ملی) ہوتی ہے۔

(پھر) ان سب کو ایک پانی سیراب کرتا ہے مگر ہم پھل (کی مقدار' نوعیت اور غذائیت) کے لحاظ سے' ان میں سے کسی کو کسی سے بہتر بنا دیتے ہیں۔ اس (سارے بیان) میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

ا- ان آیتوں میں اللہ تعالی کی بعض صفات قدرت بیان ہوئی ہیں---قرآن کریم نے ایک اللہ ہی کی عبادت کرنے اور اسی سے دعائیں مانگنے اور مصیبت میں صرف اسی کو پکارنے پر زور دیا ہے۔ اب اگر کوئی یہ پوچھے کہ آخر وہ "اللہ" ہے کون؟ تو اس کے جواب میں نہ تو اللہ دکھایا جا سکتا ہے نہ اس پر انگلی رکھ کر بتایا جا سکتا ہے کہ "یہ ہے اللہ"---ایسے سوالوں کے جواب میں--- اور اللہ تعالیٰ کو دوسرے مصنوعی انسانی معبودوں سے ممتاز کرنے کے لیے---قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی ایسی قدرتوں اور صفات کا ذکر کرتا ہے جن کے متعلق دنیا کے کسی بھی فرضی دیوتا یا "خدائے معبود" کے

Marfat.com

بارے میں یہ نہیں کہا گیا اور نہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کام تو "فلاں" بھی کرتا یا کر سکتا ہے۔ مشرک لوگ اپنے فرضی اور خود ساختہ "معبودوں" سے زیادہ سے زیادہ کچھ نفع نقصان کی قدرت منسوب کر دیتے ہیں۔ اس طرح قرآن کریم کا بیانِ توحید---اللہ کے سوا تمام "معبودوں" کا مکمل اور ہر طرح سے خاتمہ کر دیتا ہے--- اب ذرا غور سے دیکھئے ان آیات میں "اللہ" کی شناخت کس طرح کرائی گئی ہے اور کس طرح اس کی قدرت ' نصرت اور "اختیارات" کا بیان ہوا ہے کہ اس کے سوا باقی ہر "معبود" کی (جسے دنیا میں کہیں بھی پوجا گیا ہو) کا "خدائی" خود بخود صفر رہ جاتی ہے۔

(۲) یہ صفاتِ قدرت یا نشاناتِ عظمتِ خالق حسب ذیل ہیں:-

(۱) آسمانوں کی بلندیاں اور ان کے غیر مرئی (دکھائی نہ دینے والے) ستون۔

(۲) سورج اور چاند کی تسخیر اور ان کی مقرر مدتیں

(۳) سطح زمین کی بناوٹ اور سجاوٹ

(۴) پہاڑوں کی گرانی اور دریاؤں کی روانی

(۵) پھل دار درختوں میں نر اور مادہ کا امتیاز (نوٹ: نر و مادہ کا نظام نباتات اور حیوانات کی پوری دنیا میں موجود ہے اور پھل دار پودوں میں اس نظام کے پائے جانے سے تو کم تعلیم یافتہ لوگ بھی واقف ہیں)۔

۶- دن اور رات کی باقاعدہ تبدیلی

۷- باہم متصل قطعہ ہائے زمین کی مٹی کی مختلف قسم کی خصوصیات (جس سے زراعت والے بخوبی واقف ہیں)۔

۸- مختلف پھل دار درختوں اور پودوں کی جدا جدا "نسلی" خصوصیات بلحاظ پیداوار وغیرہ۔

۹- پانی کا غذا سے تعلق۔

۳- صرف ان "چند" نشاناتِ قدرت پر غور و فکر کرنے سے ہی اہل عقل و دانش

Marfat.com

اور اصحابِ فکر و نظر پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ یہ سب کام کسی ایک ہی مدبر کی قدرت اور تدبیر پر گواہ ہیں اور یہ بات ضرور ذہن میں آتی ہے کہ جو ہمیں وجود میں لایا ہے ہم مر کر ضرور اس کے پاس جانے والے ہیں۔ گویا یہ آیات یا نشانات بیک وقت "توحیدِ رب" اور "رب کے پاس حاضری" دونوں پر دلالت کرتے ہیں۔ ویسے تفصیلات جانے بغیر صرف مذکورہ بالا عنوانات کے ذکر سے بھی قدرت الٰہیہ کا ایک تصور قائم ہو جاتا ہے آپ نے غور کیا کتنی "نشانیاں" بار بار بیان ہو رہی ہیں۔ مقصد تصورِ توحید کو ذہن میں نقش کرنا ہے۔

(٦) والله انزل من السماء مآء فاحيا به الارض بعد موتها. ان فى ذالك لاية لقوم يسمعون. و ان لكم فى الانعام لعبرة. نسقيكم مما فى بطونه من - بين فرث و دم لبنا خالصا سآئغا للشربين. ومن ثمرات النخيل و الاعنب تتخذون منه سكرا و رزقا حسنا. ان فى ذلك لاية لقوم يعقلون. و اوحى ربك الى النحل ان اتخذى من الجبال بيوتا و من الشجر و مما يعرشون. ثم كلى من كل الثمرات فاسلكى سبل ربك ذللا يخرج من بطونها شراب مختلف الوانه فيه شفآء للناس. ان فى ذلك لاية لقوم يتفكرون. والله خلقكم ثم يتوفكم و منكم من يرد الى ارذل العمر لكى لا يعلم بعد علم شيا. ان الله عليم قدير. (سورة النحل: ٦٥ — ٧٠)

اور اللہ (ہی) نے آسمان سے پانی برسایا اور (یکایک) مردہ پڑی ہوئی زمین میں اس (بارش) کی بدولت (گویا از سرِ نو) جان ڈال دی۔ یقیناً اس میں (بات کو کان دھر کر) سننے والوں کے لیے ایک (بڑی) نشانی ہے۔

اور (اسی طرح) یقیناً تمہارے لیے مویشیوں میں (بھی) سبق لینے کا سامان (موجود) ہے (کہ کس طرح) ان کے (جسموں کے) اندرونی حصوں سے (اور) گوبر اور خون (کی دنیا) کے درمیان سے ہم تم کو ایسا خالص دودھ پلانے کا بندوبست کرتے ہیں جو پینے والوں کو (ایک خاص) لطف دیتا ہے۔ (اسی طرح) کھجور اور انگور کے پھلوں میں سے بھی (تم کئی فائدے پاتے ہو) کہ اس میں نشہ آور (مشروب) بھی تیار کر لیتے ہو۔ اور (کھانے پینے کی) عمدہ (اور پاکیزہ)

Marfat.com

چیزیں بھی۔ یقیناً اس میں (بھی) عقل سے کام لینے والوں کے لیے (قدرت کا) ایک بڑا نشان موجود ہے۔

اور (پھر دیکھو کس طرح) تمہارے رب نے شہد کی مکھی میں (جبلی ہدایت اور الہام کے طور پر) یہ بات ڈال دی۔ کہ (جا) تو پہاڑوں میں' درختوں اور اونچی جگہوں پر اپنے چھتے بناتی رہ اور ہر طرح کے پھلوں (اور پھولوں) کا رس چوستی پھر۔ اور اپنے رب کی آسان کردہ راہوں پر چلتی رہ۔ اس مکھی کے پیٹ میں سے (ہی) ایک شربت نما سیال (یعنی شہد) نکلتا ہے جو کئی رنگوں کا ہوتا ہے اور جس میں لوگوں (کی بہت سی بیماریوں) کے لیے شفاء (رکھی گئی) ہے۔ یقیناً اس میں (بھی) غوروفکر کرنے والوں کے لئے ایک (بڑی نشانی (موجود) ہے۔

(اور دیکھو) اللہ تعالیٰ (ہی) نے تم کو پیدا کیا پھر وہ (ہی) تمہاری روحیں قبض کرے گا اور تم میں سے کوئی تو عمر کے بدترین حصے (انتہائی بڑھاپے) تک پہنچا دیا جاتا ہے (کہ بہت کچھ جان لینے کے بعد (ایک دفعہ پھر طفل ناداں کی طرح) پیر نادان ہو جائے۔ حق یہ ہے کہ اللہ تعالی ہی کامل علم اور کامل قدرت والا ہے۔

(۱) ان آیات مین خدائے علیم و قدیر کی جن قدرتوں اور نعمتوں کی طرف "کان دھرنے والوں" اور "عقل اور غوروفکر سے کام لینے والوں" کو متوجہ کیا گیا ہے۔ مختصرا ان کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

(۱) آسمانی پانی یعنی بارش اور اس کی زندگی بخش قوت۔

(۲) خالص دودھ اور اس کا واحد ذریعہ حصول--- مویشی۔

(۳) کھجور اور انگور کے پھل اور ان سے تیار ہونے والی اشیاء۔

(۴) شہد کی مکھی اور شہد آفرینی--- قدرت الہیہ کے عجائبات کا ایک انگشت بدنداں کر دینے والا نمونہ۔

(۵) انسان کی پیدائش' موت اور بڑھاپے کے مناظر۔

ان "عنوانات" میں سے نمبرا' نمبر ۳ کا ذکر قرآن کریم میں بکثرت آیا ہے۔ آپ کے اس یونٹ میں بھی یہ نشانات کئی دفعہ مذکور ہو چکے ہیں۔ اور ابھی آگے بھی بیان ہوں گے۔ البتہ

Marfat.com

جو بات یہاں خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ وہ یہ ہے کہ پورے قرآن مجید میں "دودھ" اور "شہد" کے بننے کی کیفیت اور ان کے بعض فوائد صرف اسی ایک جگہ بیان ہوئے ہیں۔ اس لیے ان پر مختصر بات کر لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(۲) دودھ اور شہد اللہ تعالیٰ کی دو ایسی عظیم نعمتیں ہیں کہ قرآن کریم میں ایک جگہ (سورۃ محمد: ۱۵) میں ان کو آخرت (بہشت) کی نعمتوں میں شمار کیا گیا ہے۔ اس دنیا میں بھی یہ دونوں چیزیں انسان کے لیے انتہائی فائدہ مند نعمتیں ہیں۔ دونوں میں غذائیت بھی ہے، صحت بخش قوت یعنی "دوائیت" بھی اور لذت کام و دہن کی "جاذبیت" بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انسان کو اس کی ضرورت بھی ہے اور حاصل کرنے کی خواہش بھی۔۔ اور اسی انسانی ضرورت اور خواہش کے صدقے "نقلی شہد" اور "ملاوٹی دودھ" والوں کا کاروبار "چمکتا" ہے۔ قربان جایئے قرآن کریم کے اس بیان پر کہ اس نے "نشان قدرت" اور نعمت کے طور پر اس دودھ (بعض خالص) اور شہد کا ذکر کیا ہے جو کسی انسانی "ہنر" یا کارخانے کی پیداوار نہیں۔ بلکہ۔ جو مویشیوں اور شہد کی مکھی سے حاصل ہوتے ہیں۔

(۳) کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ ایسی لذت بخش، پاکیزہ اور خزانۂ صحت چیزیں حیوانی پیداوار ہیں اور وہ بھی براہ راست جاندار کے پیٹ کے اندر سے نکلنے والی۔۔ ایک مویشیوں کے پیٹ سے۔۔ (آپ نے نوٹ کیا ہوگا، مندرجہ بالا آیات میں دونوں جگہ لفظ "بطون" آیا ہے جو بطن (پیٹ) کی جمع ہے)۔

"دودھ اور دودھ دینے والے جانور" اور "شہد اور شہد کی مکھی" پر انسانی مشاہدات اور تجربات کے نتائج اور معلومات اتنی وسیع ہیں کہ اب دنیا بھر کی زرعی یونیورسٹیوں میں یہ مستقل مضامین کے طور پر پڑھائے جاتے ہیں اور ان پر تحقیقات کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ بیسیوں کتابیں صرف ان دو موضوعات سے متعلق لکھی جا چکی ہیں۔۔۔ انسان نے دودھ اور شہد پیدا کرنے والے "حیوانات" کو پالتو بنا کر ان کی عادات اور ان کے جسمانی نظام کے ایک ایک عضو کے کام کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر لیا ہے۔ شہد اور دودھ کے کیمیائی تجزیہ سے اس کے ایک ایک عنصر ترکیبی کا پتہ چلا لیا ہے۔ مگر دنیا کی کوئی لیبارٹری "خالص دودھ" اور "خالص شہد" تیار

Marfat.com

نہیں کر سکتی۔ خالق کائنات کی قدرت و عظمت کا یہ کتنا بڑا نشان ہے کہ اس نے یہ لیبارٹری یا کارخانہ جانداروں کے پیٹ میں لگا رکھا ہے۔ اسی جگہ خوراک مختلف شکلیں اختیار کرتی ہے۔ کچھ خون بنتی ہے کچھ فضلات (گوبر) اور کچھ دودھ یا شہد کی صورت میں باہر آتی ہے۔

جانوروں کی فطری عادات اور خصوصاً شہد کی مکھیوں کے عجیب و غریب مکمل "معاشرتی نظام" کے مطالعہ سے اللہ کی دی ہوئی جبلی ہدایات کا جو نمونہ سامنے آتا ہے اس سے بے اختیار ذہن میں "وحی الٰہی" کی ضرورت اس کی بے خطا ہدایت ہونے کا احساس ابھرتا ہے۔ (نوٹ: اگر ہو سکے تو شہد اور شہد کی مکھی پر اردو میں کوئی کتاب یا مضمون ضرور پڑھ لیجئے گا۔ اور ایسی کتاب بآسانی مل سکتی ہے۔ یہ مطالعہ آپ کے لیے انتہائی دلچسپ بھی ہوگا۔ اور مندرجہ بالا آیات کی روشنی میں ایمان پرور بھی)۔

(۷) ان الله فالق الحب و النوىٰ یخرج الحی من المیت و مخرج المیت من الحی. ذلکم الله فانی توفکون. فالق الاصباح وجعل الّیل سکنا والشمس والقمر حسبانا. ذلك تقدیر العزیز العلیم. و هو الذی جعل لکم النجوم لتهتدوا بها فی ظلمت البر و البحر. قد فصلنا الایت لقوم یعلمون. و هو الذی انشاکم من نفس واحدة فمستقر و مستودع. قد فصلنا الایت لقوم یفقهون. وهو الذی انزل من السماء ماء فاخرجنا به نبات کل شی فاخرجنا منه خضرا نخرج منه حبا متراکبا ومن النخل من طلعها قنوان دانیة و جنت من اعناب و الزیتون والرمان مشتبها و غیر متشابه. انظروا الی ثمره اذا اثمر و ینعه. ان فی ذلکم لایت لقوم یومنون (الانعام/ ۹۵۔ ۹۹)

بے شک اللہ تعالیٰ ہی دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے (اور اس سے پودا اگانے) والا ہے۔ وہ ہی جاندار کو بے جان سے نکالتا ہے اور وہی بے جان کو جاندار سے نکالنے والا ہے۔ وہ ہی تو اللہ ہے (جس کی توحید کے یہ دلائل ہیں) پھر تمہاری مت کدھر ماری جا رہی ہے؟

وہی (پو پھٹتے وقت پردہ شب کو) چاک کر کے صبح کی روشنی لانے والا ہے اور اس نے رات کو آرام و سکون کے لئے بنایا ہے اور سورج اور چاند (کے طلوع و غروب) کو دن رات اور ماہ و سال کے) ایک (باقاعدہ) حساب سے مقرر کیا ہے۔ یہ سب اس زبردست قدرت اور علم رکھنے

Marfat.com

والے کے (باندھے ہوئے) اندازے ہیں۔ اور وہ ہی جس نے تمہارے لئے ستاروں کو بیابان اور سمندر کی (راتوں کی) تاریکیوں میں (بھی راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا (دیکھو) ہم نے اہل علم کے لیے اپنی نشانیاں تفصیل کے ساتھ بیان کر دی ہیں۔ اور وہ ہی ہے جس نے تم سب کو (ابتداء) ایک ہی جان سے پیدا کیا پھر (ہر ایک کے لئے) ٹھہرنے اور (پھر آگے) سونپے جانے کے لئے ایک وقت اور جگہ (مقرر کر دی) ہے۔ (اپنی قدرت کی یہ) نشانیاں ہم نے لوگوں کے لئے کھول کر بیان کر دی ہیں جو بات کی تہ تک پہنچ جانے والے ہیں اور وہ (بھی ہم ہی ہیں) جس نے آسمان سے پانی برسایا - پھر ہم نے (ہی) اس (پانی) کے ذریعے ہر قسم کی نباتات کے (ابتداء) کو یے (LVD) نکالے۔ پھر ہم نے اس (کو یے) سے ہری ہری (کونپلیں اور شاخیں) نکالیں۔ جن سے ہم (ایک وقت آنے پر) باہم گتھے ہوئے دانے نکالتے ہیں۔ اور (اسی طرح ہم نے) کھجور کے گابھوں (شگوفوں) سے خوشے (نکالے) کہ (پھل کے بوجھ سے) جھکے پڑتے ہیں۔ اور انگور' زیتون اور انار کے باغات (اگائے) جو بعض باتوں میں) ملتے جلتے بھی ہوتے ہیں اور (بعض دفعہ) ملتے جلتے نہیں ہوتے۔

(پھر) تم ذرا غور سے دیکھو اس (ایک ایک پودے اور ایک ایک (درخت) کے پکنے (کی کیفیت) کو بھی (دیکھو)۔ (الغرض) ان (تمام چیزوں) میں (قدرت خالق کی بڑی) نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (کچھ بھی) ایمان رکھتے ہیں۔

(۱) ان آیات میں اللہ تعالی کی قدرت کاملہ کے مندرجہ ذیل عجائبات پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔

(۱) عالم نباتات جس میں مختلف پودوں اور درختوں کا اگنا' بتدریج بڑا ہونا' پھل لگنا اور پکنا۔۔ غرض ایک ایک مرحلہ مجموعہ آیات و نشانات ہیں۔

(۲) جاندار اور بے جان چیزوں میں زندگی کے وجود اور فقدان کی پیچیدہ داستان۔

(۳) چاند سورج اور ستاروں کا منضبط نظام' ان کی روشنی اور طلوع و غروب کے مناظر اور انسانی زندگی اور انسانی علوم پر ان کے اثرات۔

(۴) آسمانی پانی (بارش) اور نباتات کا باہمی تعلق۔

Marfat.com

(۵)   انسانی زندگی کا آغاز اور بعد کے مختلف مراحل۔

آپ نے دیکھا اور محسوس کیا ہو گا کہ ان تمام "نشانات" کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے۔ صرف انداز بیان مختلف ہے اور یہ بھی قرآن کریم کا ایک معجزہ ہے کہ وہ دل نشین کرانے کے لیے ایک ہی بات اور ایک ہی مضمون اس انداز تکرار سے موضوع کی اہمیت کے علاوہ اس کے مختلف پہلو بھی واضح ہو جاتے ہیں۔

(۲)   اگر بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے اور یہ کوشش کرنی چاہیے کیونکہ ایسا کرنے والوں (قوم یفقهون) کی ایک طرح سے ان ہی آیات میں تعریف آئی ہے۔۔۔ تو عجائبات قدرت کے اس بیان سے تین باتیں ثابت ہوتی ہیں اور یہی تین اسلام کے بنیادی حقوق ہیں:

(۱) توحید   (۲) آخرت   (۳) رسالت

اور اس طرح کہ:

(۱)   کائنات کے ان مختلف عجائبات میں کسی ایک ہی زبردست علم و قدرت والی ہستی کا ہاتھ کارفرما نظر آتا ہے۔ وہی اللہ ہے اور وہ ایک ہی ہے۔ علم اور قدرت میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے اور

(۲)   جو ذات مادہ (MATTER) اور طاقت (ENERGY) کو پیدا کر کے ان میں ایسی ایسی تبدیلیاں کرنے پر قادر ہے جن کا مشاہدہ نباتات و حیوانات اور نظام شمسی میں کیا جا سکتا ہے اس کے لیے مردہ کو دوبارہ زندگی دینا کون سا مشکل کام ہے۔ وہ تو ہر آن اور ہر وقت بے جان کو جاندار بنانے اور پھر اسے بے جان بنا دینے کا عمل ہمیں دکھا رہا ہے۔ موت کے بعد زندگی پر یقین اتنا عجیب نہیں ہے جتنا اس سے انکار عجیب لگتا ہے۔ اور

(۳)   جس خالق اور مالک نے انسان کے لیے خشکی اور سمندر کی وسعتوں مین سورج چاند ستاروں کے ذریعے سمت اور وقت کا تعین کر کے رہنمائی پالینے کا بندوبست کیا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے زندگی بسر کرنے کے طریقے میں خواہشات کے اندھیروں سے بچانے کے لیے نبوت و رسالت کی روشنی اور وحی کی رہنمائی کا انتظام نہ کیا ہو؟

Marfat.com

(۸) الف　والارض مددنها و القينا فيها رواسی و انبتنا فيها من كل شی موزون. وجعلنا لكم فيها معايش ومن لستم له برازقين. وان من شی الا عندنا خزائنه وما ننزله الا بقدر معلوم. و ارسلنا الريح لواقح فانزلنا من السمآء مآء فاسقينكموه وما انتم له بخزنين. و انا لنحن نحيی و نميت ونحن الوارثون. (الحجر / ۱۹۔۲۳)

اور زمین کو ہم نے (ہی) پھیلایا (ہے) اور اس میں (پہاڑوں کے) بھاری بوجھ ڈال دیئے (ہیں) اور اس میں (جگہ جگہ کے لحاظ سے) ہر قسم کی موزوں ترین نباتات اگائی (مزید بر آں) ہم نے اس کے اندر (نہ صرف) تمہاری معاشی ضروریات کا سامان بنایا بلکہ اس (مخلوقات کی روزی) کا بھی (بندوبست کیا) جس کے روزی رساں تم نہیں ہو (اور نہ ہو سکتے ہو۔)

کوئی چیز ایسی نہیں جس کے ہمارے پاس خزانے نہ (بھرے پڑے) ہوں۔ مگر ہم اسے صرف ایک مقدار سے لاتے (رہتے) ہیں۔

اور ہم نے (ہی) ہوائیں بھیجیں جو (بادلوں کو آبی بخارات) سے بوجھل اور (نباتات کو عمل زیرگی۔(RASS POLLINATION) کے ذریعے) بارود کرتی چلی جاتی ہے۔

پھر ہم نے (ہی) آسمان سے پانی برسایا۔ پھر وہ تمہیں پینے کو دیا اور تم اس (دولت) کے خزانہ دار نہیں ہو اور ہم ہی ہاں ہم ہی زندہ کرتے اور مارتے ہیں اور ہم ہی وارث رہیں گے۔

(۸ ب)　تبرك الذی بيده الملك و هو علی كل شی قدير. الذی خلق الموت والحيوة ليبلوكم ايكم احسن عملا. وهو العزيز الغفور. الذی خلق سبع سموت طباقا. ما تری فی خلق الرحمن من تفوت. فارجع البصر هل تری من فطور. ثم ارجع البصر كرتين ينقلب اليك البصر خاسئا وهو حسير. (الملك / ۱۔۴)

(بہت بڑی) برکتوں (اور شان) والا ہے وہ (اللہ) جس کے قبضہ (قدرت) میں ساری (کائنات کی) سلطنت ہے۔ اور وہ ہر چیز پر (کامل) قدرت رکھتا ہے۔ جس نے موت اور حیات (کے سلسلے کو) اس لئے بنایا کہ وہ تم (لوگوں) کو آزما (کر دیکھ) لے کہ تم میں سے کون بہتر عمل (کرنے والا ہے۔ اور وہ زبردست غلبہ والا (بھی) ہے اور (ساتھ ہی) نہایت بخشنے والا (بھی)۔

Marfat.com

وہی جس نے سات آسمان (ایک دوسرے پر) تہ بر تہ بنائے تم کو (اس) بے حد مہربان (خدا) کی صفت (اور خلقت) میں کسی قسم کا سر موتفاوت نظر نہیں آئے گا۔ سو تم (پھر) پلٹ کر دیکھو کیا (کہیں بھی) کوئی رخنہ یا خلل نظر آتا ہے۔

دوبار (بلکہ بار بار) نگاہ دوڑاؤ (ہر بار) تمہاری نگاہ تھک کر ناکام پلٹ آئے گی (مگر کہیں انگلی دھرنے کی جگہ نہیں ملے گی۔)

(ا) یہ دو مختلف سورتوں کی آیات ہیں جن کو مضمون کی مناسبت سے ایک ہی سبق میں جمع کر دیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا آیات پر غور کر کے اگر ہم ان میں بیان کردہ نشانات قدرت اور صفات الٰہیہ کو مختصر عنوانات کی شکل میں لکھنا چاہیں تو وہ کچھ یوں بنتے ہیں۔

(۱) زمین کا پھیلاؤ اور اس کی سطح میں ایسی تبدیلیاں جن سے وہ انسانوں کے رہنے کے قابل ہوئی۔

(۲) زمین پر پہاڑوں اور چٹانوں کی موجودگی۔

(۳) زمین پر نباتات کا وجود اور اس کا حد درجہ متوازن نظام۔

(۴) انسان کی تمام معاشی اور مادی ضروریات بلکہ بے شمار قسم کی مخلوقات کی بقاء کا زمین پر انحصار۔

(۵) ہواؤں' بادلوں اور بارش کی کارکردگی اور پینے کے پانی کے ذخائر سے ان کا تعلق۔

(۶) موت اور حیات کا منظر اور اس کی غرض و غایت۔

(۷) اللہ کی زبردست قدرت اور غلبہ کے ساتھ اس کی بخشش اور مہربانی کے مظاہر اور

(۸) کائنات کے اس عظیم الشان ڈیزائن کا تنقیدی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے بغور اور بار بار مشاہدہ کرنے کی دعوت۔

آپ نے دیکھا کہ ان موضوعات میں سے اکثر پہلے بھی بیان ہو چکے ہیں۔ ان چیزوں کا بنظر غائر مشاہدہ۔ ان کی اصل واحد کے بارے میں تفکر اور تدبر --- یہ صرف ان آخری آیات کا

Marfat.com

ہی نہیں بلکہ اس یونٹ میں شامل تمام آیات کا مرکزی مضمون ہے۔ البتہ ان (آخری) آیات میں ایک ایسی بات بیان کی گئی ہے جو براہ راست مشاہدہ سے خودبخود ذہن میں نہیں آسکتی اور وہ ہے زندگی اور موت کے اس منظر (PHANOMENON) کی غرض و غایت کیا ہے؟ کوئی نہیں؟ محض کھیل ہے؟ اگر نہیں تو پھر آخر وہ مقصد ہے کیا؟ سورۃ الملک کی دوسری آیت میں یہی بات سمجھا دی گئی ہے۔

(۲) یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے اور اس کے عجائبات کے گہری مشاہدہ اور غور فکر سے --- جسے ہم آج کل کی زبان میں سائنسی علوم کہتے ہیں۔ ان کے ذریعے انسان کے اندر زیادہ سے زیادہ "خالق کائنات" کے وجود کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر اس کائنات کا مقصد تخلیق کیا ہے؟ اور اس کے خالق کے ساتھ ربط اور تعلق کیسے قائم ہوا ہے؟ یہ سائنس کا میدان نہیں ہے۔ یہاں انبیاء کی رہنمائی کے بغیر انسان ٹھوکر کھاتا ہے۔ اس کائنات کے پروردگار۔ اللہ تعالیٰ۔۔ کے ساتھ تعلق اور اس کا قرب "روحانیت" ہے اور محض سائنسی مشاہدہ نری "مادیت" ہے۔ قرآن کریم نے جس طرح انبیاء کرام کی روحانی تعلیمات کے ساتھ ساتھ مشاہدہ کائنات۔۔ ہر دو پہلو۔۔۔ تفکر اور تدبر کی دعوت دی ہے۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ تفکر کے بغیر روحانیت "بے جڑ" (ROOTLESS) ہے اور روحانیت کے بغیر تفکر "بے ثمر" (FRUITLESS) ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

تعارف

ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہم آپ کو اس عنوان کے معنی بتا دیں' اگرچہ یہ لفظ مسلمانوں کی تحریر و تقریر میں اکثر استعمال ہوتا ہے' تاہم بہت سے لوگوں کو اس کا پورا مطلب معلوم نہیں ہوتا اور اس کے تلفظ میں تو اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ غلطی کر جاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ خالص عربی ترکیب' ایک دینی اصطلاح ہونے کی وجہ سے' ہمارے ہاں رائج تو ہوگئی۔ مگر عربی زبان نہ جاننے والے اس کے درست تلفظ سے معذور رہتے ہیں۔ اس عنوان کا درست تلفظ اور اس کے معنی یوں ہیں:-

(ا) امر (اسے امر نہیں کہنا۔ یہ ایسی بے عملی ہوگی جیسے وقت کو وقت اور علم کو علم کہنا) کے معنی ہیں "حکم دینا" اور نہی (خیال رہے اسے "نہی" نہیں پڑھنا اور نہ ہی "نہی" پڑھنا ہے) کے معنی ہیں "روک دینا۔ منع کرنا"۔ ہم نے جو "ر" اور "ی" کے اوپر تنوین کے دو پیش لگائے ہیں۔ اردو میں یہ نہیں بولے جاتے بلکہ "ر" اور "ی" ساکن پڑھی جاتی ہیں جیسے صبر اور سعی ہیں۔ المعروف کا مطلب ہے "جانا پہچانا ہوا" اسی سے اردو میں ایک ترکیب نیک مشہور اور معروف کے معنی ہیں ایسی نیکی اور بھلائی جس کا نیکی اور بھلائی ہونا کوئی ڈھکی چھپی بات نہ ہو بلکہ سب اسے اچھا کام سمجھتے ہوں۔

اسی طرح "المنکر" کے معنی ہیں "نا آشنا" اجنبی جس کی شناخت نہ ہو سکتی ہو" اسلامی دینی اصطلاح کے طور پر ہر قسم کی بدی یا برائی کو "منکر" کہتے ہیں یعنی جسے سب سے برا اور ناپسندیدہ سمجھیں۔ خیال رہے کہ "جانا پہچانا" اور "نا آشنا" کی یہ صفت' نیکی یا بدی پر' اسلامی معاشرے اور اسلامی ذہن کے اعتبار سے ہے۔ مثلاً نماز' روزہ مسلمانوں کے ہاں جانی پہچانی نیکی

Marfat.com

ہے۔ اسی طرح شراب پینا یا مثلاً عورت کے سر کے بال کٹانا، مسلمانوں کے ہاں سخت گناہ اور برائی ہے۔ مسلمانوں کے ہاں ایسا نہیں کیا جاتا۔ اس لیئے ان کے ہاں وہ ایک "فعل منکر" یعنی ناپسندیدہ کام ہے (یوں سمجھئے کہ اسے اسلامی شریعت نے کوئی "شناختی کارڈ" نہیں دے رکھا۔)

لفظی معنوں کی وضاحت میں یہ بھی جان لیجئے کہ بالمعروف کی "ب" (کے ساتھ) اور عن المنکر میں "عن" (سے) کا استعمال فعل کی وجہ سے ہے مثلاً آپ اردو میں کہتے ہیں:- بات کرنے "کو" کہنا اور کرنے "سے" روکنا۔۔۔ جو کام یہاں "کو" اور "سے" کا ہے وہی اس ترکیب میں "ب" اور "عن" کا ہے اس طرح "امر بالمعروف" اور نھی عن المنکر" کا اصطلاحی معنی ہے۔ ہر قسم کی بھلائی اور نیکی کا حکم دینا یا اس کی تلقین کرنا اور ہر قسم کی برائی اور بدی سے منع کرنا یا روک دینا۔"

اپنے اصطلاحی معنوں میں یہ مسلمانوں کے دینی فرائض مثلاً نماز، روزہ، زکوۃ اور جہاد وغیرہ کی طرح ایک دینی فریضہ ہے اور اس یونٹ میں اس موضوع پر اسی حیثیت سے بات کی جائے گی مگر اس "فریضے" کی دینی اور شرعی اہمیت سے پہلے ہم انسانی معاشرے (اسلامی ہو یا غیر اسلامی) کے لیے اس کام کی ضرورت اور اہمیت پر کچھ کام کرلیں تو بہتر ہوگا۔

(۲) انسان کو "معاشرتی جانور" (Social Animal) کہا گیا ہے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ معاشرہ بنا کر رہتا ہے۔ جانور اور پرندے الگ الگ زندگی گزار سکتے ہیں لیکن انسان کے لیے یہ ممکن نہیں۔ وہ اپنی بنیادی ضروریات روٹی، کپڑا اور مکان تک کے لیے دوسروں کے تعاون کا محتاج ہے۔ پنجابی میں ایک کہاوت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "جس آدمی نے سب سے پہلے روٹی کھائی تھی اسے ایک سو ایک کام کرنے پڑے تھے۔ یہ کہاوت اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ تہذیب و تمدن اور صنعت و حرفت اور علوم و فنون تو درکنار (جو بہت بڑے پیمانے پر انسانی تعاون سے فروغ پاتے ہیں) انسان کو تو "جان بچانے" اور زندہ رہنے کے لیے بھی انسانوں کا معاشرہ درکار ہے۔

اب یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جہاں بھی چند انسان اکٹھے رہیں گے تو ہر ایک کی کچھ ضروریات کچھ خواہشات ہوں گی اور ان کا آپس میں تصادم ہوگا۔ سب کو اپنی ضروریات اور

Marfat.com

خواہشات پوری کرنے کی مکمل آزادی دینا تو ممکن ہی نہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سب لڑ لڑ کر مر جائیں گے اور معاشرہ تباہ ہو جائے گا یا پھر بعض طاقت ور یا عیار لوگ اپنے آپ کو دوسروں پر مسلط کر لیں گے اور اپنی ضروریات اور خواہشات پر دوسروں کی ضروریات اور خواہشات کو بھینٹ چڑھادیں گے۔ لہذا ضروری ہے کہ سب کی ضروریات اور خواہشات کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ یہی دین اسلام کا مقصد ہے جو معاشرے کی سلامتی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ معاشرے کے تمام افراد پر بعض کام کرنے لازمی قرار دیئے جائیں اور بعض کاموں سے سب کو روک دیا جائے۔ یہیں سے قانون یا نیکی بدی کی حدیں متعین کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اگر کرنے والے سب کے لیے ضروری نہ ہوں یا بعض افراد ایسے کام کرنے سے جی چرائیں یا اس کے برعکس روک دیئے جانے والے کاموں سے سب کو نہ روکا جائے یا بعض لوگ کام کر گزرنے پر تل جائیں اور ان دونوں قسم کے وہ "نافرمانوں" کو بروقت ٹوک نہ دیا جائے تو پھر معاشرے میں نیکی کا زوال اور بدی کا عروج شروع ہو جائے گا اور ایک نہ ایک دن پورے معاشرے کو لے ڈوبے گا۔ قوموں اور سلطنتوں کی تاریخ کے پاس اس کے بہت سے نمونے موجود ہیں۔

(۳) اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بدی ایک دفعہ شروع ہو جائے اور اسے بروقت نہ دبا دیا جائے تو یہ مہلک جراثیم کی طرح بڑی تیزی سے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ برائی کے بارے میں یہ بھی عام مشاہدہ ہے کہ یہ بالعموم اوپر سے نیچے چلتی ہے۔ پہلے بڑے لوگ، حکمران اور سرکاری افسر ایک برائی میں مبتلا ہوتے ہیں اور حکومت یا عہدے کی وجہ سے ان لوگوں کو روکنا بھی دشوار ہوتا ہے۔ پس پھر یہ ہوتا ہے کہ وہی بدی ایک فیشن یا عام رواج بن کر معاشرے کے نچلے طبقوں میں پھیل جاتی ہے اور بعض دفعہ تو اسے بدی کی علامت کی بجائے "نشان عزت" قرار دے لیا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا امور کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ معاشرے میں نیکی اور بھلائی کو فروغ دینے اور بدی یا برائی کو روکنے بلکہ اس کی جڑ کاٹنے کا عمل مسلسل جاری رہنا چاہیے--- برے کام کرنے کی وجہ انسان کی غلط سوچ بھی ہو سکتی ہے جسے شرعی اصطلاح میں غلط

Marfat.com

عقائد کہتے ہیں۔ اسی طرح نیکی بدی کو خود ساختہ تصورات میں بھی اس کے باعث بن سکتے ہیں۔ انسانی عقل ایک حیرت انگیز قوت ہے۔ دنیا میں انسان نے علوم وفنون اور تہذیب و تمدن اور آج کل سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں جو حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیئے ہیں سب عقل انسانی کے کرشمے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہی عقل انسانی خواہشات اور جذبات سے مغلوب ہو کر نیکی یا بدی میں تمیز کی قوت کھو بیٹھتی ہے اور پھر یہی بے پناہ قوت خود انسان کی تباہی کا سبب بن جاتی ہے۔

(۴) اس لیے تمام رسول اور نبی' انسانوں کو نیکی اور بدی میں تمیز کرنا' اور اس پر عمل کرنا' سکھانے کے لیے آتے رہے۔ تمام انبیاء انسانیت کے محسن ہوئے ہیں کیونکہ وہ اسے تباہی سے بچانے کی کوشش کرتے رہے اور ان کوششوں میں ''امر بالمعروف اور نھی عن المنکر'' کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ تمام انبیاء اور ان کے سب سے پہلے پیرو اپنے اپنے دور میں اس اہم فریضے کے سب سے بڑے علمبردار ہوتے تھے۔ عقائد کی درستی بھی بنیادی طور پر اسی ''فریضہ'' کی طرف راہ ہموار کرتی ہے جب تک کوئی امت اس فریضے سے غافل نہیں ہوئی وہ راہ راست پر رہی۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بہت زور دیا اور قرآن و حدیث کے موضوعات میں سے یہ نہایت اہم موضوع ہے۔ ہمارے آج کے بگڑے ہوئے معاشرے کے بگاڑ کی وجہ اسی فریضے سے غفلت ہے اور اس بگاڑ اور فساد کا علاج بھی اسی فریضہ پر توجہ دینے میں پوشیدہ ہے یہی وجہ ہے کہ دین اسلام کے اس اہم اصول کو جس پر کاربند ہونے والوں کو قرآن کریم نے ''بہترین امت'' کہا۔ اور اس کے متعلق اہم قرآنی تعلیمات کو اس یونٹ کا موضوع بنایا گیا ہے۔

۱- ان اللہ یامر بالعدل و الاحسان و ایتاء ذی القربی وینھی عن الفحشآء والمنکر و البغی یعظکم لعلکم تذکرون. (النحل / ۹۰)

یقیناً اللہ تعالی عدل (وانصاف) کرنے' بھلائی (کے کام) کرنے' اور (تمام) رشتہ داروں (کے حق ان) کو ادا کرنے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی سے اور (ناشائستہ حرکتوں اور) بری باتوں سے اور (باہم ایک دوسرے پر) ظلم و زیادتی (اور سرکشی اور دھاندلی) سے (بالکل) منع کرتا

Marfat.com

ہے۔ وہ تم کو (کیسی عمدہ) نصیحت کرتا ہے ہو سکتا ہے کہ یہ بات تمہارے دل میں اتر جائے۔

جہاں تک اسلام کی تعلیمات کا تعلق ہے' یہ آیت' قرآن مجید کی نہایت اہم اور کلیدی آیات میں سے ہے اور اس میں بڑی جامعیت اور اختصار کے ساتھ دین اور شریعت کے اہم ترین احکام' اوامر و نواہی بلکہ ایک طرح سے سارے دستور حیات کا ایک جامع اور مکمل خاکہ اس آیات مبارکہ کے اندر آگیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے وقت یہ آیت خطبہ جمعہ میں داخل کی گئی تاکہ ہر ہفتہ متواتر امت کے کان میں اس صدائے حق سے آشنا ہوتے رہیں۔ اور اس وقت سے آج تک یہ آیت امت کے خطبات جمع کا فرو بنی ہوئی چلی آرہی ہے۔

آئندہ آپ بھی جمعہ پڑھنے جائیں تو خطبہ میں اس آیت کو غور سے سنیے گا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بھلائی کی تین قسموں کا حکم دیا ہے اور برائی کی تین قسموں سے منع کیا ہے۔ یہ بھلائی اور برائی کو اپنے اندر شامل کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں حسب ذیل نکات کو توجہ سے پڑھئے اور یاد رکھئے۔

(۱) آیت کے پہلے حصے میں تین ایسی چیزوں کا حکم دیا گیا ہے جن پر افراد کی ساری ذاتی خوبیوں اور نیکیوں کا نیز پورے انسانی معاشرے کی فلاح اور بہبود کا انحصار ہے۔ اور وہ یہ ہیں:-

عدل' احسان اور ایتاء ذی القربی۔

(الف) سب سے پہلی چیز عدل ہے۔ عدل انصاف سے زیادہ وسیع لفظ ہے۔ انصاف کے اصل معنی ''دو برابر حصوں میں تقسیم کر دینا'' ہیں۔ مگر عدل میں توازن و اعتدال اور تناسب کا پہلو ملحوظ ہوتا ہے مساویانہ تقسیم کا نہیں۔ بلکہ مساویانہ تقسیم بعض دفعہ بالکل خلاف عدل ہوتی ہے مثلاً ایک اکیلے غریب آدمی اور ایک بڑے کنبے والے غریب آدمی میں زکوۃ کی رقم برابر تقسیم کر دینا۔

عدل کا مطلب ہے ''ہر ایک کو اس کا حق بے لاگ طریقے سے دینا۔ '' اس میں ''عدالتی معاملات'' کے فیصلے بھی آجاتے ہیں اور یہ بھی کہ کسی شخص یا جماعت کے متعلق کوئی فیصلہ کرتے وقت یا کوئی رائے دیتے وقت عدل کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے اور دوسرے کے ساتھ ٹھیک وہی سلوک جو اپنے لئے پسند کرتے ہو۔ عدل کا یہ بھی تقاضا ہے کہ

Marfat.com

معاشرے کے تمام افراد کو ان کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی، قانونی، سیاسی اور تمدنی حقوق ایمان داری کے ساتھ ادا کیے جائیں۔

(ب) دوسری مطلوب چیز "احسان" ہے جس کے معنی ہیں:- ہمدردانہ رویہ، نیک برتاؤ، اچھے سے اچھا سلوک کرنا، برائی کے بدلے نیکی کرنا، اور ایک دوسرے کا پاس لحاظ یا باہم فیاضانہ معاملہ کرنا۔ یہ عدل سے زائد چیز ہے۔

کسی بھی شرعی حکم کو بے دلی اور خانہ پری کے جذبے کے بجائے بطریق احسن انجام دینا، اور عبادات اور اعمال کو بہترین انداز سے ادا کرنا بھی احسان ہے۔ اسی لیے ایک حدیث شریف میں احسان کی تعریف یوں بھی آئی ہے کہ:-

"اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو ورنہ کم از کم اس طرح کہ گویا وہ تمہیں دیکھ رہا ہے (۱)- عدل اگر معاشرے کی اساس ہے تو "احسان" اس کا حسن و جمال ہے۔ کیونکہ احسان سے مراد وہ نیکیاں ہیں جن کا نفع دوسروں تک پہنچے۔ عدل اگر معاشرے کو ناگواریوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں خوشگواریاں اور شرینیاں پیدا کرتا ہے۔ محبت، شکر گزاری، اعلیٰ ظرفی، ایثار اور اخلاص جیسی ذاتی اور اجتماعی خوبیوں اور قدروں کو احسان ہی جنم دیتا ہے۔

(ج) تیسری چیز جس کا آیت میں حکم دیا گیا ہے وہ ہے ایتاء ذی القربیٰ (لفظی ترجمے پر نظر ڈالیے) ذی القربیٰ کا مطلب ہے قرابت والے، رشتہ دار، اور ایتاء کے معنی ہیں "دینا" یا "ادا کرنا"۔ "ایتاء ذی القربیٰ" احسان کی ہی ایک اہم اور افضل صورت ہے جس کا تعلق رشتہ داروں سے ہے۔ اس کے لیے ایک اور لفظ "صلۂ رحمی" بھی استعمال ہوتا ہے اور اس سے مراد لیا جاتا ہے غریب رشتہ داروں کی مالی امداد اور دیکھ بھال۔ یہ معنی بھی درست ہیں کیونکہ بعض خوشحال لوگ اپنے غریب رشتہ داروں کی امداد تو درکنار ان سے اپنی رشتہ داری ظاہر کرنے میں بھی عار محسوس کرتے ہیں مگر اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ خاندان اور برادری

۱- ان تعبداللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک

Marfat.com

کے پہلو سے مساوات کی بناء پر بعض دفعہ ایک غریب رشتہ دار اپنے امیر رشتہ دار کے معاشرتی اور معاشی امتیاز کو ہیچ جانتا ہے اور اس کی امداد قبول کرنے کو ہتک سمجھتا ہے۔ اس طرح قریبی رشتہ داروں کیساتھ حسن سلوک جتنا ضروری ہے' اتنا دشوار بھی ہے پھر یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ بظاہر رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک ایک فطری اور جبلی بات معلوم ہوتی ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ اجتماعی جھگڑوں اور حق تلفیوں کا آغاز بھی قریبی رشتہ داروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو بھائی بہن ہی ماں باپ کے سامان اور جائداد پر لڑتے ہیں اور غالبا یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اور حدیث شریف میں قریبی رشتہ داروں کے حق ادا کرنے اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کی بہت ہی تاکید آئی ہے--- اور ہاں خیال رہے کہ ناجائز کنبہ پروری اور خویش نوازی (Nepotism) کا اس "ایتاء" اور "احسان" کے ساتھ ہرگز کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ اس کی بنیاد کسی دوسرے کی حق تلفی اور "ایذاء" پر ہوتی ہے جو شرعا حرام اور ممنوع ہے۔

(۲) آیت کے دوسرے حصے میں تین بھلائیوں کے مقابلے میں--- اللہ تعالی نے تین ایسی برائیوں سے منع فرمایا ہے جو افراد کی ذاتی خوبیوں اور نیکیوں کو بھی برباد کر دینے والی اور اجتماعی حیثیت سے پورے معاشرے کو تباہ کر دینے والی ہیں۔ اور یہ ہیں:-

فحشاء' منکر اور بغی۔ جن کا ترجمہ بے حیائی' برائی اور سرکشی آپ پڑھ چکے ہیں مگر ان میں سے ہر ایک کی قدرے مزید وضاحت ضروری ہے۔

(الف) پہلی چیز فحشاء ہے جس کے معنی ہیں کھلی ہوئی اور صریح برائی۔ اور اس میں تمام بیہودہ اور شرمناک افعال شامل ہیں ہر وہ برائی جو اپنی ذات میں ہی نہایت بری سمجھی جاتی ہے اور جس کا ارتکاب شرم و حیا کو ترک کیے بغیر ممکن نہیں وہ فحشاء ہے اسی لیے انتہائی بخل (اجارہ دارانہ ذہنیت رکھنا) برہنگی اور عریانی' گداگری اور دشنام طرازی اور بدکلامی سب فحشاء میں شمار ہوتی ہیں۔ اس طرح علی الاعلان برے کام کرنا اور برائیوں کو پھیلانا بھی "فحشاء" ہے مثلا جنسی جرائم کی تشہیر' بدکاریوں پر ابھارنے والے افسانے اور ڈرامے اور فلمیں' عریاں تصاویر' تبرج (عورتوں کا بن سنور کر منظر عام پر

Marfat.com

آنا) مردوں اور عورتوں کا کھلم کھلا اختلاط' عورتوں کا پبلک میں ناچنا یا نازواداء کی نمائش کرنا وغیرہ یہ سب امور فحشاء میں داخل ہیں۔

(ب) دوسری چیز جس سے منع کیا گیا ہے وہ "منکر" ہے اس کے لفظی اور اصطلاحی معنی پڑھ چکے ہیں۔ اس لیے مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔ بس یہ بات ذہن میں رہے کہ منکر سے مراد ہر وہ کام ہے جو شعائر اسلامی سے خارج ہو اور جسے تمام مسلمان برا جانتے ہیں اور برا کہتے ہیں۔ مثلاً شراب خانہ' تھیٹر' سینما' ناچ گھر' آرٹس کونسلیں' میوزک سکول وغیرہ ۔ اور اس سے مراد کوئی ایسی برائی بھی ہو سکتی ہے جسے دنیا بھر کے انسان اور تمام معاشرے برائی ہی سمجھتے ہوں ۔ مثلاً جھوٹ' قتل' چوری' بددیانتی' بدعہدی وغیرہ۔

(ج) تیسرا فعل بغی ہے (یعنی تلفظ میں نہی کا ہم وزن) اس کے معنی ہیں۔ اپنی حد سے آگے بڑھنا' دوسرے کے حقوق پر دست درازی کرنا۔ اس میں ہر ظلم و زیادتی اور ہر دھاندلی اور سرکشی شامل ہے جس کا ضرر دوسروں کو پہنچے۔ مثلاً غصب' اغوا' غنڈہ گردی' جھوٹا مقدمہ بنانا وغیرہ۔

خلاصہ یہ کہ:-

(۱) اللہ تین کاموں کے کرنے کا حکم دیتا ہے۔ عدل۔ احسان اور رشتہ داروں کے حق ادا کرنا اور ان میں قریب قریب سب بھلائیاں شامل ہیں۔

(۲) اللہ تین باتوں سے منع کرتا ہے۔ فحشاء منکر اور بغی (بے حیائی' برائی اور زیادتی) اور یہی سب برائیوں کی بنیاد ہیں۔

ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ پہلی تین چیزوں پر عمل کرے اور دوسری تین سے بچ کر رہے اور دوسرے کو بھی ان مطلوب کاموں کے کرنے کی تلقین کرے اور ممنوع کاموں سے باز رکھنے کی کوشش کرے۔

۲-ورسلا قد قصصنهم عليك من قبل و رسلا لم نقصصهم عليك و كلم الله موسى تكليما رسلا مبشرين و منذرين لئلا يكون للناس على الله حجة بعد الرسل و كان

Marfat.com

اللہ عزیزا حکیما (النساء/ ۱۶۴۔ ۱۶۵)

(۱) ان دو آیات میں پہلی بات تو یہ بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالی نے بہت سے رسول مبعوث فرمائے (ان کی پوری تعداد کا علم بھی صرف اللہ کو ہی ہے)۔ ان میں بعض کا ذکر قرآن کریم میں ہوا ہے (ایسے کل پیغمبروں کی تعداد ۲۸ کے قریب ہے) اور بیشتر کا ذکر قرآن میں آیا ہی نہیں۔ پھر ایک بہت بڑے رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ خصوصیت بیان ہوئی ہے کہ اللہ نے ان سے براہ راست کلام کیا اور فرشتے کے ذریعے تو اس نے تمام انبیاء سے کلام کیا ہی ہے۔

(۲) دوسری بات یہ بیان ہوئی کہ انبیاء انسانوں پر اللہ کی حجت قائم کرنے کے لئے بھیجے جاتے رہے۔ رسولوں کی بعثت اور ان کے ذریعے اللہ کے تمام احکام پہنچ جانے کے بعد اب کسی کے پاس کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ انبیاء کرامؑ کی صرف تعلیمات ہی نہیں بلکہ ان کی عملی زندگی ان کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل ہوتی ہے۔ لوگ نہ تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں تو اللہ کی ہدایت کا پتہ ہی نہ چل سکا اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بھلا ایسے احکام پر عمل کیسے کر سکتے تھے؟ یہ تو بہت مشکل تھا۔ بھلا کبھی کسی نے ان تمام احکام پر عمل بھی کیا ہے؟۔۔۔۔ رسولوں نے حکم بھی سنا دیا۔ عمل سے نمونہ بھی دکھا دیا۔

(۳) تیسری اہم بات جس کا اس یونٹ کے موضوع سے براہ راست تعلق ہے وہ یہ ہے کہ تمام رسول بیک وقت مبشر بھی تھے اور منذر بھی اور یہی دو لفظ وضاحت طلب ہیں:-

مبشر کا مطلب ہے بشارت یا خوشخبری دینے والا اور منذر کہتے ہیں ڈرانے والے کو۔ بظاہر یہ ایک دوسرے کے متضاد اور برعکس صفات ہیں۔ ایک ہی آدمی بیک وقت ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا کیسے ہو سکتا ہے؟ رسول کس کو ڈراتے اور خوشخبری دیتے تھے؟ اور کس چیز کی خوشخبری سناتے اور کس چیز سے ڈراتے تھے؟

رسول لوگوں کو ڈرا کر اور خوشخبری سنا کر ان پر اتمام حجت کرتے اور ان کے لیے صفائی پیش کرنے کا کوئی عذر نہیں چھوڑتے تھے "الناس" (لوگوں) سے مراد اس آیت میں ہر نبی کے مخاطب لوگ ہیں۔

Marfat.com

(الف) ہر رسول خوشخبری دیتا تھا اس بات کی کہ کوئی نیکی ضائع نہیں جائے گی۔ اس کا انعام ضرور ایک دن ملے گا اور اس کے دل خوش کن نتائج سامنے آکر رہیں گے۔ بگڑے ہوئے معاشرے میں نیکی کے نتائج پر سے ایمان اٹھ جاتا ہے۔ اصلاح کی کوششیں بے کار نظر آنے لگتی ہیں۔ لوگ دین سے اتنے دور جاچکے ہوتے ہیں کہ ان کو واپس لانا بظاہر بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اصلاح پر کمربستہ ہونا تو درکنار ایسے معاشرے میں تو نیکی کو اصول زندگی بنانا بھی فضول دکھائی دیتا ہے۔ مایوسی کی ان گھٹاؤں میں رسول امید کی کرن دکھاتے ہیں کہ امر بالمعروف (نیکی پھیلانے) یا عمل بالمعروف (نیکی کرنے) کی ساعی بے کار نہیں جائیں گی۔ اسی دنیا میں۔۔۔ ورنہ آخرت میں تو ان پر بہترین اجر ملے گا۔

(ب) اسی طرح ہر رسول ڈراتا رہا اس بات سے کہ برائی کی سزا ایک نہ ایک دن مل کر رہے گی۔ بدی چھپ کر کی جائے کہ کسی کو پتہ ہی نہ چل سکے یا کھلم کھلا اس زعم میں آکر کی جائے کہ بھلا میرا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے؟ دونوں تصور باطل ہیں۔ بدی ایک دن۔۔۔ آخرت میں تو یقیناً۔۔۔ ظاہر بھی ہو جائے گی اور اس کے نتائج سے بچنے کی کوئی صورت بھی نظر نہیں آئے گی۔ تمام رسول انسانوں کو منکر کے ارتکاب پر دلیر ہونے سے ڈراتے رہے۔ ہر نبی کی تعلیم کا نقطۂ آغاز توحید اور آخرت پر ایمان سے ہوتا ہے۔ اور یہی امر بالمعروف اور نھی عن المنکر کی بنیاد ہے۔

۳- ادعی الی سبیل ربك بالحکمة و الموعظة الحسنة و جادلھم بالتی ھی احسن ان ربك ھوا اعلم بمن ضل عن سبیله و ھو اعلم بالمھتدین.

(سورۃ النحل/ ۱۲۵)

(اے نبیؐ!) تم (لوگوں کو) (علم و حکمت (بھری باتوں) اور اچھی (اچھی) نصیحتوں کے ذریعے اپنے رب کے راستے کی طرف بلاؤ (اتمام حجت کے لیے) ان کے ساتھ بہترین طریقے پر بحث مباحثہ (بھی) کرو۔ بلاشبہ تمہارا پروردگار ہی زیادہ۔ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک چکا ہے۔ اور وہی زیادہ بہتر جانتا ہے۔ راہ راست پالینے والوں کو۔

Marfat.com

(ب) خذ العفو وامر بالعرف و اعرض عن الجاهلين. (سورۃ الاعراف: ۱۹۹)

(اے نبیؐ!) تم عفوو در گزر (کا شیوہ) اختیار کرو۔ اور (لوگوں کو ہمیشہ) نیکی کی تلقین کرتے رہو۔ اور جاہل لوگوں سے (الجھنے کی بجائے) کنارہ کش رہا کرو۔

ان دونوں آیات کا موضوع ایک ہی ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرتے وقت کیا اسلوب' کیا طریق کار اور کیا پالیسی اختیار کی جائے۔ دونوں آیات میں خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ مگر دعوت و تبلیغ اور اصلاح وہدایت کے کام میں ملحوظ رکھنے والے یہ آداب ان لوگوں کے لیے ہمیشہ مشعل راہ ہیں جو آپؐ کے قائم مقام بن کر دنیا کو سیدھی راہ دکھانے کے لیے اٹھیں۔ ویسے ان اصولوں کے عملی استعمال کے لیے کسی تحریک کا لیڈر بننا چنداں ضروری بھی نہیں ہے۔ اگرچہ کسی بھی اصلاحی تحریک کے لیڈروں کے لیے یہ صفات ضروری ہیں)۔ ہر شخص کو اپنے دائرہ اثر میں ۔ گھر' کنبہ' خاندان' گاؤں' محلہ وغیرہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا واجب ہے اور جب یہ کام کرے گا چاہے کسی سطح اور کسی پیمانے پر ہو تو اسے ان آداب کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت خود بخود پیدا ہو جائے گی۔

دونوں آیات میں حسب ذیل اصول دعوت مذکور ہوئے ہیں:-

(۱) نصب العین (۲) حکمت (۳) موعظہ حسنہ

(۴) شائستہ بحث (۵) نتائج سپرد خدا (۶) عفو

(۷) تلقین معروف (۸) جاہلوں سے کنارہ کشی

ان میں پہلے پانچ اصول ترتیب وار پہلی آیت سے اور آخری تین اصول دوسری آیت سے معلوم ہوتے ہیں- ذیل میں ان کی الگ الگ مختصر وضاحت کی جاتی ہے' توجہ سے مطالعہ کیجئے!

(۱) پہلی شرط تبلیغ و اصلاح کی یہ ہے کہ اپنی نیت درست اور اپنا نصب العین صرف "سبیل رب" ہو یعنی لوگوں کو خالص دین اسلام کی طرف بلاؤ اپنے خود ساختہ تصورات اور اپنی من مانی تاویلات کو دین کے نام سے پیش کرنا یا شہرت اور ناموری کی خواہش رکھنا سب سے پہلی ٹھوکر ہے جس سے اس راستے میں واسطہ پڑتا ہے اور پھر باقی ساری جدوجہد کا رخ ہی غلط ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

(۲) دوسرا اہم اصول "حکمت" سے کام لینا ہے۔ حکمت سے مراد مطلق "دانائی" لی جائے تو پھر تو یہ سارے آٹھوں اصول "حکمت" اور "دانائی" ہی کی شرح ہیں۔ اسی لیے بعض اہل علم نے یہاں حکمت سے مراد "علمی دلائل" لئے ہیں، دوسرے لفظوں میں حکمت کا مطلب یہ ہے کہ مخاطب کی ذہنی استعداد، اور نفسیاتی موقع و محل دیکھ کر بات کی جائے ہر طرح کے لوگوں کو ایک ہی لاٹھی سے نہ ہانکا جائے۔

(۳) تیسرا اصول "موعظہ حسنہ" یعنی "عمدہ نصیحت" ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مخاطب کو صرف عقلی اور علمی دلائل سے ہی مطمئن کرنا کافی نہ سمجھا جائے بلکہ اس کے اندر دبے ہوئے نیک جذبات کو ابھارا جائے۔ بدی کے لئے انسان کے اندر جو ایک فطری نفرت پائی جاتی ہے اس کو حرکت میں لایا جائے اور نیکی کی طرف رغبت اور شوق بھی پیدا کیا جائے بلکہ پتھر دل بھی نرما جائے۔ "موعظہ حسنہ" یا عمدہ نصیحت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ بات کا اسلوب اور انداز بیان ایسا ہو کہ جس سے دل سوزی اور خیر خواہی ٹپکتی ہو۔ مخاطب کو ہرگز یہ احساس نہ ہونے دیا جائے کہ گویا تم اسے حقیر اور گناہ گار سمجھ کر اپنی برتری اور پاکدامنی کے احساس سے لذت اندوز ہو رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرعون جیسے جابر بادشاہ کی طرف بھیجتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ "دیکھنا اس کے ساتھ بات نرمی سے کرنا!" "سبیل رب" کے داعی اور مبلغ کی زبانی اور اسلوب بیان، نفرت انگیز نہیں بلکہ محبت آمیز اور رقت خیز ہونا چاہیے۔ تبلیغ و دعوت کا چوتھا اہم اصول "شائستہ بحث" ہے جسے آیت میں وجادلھم بالتی ھی احسن کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس بحث مباحثہ کی نوبت یا ضرورت پیش آسکتی ہے۔ ایسے موقع پر بحث کو محض مناظرہ بازی، حاضر جوابی کی کشتی اور الفاظ کی بازیگری مت بناؤ کہ جس میں جوتوں بھپتیوں تک سے کام لے کر فریق ثانی کو "ہرا دینے" کا جذبہ کام کر رہا ہو۔ اس کی بجائے شائستہ زبان، دل کو لگنے والے دلائل اور شریفانہ اخلاق سے کام لو، حق پسندی کو ہاتھ سے جانے نہ دو۔ سیدھے سادھے طریقے سے بات سمجھاؤ اگر پھر بھی مخاطب ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لے تو الجھنے کی بجائے اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ تاکہ وہ گمراہی میں زیادہ دور نہ نکل جائے۔

(۵) پانچواں اصول جو بھولنے نہ پائے وہ یہ ہے کہ اپنا تمام معاملہ اور اس کے نتائج اللہ کے

Marfat.com

سپرد کرو۔ یہ بات ذہن نشین کرو کہ اللہ خوب جانتا ہے کہ کون راہ حق سے بھٹک گیا ہے اور کون ہدایت کے رستے پر چل پڑا ہے۔ لہذا تم کسی کی نیت پر حملہ نہ کرو۔ ممکن ہے اس سے کام اور بگڑ جائے نیز تم اس جھگڑے میں مت پڑو کہ کس نے اور کتنوں نے تمہاری بات مانی یا نہ مانی؟

اپنی کامیابیوں کے اعداد و شمار کے گراف نہ بناتے پھرو اور نہ ہی اپنے مخاطبوں کی ہدایت یا گمراہی ناپتے پھرو۔ عین ممکن ہے کہ جس آدمی کے ہدایت کی طرف آنے کا تمہیں بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ اسی کا دل کسی وقت (یا کسی دوسرے کی کوشش سے) حق کو قبول کرنے کے لیے کھل جائے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ یہ تمام باتیں اللہ پر چھوڑ دو۔ ورنہ اپنے اصل کام سے غافل اور اپنے مقصد سے دور ہو جاؤ گے --- یہ پانچ اصول اس سبق کی پہلی آیت میں بیان ہوئے ہیں۔

(۶) چھٹا اصول (جو دوسری آیت میں بیان ہوا ہے) "عفو اور درگذر" کا ہے یعنی سخت اشتعال انگیز موقع پر بھی اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھنا --- چاہیے---- اور ہر طرح کی ناگوار باتوں کو بھی عالی ظرفی کے ساتھ ٹال دینا چاہیے۔ غصہ اور سخت گیری سے تبلیغ کا کام بگڑتا ہے بنتا نہیں ہے۔ اس راہ میں اپنے ساتھیوں کی کمزوریوں اور اپنے مخالفوں کی شرارتوں --- سب پر درگزر سے کام لینا چاہیے۔

(۷) ساتواں اصول تبلیغ "تلقین معروف" ہے جس کے دو مطلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ تم اختلافی مسائل اور فرقہ ورانہ ذہنیت کے خول سے نکل کر خالص اور جانی پہچانی "نیکی" کی طرف بلاؤ۔ جس کو بھلائی سمجھنے کے لیے عام انسانی عقل کافی ہوتی ہے۔ اس طرح کی دعوت عوام و خواص سب کو یکساں متاثر کرے گی اور ایسی آواز خود بخود سننے والے کے دل تک کی راہ نکال لیتی ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ بات عام فہم انداز میں کرو۔ عوام کو نیکی اور بھلائی کی تلقین کرو اور عوام کی زبان میں عوام کے ذہن کے مطابق بات کرو۔ تاکہ مخاطب اسے اچھی طرح سمجھ سکے۔ اور تمہاری بات اسے اپیل کرے۔

(۸) آٹھواں اصول تبلیغ "جاہلوں سے کنارہ کشی" کا ہے۔ یعنی تمہارے مخاطب وہی لوگ

Marfat.com

رہنے چاہئیں جو معقولیت کے ساتھ بات سمجھنے کو تیار ہوں۔ ایسے جاہلوں سے' جو حجت بازی اور کج بحثی یا طعن و تشنیع اور درشت کلامی پر اتر آئیں' ایسے لوگوں سے مت الجھئے۔ خواہ وہ الجھنے یا الجھانے کی کتنی ہی کوشش کریں اس لیے کہ ایسے لوگوں سے بحث یا جھگڑے میں الجھنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ الٹا نقصان یہ ہوتا ہے کہ مبلغ کی جو قوت اور جو وقت کسی مفید اور نتیجہ خیز کام میں صرف ہونا چاہئے وہ ایک فضول کام میں ضائع ہو جاتا ہے۔

(۴ الف) وامر اهلك بالصلوة واصطبر عليها لانسئلك رزقا نحن نرزقك والعاقبة للتقوى. (طه / ۱۳۲)

(اے نبیؐ!) تم اپنے اہل و عیال کو نماز کی تلقین کرو اور خود بھی اس کے پابند رہو۔ ہم تم سے کوئی رزق کا سوال نہیں کرتے (بلکہ) رزق تو ہم تمہیں دے دیتے ہیں (اور دیں گے)۔ اور انجام کار (کی بھلائی) تو تقویٰ (اور پرہیزگاری) ہی کے لیے ہے۔

(۴ ب) يبنى اقم الصلوة وامر بالمعروف وانه عن المنكر واصبر على ما اصابك ان ذلك من عزم الامور. (لقمن / ۱۷)

(اور لقمان نے کہا) "پیارے بیٹے! ہمیشہ نماز قائم رکھ اور نیکی کی تلقین کیا کر اور بدی سے منع کرتا رہ۔ اور جو مصیبت تجھ پر آپڑے اسے صبر (ثابت قدمی) سے جھیل۔ یقیناً یہ باتیں تمام کاموں کے (لئے درکار) عزم (اور قوت ارادہ) کا ایک (لازمی) حصہ ہیں۔

مندرجہ بالا دو آیات دو مختلف سورتوں سے لی گئی ہیں پہلی آیت (طہ: ۱۳۲) میں اصل مخاطب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جب کہ دوسری آیت (لقمن: ۱۷) میں لقمان نامی ایک نیک بزرگ کی اپنے بیٹے کو کی گئی نصیحتوں کا ذکر ہے جس میں وہ بیٹے کو بار بار پیار سے "میرے بچے" یا "بیٹا!" کہہ کر بات کرتے ہیں۔

کسی خاص آدمی کو مخاطب کر کے ایسا حکم دینا جو دراصل سب کے لئے ہو یہ نصیحت کا ایک خاص مؤثر طریقہ ہے' جو قرآن کریم نے بکثرت استعمال کیا ہے۔ اور یہ دونوں آیات اس کی ایک مثال ہیں۔

زیر مطالعہ آیت میں "امربالمعروف اور نهى عن المنكر" کے عام حکم کے علاوہ

Marfat.com

معروف (نیکی) کی دو نہایت اہم اور بنیادی صورتوں یعنی "نماز" اور "صبر" کا حکم دیا گیا ہے۔
حسب ذیل نکات توجہ سے پڑھیئے:-

(۱) پہلا حکم جو اس سبق کی دونوں آیتوں میں آیا ہے وہ "نماز" کا ہے (لفظ صلوۃ اور "نماز" کی مزید وضاحت آپ یونٹ: ۳ کے ضمیمہ اصطلاحات میں پڑھ چکے ہیں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالی کی طرف سے "گھر والوں کو نماز کی تاکید اور خود اس کی پابندی" کرنے کا حکم میں ہر مسلمان کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ وہ خود بھی نماز کا پابند بنے اور اپنے بیوی بچوں اور گھر کے دیگر افراد کو بھی نماز کی مسلسل تلقین کرتا رہے۔ اور یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ اس سے اللہ کو تو کوئی فائدہ نہیں بلکہ فائدہ سراسر تمہارا ہے کہ تم میں تقوی پیدا ہوگا جو دنیا اور آخرت کی کامیابی کا ذریعہ ہے۔ لقمان کا اپنے بیٹے کو "نماز قائم کرنے کا حکم" دینا۔ اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ "نماز" بہت قدیم عبادت ہے (لقمان ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت پہلے ہو گزرے ہیں) یہ مضمون قرآن کریم کی اور بہت سی آیات میں بھی بیان ہوا ہے جس کی تفصیل میں جانا آپ کے اس کورس کا حصہ نہیں ہے۔

(۲) لقمان کا اپنے بیٹے کو "امربالمعروف اور نھی عن المنکر" کا حکم دینا بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے تمام انبیاء ہی نہیں بلکہ علم و عقل اور حکمت و دانائی والے تمام لوگ بھی اس چیز کی تعلیم دیتے رہے۔ " امربالمعروف اور نھی عن المنکر" اب ہم اصطلاح کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ اس کی مکمل وضاحت آپ اسی یونٹ کے تعارف میں پڑھ آئے ہیں۔ ضرورت ہو تو آگے چلنے سے پہلے اس پر ایک نظر دوبارہ ڈال لیجئے - اگلے اسباق اور آیات میں جہاں بھی یہ بات آئے گی۔ وہاں اس کا لفظی ترجمہ لکھنے کی بجائے ہم زیادہ تر یہی اصطلاح --- جو آپ کے اس یونٹ کا عنوان ہے۔ استعمال کریں گے۔

(۳) دونوں آیتوں میں "صبر" کرنے کا حکم بھی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالی نے نماز پر "صبر" کرنے کا حکم دیا ہے اور لقمان اپنے بیٹے کو ہر قسم کی مصیبت پر یا "امربالمعروف اور نھی عن المنکر" کا فریضہ ادا کرتے ہوئے یا پیش آنے والی مشکلات پر صبر کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ غالبا اس سے آپ یہ خود بخود سمجھ سکتے ہیں کہ آیت کے ترجمے

Marfat.com

میں "صبر" کا ترجمہ "ثابت قدمی" کیوں کیا گیا ہے۔ دراصل صبر کا لفظی معنی ہی یہی ہے۔ یعنی مشکلات اور مصائب سے نہ گھبرانا اور اپنے حواس یا اعضاء سے کسی طرح یہ گھبراہٹ ظاہر نہ ہونے دینا" اسی کو ہم مختصرا ثابت قدمی کہتے ہیں۔

(۴) حضرت لقمان کی نصیحت والی آیت (۵ ب) کے آخری حصہ میں "نماز' امر بالمعروف ' نہی المنکر اور صبر و ثابت قدمی کو "عزم الامور" میں شمار کیا گیا ہے۔ "عزم کا مطلب ہے "پکا ارادہ کرنا"۔ "قوت ارادی کو استعمال کرنا--- اور "امور" "امر" (بمعنی کام یا معاملہ) کی جمع ہے۔ اس طرح 'عزم الامور" کے دو مطلب بنتے ہیں:-

(۱) وہ کام جو "قابل ارادہ ہیں اور جن کی بہت تاکید کی گئی ہے۔

(۲) وہ کام جو بڑا حوصلہ اور مضبوط قوت ارادی چاہتے ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے بڑا دل گردہ چاہئے ہے اور یہ کام کم ہمت لوگوں کے بس کی بات نہیں۔

سورۃ طٰہ والی آیت (۵ : الف) کے آخر میں تقوی کے نیک انجام کا ذکر ہے۔ اس سب کاموں کی اصل بنیاد نیت کی درستی ہے۔ اس کے بغیر ان کو نیکی میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔

(۵) خلاصہ یہ ہے کہ ہر مسلمان کو:-

(۱) خود نماز کا پابند ہونا چاہئے اور بیوی بچوں اور تمام گھر والوں کو اس کی تلقین کرنا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔

(۲) " امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کا فریضہ سرانجام دیتے رہنا چاہئے۔

(۳) صبر و ثابت قدمی سے اس راہ پر قائم رہنا چاہئے۔ نماز کی پابندی بذات خود ثابت قدمی کی دلیل بھی ہے اور اس کی تربیت بھی۔ اور

(۴) اور یہ تینوں کام آدمی کے "عزم" اور "تقوی" کا امتحان ہیں۔

(۵ الف) ولتكن منكم امة يدعون الى الخير و يامرون بالمعروف و ينهون عن المنكر و اولئك هم المفلحون.

اور ضروری ہے کہ تم میں (ہمیشہ) ایک گروہ (ایسے لوگوں کا) موجود رہے جو بھلائی کی طرف

Marfat.com

بلاتے رہیں اور نیکی کا حکم دیتے رہیں اور بدی سے روکتے رہیں۔ یہ (کام کرنے والے) لوگ ہی فلاح پائیں گے۔

(۵ ب) کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنهون عن المنكر و تومنون بالله ۔ ولو امن اهل الكتب لكان خيرا لهم منهم المومنون و اكثرهم الفاسقون (آل عمران ٤ ١٠ ١١٠)

آج تک جو امت بھی لوگوں (کی ہدایت اور اصلاح) کے لیے میدان (عمل) میں لائی گئی ہے تم (ان سب میں سے) بہترین (گروہ) ہو (اس لئے کہ) تم نیکی کا حکم دیتے ہو۔ اور بدی سے روکتے ہو' اور اللہ پر (صحیح معنوں میں) ایمان رکھتے ہو۔ اگر (یہ) اہل کتاب (بھی) ایمان لاتے تو اس میں خود ان کا بھلا ہوتا۔ (اگر جو) ان میں سے کچھ (لوگ) ایماندار بھی ہیں مگر ان میں اکثریت فاسقوں کی ہے۔

دونوں آیات کا مطلب بڑا واضح ہے۔ ترجمہ پر ایک نظر پھر ڈالئے اور اس کے بعد مندرجہ ذیل امور کو خاص طور پر ذہن نشین کیجئے:۔

(۱) انفرادی تقویٰ کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں میں ایک گروہ مستقل طور پر "دعوت الی الخیر" (بھلائی کی طرف بلانا) اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرتا رہے۔ تاکہ افراد ملت کی نگاہوں میں اپنا اصل نصب العین اوجھل نہ ہونے پائے۔ اور برائیاں فروغ پا کر قوم کے مجموعی مزاج پر اثر انداز نہ ہوں۔ یوں تو ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ لوگوں کو اچھے کاموں کے لیے کہتا رہے اور جہاں ضرورت ہو برائی سے منع کرے۔ مگر یہ ایسا کام ہے کہ اس کے لئے موزوں اور مناسب تربیت یافتہ افراد کے ایک "ادارہ" بلکہ ہر جگہ ایک منظم جماعت کا موجود رہنا فرض کفایہ ہے (فرض کفایہ اس کام کو کہتے ہیں جو ہے تو فرض اور واجب لیکن اکثر لوگ وہ کام کر لیں تو سب کی طرف سے ہو جائے گا اور اگر کوئی ایک بھی اسے نہ کرے تو سب لوگ مجرم ہوں گے)۔

(۲) دنیا کی امامت اور رہنمائی کا حق اسی جماعت کو پہنچتا ہے جس کے افراد میں انفرادی طور پر فکر و نظر اور اخلاق و عمل کی تطہیر (یعنی ایمان اور عمل صالح) کے علاوہ اجتماعی طور پر نیکی کو

Marfat.com

قائم کرنے اور بدی کو مٹانے کا جذبہ اور عمل موجود ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کو ان ہی اوصاف کی بناء پر قرآن کریم نے "خیر امت" کے لقب سے نوازا ہے۔ "اپنی اصلاح اور دوسروں کی اصلاح" کہنے کو جتنا آسان اور خوش آئند ہے' کرنے کو اتنا ہی دشوار ہے کتنے ہی لوگ ہیں جو اس میں توازن نہیں رکھ سکتے۔ اس توازن کے بگڑنے کی خطرناک صورت وہ ہے جب اپنی اصلاح سے زیادہ آدمی دوسروں کی اصلاح کے درپے ہو جاتا ہے۔ اور اس کی بدترین صورت وہ ہے' جب آدمی خود بھی بگڑ جائے اور وسروں کو بھی بگاڑنے لگے مگر کوشش یہ کرے کہ "صالح اور مصلح سمجھا جاؤں"۔

(۳) "امربالمعروف اور نھی عن المنکر" کی آڑ میں اختلاف اور تفرقے کو فروغ دینے کا کاروبار بھی چل سکتا ہے۔ اور یہ نہایت خطرناک رجحان ہے "تفرقہ بازی" اور "فرقہ پرستی" پہلی امتوں کی تباہی کا باعث بنتی رہی ہے۔ اختلاف رائے اگر خلوص نیت اور ارادہ اصلاح پر مبنی ہو تو یہ نہ صرف ناگزیر ہے بلکہ بے حد مفید ہے۔ لیکن اگر اس میں نفسانیت اور شرارت ہے تو وہ (اختلاف) وحدت دینی کو پارہ پارہ کر دے گا۔ اب اس نازک فرق کو سمجھنا نہایت ضروری ہے اور اس کی ایک ہی صورت ہے کہ اللہ پر ایمان ہو اور آخرت کی فلاح کا دھیان ہو۔

(۴) "بہترین امت" ہو کر اقوام عالم کی رہنمائی کرنا بہت بڑا منصب ہے مگر اس منصب پر "فائز ہونے" اور اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو کر اس پر "فائز رہنے" کے لئے بعض صفات کی ضرورت ہے (جو ان آیات میں بیان ہوئی ہیں)۔ یہ منصب نسلاً نہیں چلتا۔ اس پر اجارہ داری کسی کے بس کی چیز ہی نہیں۔ اللہ نے اہل کتاب (بنی اسرائیل) کو یہ منصب دیا مگر وہ اسے نباہ نہ سکے تو اللہ نے یہ منصب ان سے چھین لیا۔ اور بعینہ یہ معاملہ کسی وقت مسلمانوں کو پیش آسکتا ہے (بلکہ پیش آچکا ہے) اور آئندہ بھی پیش آئے گا یہ مضمون بھی قرآن کریم میں آیا ہے مگر آپ کے کورس سے اس کا تعلق نہیں ہے) قوم میں فاسقوں اور اللہ کے نافرمانوں کی کثرت وہ آخری علامت ہے "بہترین امت" بگڑ کر "بدترین" امت ہو چکی ہوتی ہے۔

(۵) خلاصہ یہ ہے کہ:-

Marfat.com

(۱) جس طرح سوسائٹی کے لیے۔ زراعت' صنعت' تجارت' حکومت وغیرہ کے لیے ایک تربیت یافتہ مستقل گروہ درکار ہے اسی طرح تبلیغ دین اور " امر بالمعروف اور نہی عن المنکر " کے لیے دینی طور پر تربیت یافتہ اور ظاہری باطنی خوبیوں سے آراستہ افراد کے ایک مستقل گروہ کی ضرورت ہے۔

(۲) ایسے گروہ کی بنیادی صفت اللہ پر ایمان اور آخرت کی فلاح کا عقیدہ ہے۔

(۳) ایسی صفات سے متصف لوگ اور ایسے پروگرام (امربالمعروف اور نہی عن المنکر) پر عمل پیرا لوگ روئے زمین کے بہترین لوگ ہیں۔ اس سے ان صفات اور اس پروگرام کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

۴- یہ کام چھوڑ دو گے تو اہل کتاب کی طرح تمہارے اندر بھی فسق و فجور عام ہو جائے گا۔

(٦ الف) المنفقون والمنفقت بعضهم من بعض. يامرون بالمنكر و ينهون عن المعروف و يقبضون ايديهم. نسو الله فنسيهم ان المنفقين هم الفاسقون. (التوبه / ٦٧)

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہوتے ہیں۔ وہ سب بدی کا حکم دیتے اور نیکی سے روکتے ہیں۔ (یعنی بدی کا حکم دینا اور نیکی سے روک دینا ان سب کا شیوہ ہوتا ہے)۔ اور کار خیر کے موقع پر (ہمیشہ) اپنے ہاتھ بند کر لیا کرتے ہیں۔ وہ اللہ کو بھلا بیٹھے سو اس نے بھی ان کو بھلا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ منافق ہی (اصلی اور بڑے) فاسق ہیں۔

(٦ ب) والمومنون و المومنت بعضهم اولياء بعض يامرون بالمعروف و ينهون عن المنكر و يقيمون الصلوة ويوتون الزكوة و يطيعون الله و رسوله اولئك سيرحمهم الله. ان الله عزيز حكيم. (التوبه: ٧١)

اور اہل ایمان مرد اور اہل ایمان عورتیں سب آپس میں ایک دوسرے کے دینی رفیق اور مددگار ہوتے ہیں۔ وہ سب نیکی کا حکم دیا کرتے اور بدی سے روکا کرتے ہیں۔ (یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا شیوہ ہوتا ہے) وہ نمازوں کی پابندی کرتے اور (باقاعدگی) سے زکوۃ ادا

Marfat.com

کرتے ہیں۔ اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری (کیا) کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر ضرور اللہ (اپنی) رحمت (نازل) کرے گا۔ یقیناً اللہ بڑا زبردست اور بڑا دانا ہے۔

ابھی آپ نے نفاق اور منافق کے معنوں کی وضاحت پڑھی ہے۔ مومن اور ایمان کے بارے میں آپ میں پڑھ چکے ہیں۔ اب آپ کو معلوم ہو گیا کہ مومن اور منافق دو واضح طور پر الگ گروہ ہیں۔ اگرچہ ایمان کا ظاہری اقرار اور اسلام کی پیروی کا بیرونی اظہار دونوں گروہوں میں مشترک ہے۔ یعنی کہلانے کو منافق بھی مسلمان کہلاتے ہیں بلکہ شاید وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے بھی ہیں۔ مگر قرآن مجید نے منافقوں کے لیے آخرت کی سزا کافروں سے بھی زیادہ بتائی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو ایسے منافق بھی تھے جو اوپر اوپر سے اسلام کا اقرار کرتے تھے مگر اندر سے' دل بالکل پکے کافر تھے۔ قرآن مجید میں ایسے لوگوں کا ذکر محض منافق "یا اندر سے کچھ باہر سے کچھ" کہہ کر نہیں کیا بلکہ ان کے کردار' ان کی عادات ان کے مزاج اور ان کے طرز فکر و عمل کی ایسی تصویر پیش کی ہے جس سے ان کو پہچاننا آسان ہو جاتا ہے۔ حدیث شریف میں بھی ان کی عادات اور اعمال سے متعلق کچھ نشانیاں بیان ہوئی ہیں۔ جس آدمی میں بھی قرآن اور حدیث کی بتائی ہوئی یہ علامات پائی جائیں وہ پکا منافق ہے چاہے وہ اپنے آپ کو مسلمان کہلائے یا سمجھے۔ ایسا آدمی اگر رسول کریمؐ کے زمانے میں ہوتا تو بھی ظاہرا ہی اسلام قبول کرتا۔ دل سے کافر ہی رہتا - ان عادات و علامات کا جان لینا نہایت ضروری ہے تاکہ ہم اپنے ایمان یا نفاق کا خود ہی فیصلہ کر لیں اور کسی دوسرے مدعی ایمان کا بھی۔

(۱) زیر مطالعہ آیات میں ایک دلچسپ موازنہ بلکہ مقابلہ کے انداز میں مومنوں اور منافقوں کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کس طرح یہ دونوں گروہ۔ اسلام کا مشترک لیبل رکھتے ہوئے بھی۔ ایک دوسرے کی مکمل ضد اور ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔ ذیل میں دونوں آیات کے مضمون کو مقابلے کے لیے آمنے سامنے کے دو کالموں میں لکھا جاتا ہے۔

اصل آیات کا ترجمہ ایک بار پھر دیکھئے اور اب ذیل کے کالم پڑھئیے! اور نکات مقابلہ

Marfat.com

ذہن نشین کیجئے!

اہل نفاق (منافق)	اہل ایمان (مومن)
(۱) مرد بھی ہوتے ہیں عورتیں بھی۔	(۱) مرد بھی ہوتے ہیں عورتیں بھی۔
(۲) آپس میں ایک دوسرے کے ہم جنس ہوتے ہیں۔	(۲) باہم ایک دوسرے کے مددگار ہوتے ہیں
(۳) بدی کا حکم دیتے ہیں۔	(۳) نیکی کا حکم دیتے ہیں۔
(۴) نیکی سے روکتے ہیں۔	(۴) بدی سے روکتے ہیں۔
(۵) کارخیر کا موقع پر اپنے ہاتھ بند کر لیتے ہیں۔	(۵) زکوۃ ادا کرتے اور حاجت مندوں کی مدد کرتے ہیں
(۶) اللہ کی یاد سے غافل رہتے ہیں	(۶) نماز کے پابند ہوتے ہیں جو اللہ کی یاد کی بہترین صورت ہے۔
(۷) ان کو اللہ نے بھلا دیا اور چھوڑ دیا۔	(۷) ان پر اللہ اپنی رحمت کرے گا۔
(۸) یہ ہی سخت نافرمان لوگ ہوتے ہیں	(۸) یہ اللہ اور اس کے رسول کے اطاعت گزار ہوتے ہیں

(۲) ہمارے اس یونٹ کے عنوان کے لحاظ سے خاص طور پر یہ بات قابل غور اور قابل ذکر ہے کہ جہاں ایمان والوں کی صفت "امر بالمعروف اور نھی عن المنکر" ہے وہاں منافقوں کا کام اس کے برعکس "امر بالمنکر" اور "نھی عن المعروف" ہوتا ہے۔ بظاہر یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ بھلا کوئی آدمی کسی دوسرے سے حکماً برا کام کراتا ہے؟ یا زبردستی نیکی سے روکتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ خود برائی کرے گا یا نیکی نہیں کرے گا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دوسروں کو نیکی سے باز رکھنے کے لیے یا بدی کا ارتکاب کرانے کے لیے کوئی "ڈنڈا" استعمال کرے؟ مگر قرآن کریم نے اسے منافق مردوں اور منافق عورتوں کی خاص پہچان قرار دیا ہے۔ لہذا یہ بات کیسے غلط ہو سکتی ہے؟ غالباً ہم نے ہی کبھی غور نہیں کیا۔ ایسے آدمی تو ہمارے اردگرد بکثرت دکھائی دیتے ہیں۔ بلکہ شاید ہم خود بھی ایسے ہی ہوں؟ کیا ایسے آدمی نہیں ہوتے جو کوئی

Marfat.com

ناجائز کام کرانے کے لیے اپنی طاقت اور اپنے اختیارات کا سارا زور استعمال کر گزرتے ہیں ۔۔۔ بلکہ اگر کوئی ان کے لئے کوئی بے ایمانی کرنے کو تیار نہ ہو تو ان کا جینا اجیرن کر دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے ہر ایمان دار بااصول اور باضمیر انسان کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لے وہ کون سا حربہ استعمال کرنے سے جھجکتے ہیں؟ ہمارے کالجوں' یونیورسٹیوں اور امتحانی اداروں میں' ہماری منڈیوں' کارخانوں اور بازاروں میں' ہمارے دفتری اہلکاروں اور اونچی "سرکاروں" میں ہمارے تھانوں' کچہریوں اور درباروں میں۔۔۔ بلکہ ہمارے خانقاہوں اور مزاروں تک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے' جو اپنے یا اپنے کسی عزیز کے دینوی مفادات کے لیے حکما اور جبرا ہر "منکر" کا ارتکاب کرانے اور ہر "معروف" کو اپنے راستے سے ہٹانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ آخر یہ "سفارش" اور "رشوت" کی طاقت سے جاری ہونے والے "احکام" کس چیز کو مٹاتے اور کس چیز کو بچاتے ہیں؟

دوسری طرف دیکھیے تو بے حیائی اور فحاشی کو فروغ دینے میں' نئی نسل کو دینی قدروں کا باغی بنانے میں بلکہ جرائم تک کے ارتکاب پر اکسانے اور اس کے طریقے تک سکھانے میں ہمارے اخباروں اور ہمارے ابلاغ عامہ کے اداروں خصوصا ٹی وی کی قوت' طاقت اور فنی مہارت کس طرح صرف ہو رہی ہے؟ ان چند مثالوں کے بعد کیا قرآن کریم کے قول کی صداقت واضح نہیں ہو جاتی؟ کہ منافق کا کام اور اس کی پہچان یہی ہے کہ وہ "امر بالمنکر" اور "نھی عن المعروف" کا علمبردار ہوتا ہے۔

(۲) کردار کے اس مقابلہ سے اور منافقت کے اس "معائنہ" سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ "امر بالمعروف اور نھی عن المنکر" کا فریضہ۔ جو اہل ایمان کا طرہ امتیاز ہے۔ کتنا اہم اور ضروری اور ساتھ ہی کتنا مشکل اور دشوار کام ہے- اس کام کی ضرورت اور اہمیت پر بہت سے قرآنی احکام آپ اسی یونٹ میں پڑھ آئے ہیں۔"امر بالمعروف اور نھی عن المنکر" کے لحاظ سے ایک دوسرے کے برعکس ہونے کے علاوہ۔ منافق اور مومن میں بھی کئی باتوں میں ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ زکوۃ کے مقابلے میں بخل' نماز کے مقابلے میں یاد خدا سے غفلت' اور اطاعت خدا رسولؐ کے مقابلے میں فسق و فجور کی کثرت۔۔

Marfat.com

بھی مومن اور منافق کے درمیان امتیاز کرنے والی چیزیں ہیں۔

(۳) خلاصہ یہ ہے کہ:-

(۱) منافقانہ خصائل رکھنے والے مرد اور عورتیں ایک ایسا جتھا ہیں' جن کو خدا سے غفلت' برائی سے دلچسپی نیکی سے عداوت اور خیر سے عدم تعاون کی مشترک خصوصیات نے ایک دوسرے سے وابستہ اور اہل ایمان سے عملاً بے تعلق کر دیا ہے۔

(۲) دوسری جانب سچے مومن۔۔۔ مرد و زن۔۔۔ ایک دوسرا گروہ ہیں جن کو نماز اور ذکر خدا کے شوق' نیکی سے دلچسپی' بدی سے نفرت' زکوۃ اور کار خیر سے وابستگی اور اطاعت خدا و رسول کے جذبہ پر مبنی مشترک مزاج اور طرز زندگی نے آپس مین ایک دوسرے سے جوڑا اور منافقین کے گروہ سے توڑ دیا ہے۔

(۳) مومن اور منافق کے کردار میں سب سے زیادہ عجیب تضاد "منکر" اور "معروف" کے بارے میں ہے۔

(۴) اگر اعمال جدا جدا ہیں تو نتائج بھی جدا جدا ہونے چائیں اور۔۔۔ ہوں گے۔ یہی قرآن کا فرمان ہے۔

(۷ الف) التائبون العبدون الحمدون السآئحون الراکعون الساجدون الامرون بالمعروف و الناھون عن المنکر و الحفظون لحدود الله. وبشر المومنین. (التوبہ/۱۱۲)-

(ذرا اہل ایمان کی صفات سنو!) وہ تو (اپنی خطاؤں پر) توبہ (و استغفار) کرنے والے (اللہ کے) عبادت گذار' (اس کی) حمد و ثناء کے خوگر' (اس کی اور اس کے دین کی خاطر بوقت ضرورت) سفر (کی صعوبتیں بخوشی برداشت) کرنے والے' (صرف اسی کے آگے) رکوع اور سجدے کرنے والے' ہمیشہ نیکی کا حکم دینے والے اور (ہر طرح کی) بدی سے روک دینے والے' اللہ (کے احکام اور اس) کی (مقرر کردہ) حدوں کا (ہر دقت) خیال رکھنے والے (ہوتے ہیں) اور (اے نبیؐ!) تم (ایسے) اہل ایمان کو خوشخبری سنا دو۔

الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوۃ و اتوا الزکوۃ و امروا بالمعروف و نھو

Marfat.com

عن المنکر. ولله عاقبة الامور. (الحج / ٤١)

(اصل اہل (ایمان کی پہچان یہ ہے کہ) وہ ایسے لوگ (ہوتے) ہیں کہ اگر ہم (کبھی) ان کو کہیں زمین میں اقتدار عطا فرمائیں۔ تو وہ (انفرادی اور اجتماعی ہر سطح پر) نماز قائم رکھنے اور زکوۃ ادا کئے جانے کا اہتمام کریں اور (معاشرے میں) نیک کاموں (کے فروغ) کا حکم دیں اور بدی (کی ہر صورت) کو ممنوع قرار دیں۔ اور بہر حال سب کاموں کا آخری نتیجہ (اور انجام) تو اللہ تعالی کے (اپنے ہی) اختیار میں ہے۔

ان آیات میں حسب ذیل الفاظ اسلامی اصطلاحات کے طور پر آئے ہیں اس لیے ان کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔ ان میں سے توبہ (التائبوں سے)' حمد' معروف منکر' مومن (ایمان)' صلوۃ' زکوۃ اور اللہ کے بارے میں لفظی معنی اور وضاحت آپ پڑھ چکے ہیں چند حسب ذیل الفاظ اور درج ہیں۔ عبادۃ' رکوع' سجدہ' حدود۔

عبادۃ

(اردو میں "عبادت" لکھا جائے گا کے لفظی معنی ہیں بندگی کرنا۔ عربی کا لفظ "عبد" اور فارسی کا لفظ "بندہ" (ہر دو کا اصل مطلب ہے غلام (Slave) جو پرانے زمانے میں خرید و فروخت ہوتے تھے۔ اس سے عبادت یا بندی کے معنی ہوئے غلاموں کی طرح نوکری کرنا اور آقا کے ہر فرمان کی تعمیل کرنا۔ ان ہی معنوں میں مسلمانوں کی پوری زندگی بندگی یا عبادت ہے۔ قدم قدم پر مالک کے حکم کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ فرق یہ ہے کہ غلام تو اپنے مالک کی چاکری اس (مالک) کے فائدے کے لیے کرتا ہے۔ اللہ کا بندہ بن کر رہنا خود ہمارے لیے برکات اور بے شمار فوائد کا باعث ہے۔ اس میں اللہ تعالی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اصطلاح میں "عبادات" (جمع عبادت کی) سے مراد نماز' روزہ' حج اور زکوۃ ہیں جن کی بعض صورتیں فرض ہیں اور بعض نفل یا سنت وغیرہ۔ عبادت گزار (عابد) کے دونوں ہی معنی ہو سکتے ہیں۔ رسمی عبادات کا پابند یا اللہ کے احکام کا پابند۔

رکوع

Marfat.com

رکوع کے لفظی معنی تو ''جھکنا'' یا جھک جانا'' کے ہیں۔ اصطلاح میں اس سے مراد نماز کی وہ خاص حالت ہے جب ہم گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر دھڑ کا اوپر کا حصہ آگے کی طرف جھکا لیتے ہیں۔ اس لیے الراکعون یعنی رکوع کرنے والوں'' سے مراد دراصل ''نمازی'' ہی ہیں۔ ویسے اصطلاح میں قران کریم کے متن کے ایک خاص حصے کو جس کی مقدار مختلف ہوتی ہے۔ اسے بھی رکوع کہتے ہیں مگر آیت میں ''نماز کے رکوع'' والے معنی مراد ہیں۔

سجدہ

سجدہ کے لفظی معنی تو ''زمین پر اوندھے منہ لیٹ جانا'' ہیں چاہے جس طرح بھی لیٹ جائے۔ اصطلاح میں سجدہ نماز کی ایک خاص ہئیت یا شکل کو کہتے ہیں جس میں ہم اپنے گھٹنے ٹیک کر اپنے ماتھا زمین پر رکھتے ہیں۔ سجدہ عبادت کی بہترین صورت ہے۔ اس لیے اللہ تعالی کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنا اسلامی شریعت میں قطعا حرام ہے۔ الساجدون ''سجدہ کرنے والے'' سے مراد ''اللہ کو سجدہ کرنے والے'' یعنی نماز پڑھنے والے ہیں۔ نماز میں لمبا رکوع اور طویل سجدہ سنت اور اچھی بات ہے اس لیے رکوع اور سجدہ کرنے والے ایک الگ اور مستقل صفت اہل ایمان کی بیان ہوئی ہے۔

حدود

اس کا واحد ''حد'' ہے جو اپنے لفظی معنوں کے ساتھ اردو میں عام مستعمل ہے۔ یہ محسوس اور غیر محسوس دونوں قسم کی چیزوں پر بولا جاتا ہے مثلاً کھیت کی حد یا اختیارات کی حد اصطلاح میں حدود کا لفظ ان اسلامی سزاؤں پر بولا جاتا ہے جو قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں۔۔۔ اور حدود اللہ (اللہ کی حدیں) سے مراد ہے۔ اللہ کی مقرر کردہ حدیں جن سے آگے بڑھنا بندہ کے لیے منع ہے اور اس صورت میں اس سے مراد شریعت کے تمام احکام ہوتے ہیں۔ زیر مطالعہ آیت میں یہ لفظ ان ہی معنوں میں آیا ہے۔

یہ دو آیات بھی دو مختلف سورتوں سے لی گئی ہیں۔ تاہم ان کا موضوع ایک ہی ہے یعنی ''اہل ایمان کی صفات'' اللہ تعالی مسلمانوں کو جن کاموں کے کرنے کا حکم دیتا ہے یا جن کاموں سے روکتا ہے۔ اسے کہنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ کسی کام کے کرنے کا حکم (صیغہ امر) میں

Marfat.com

دیتا ہے یا (صیغہ نہی) کے فعل سے روک دیتا ہے۔ کبھی کسی کام کے کرنے کا نتیجہ آخرت کی کامیابی یا آخرت کی سزا قرار دیتا ہے۔۔ اور کبھی ان چیزوں کو مومنوں کی خاص صفات کہہ کر بیان کرتا ہے۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ سب اچھے' ضروری اور اللہ کے پسندیدہ کام ہیں۔ ان دو آیات میں یہی طریقہ استعمال ہوا ہے۔

(۱) پہلی آیت (۷:الف) میں اہل ایمان کی نو (۹) نمایاں صفات بیان ہوئی ہیں۔

ان میں سے اکثر لفظوں کے صرف ترجمہ سے بھی مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ اس میں صرف لفظ "السائحون" ذرا وضاحت طلب ہے۔ اس لفظ (جو "سائح" کی جمع ہے) کے اصل معنی تو ہیں "سیاحت کرنے والے" اور اس سے مراد سیر و تفریح کا سفر یا سیاحت مراد نہیں ہے بلکہ اللہ کی راہ میں سفر کرنا اور پردیس جانا مراد ہے۔ مثلاً جہاد' طلب علم اور تبلیغ دین وغیرہ کاموں کے لیے سفر اختیار کرنا۔ مسلمانوں کی یہ صفت ایشیا اور افریقہ کے بہت سے علاقوں میں اشاعت اسلام کا باعث بنی۔

(۲) اہل ایمان کی ان نو (۹) صفات میں سے ہمارے یونٹ کے موضوع کے لحاظ سے' قابل ذکر صفت وہی "امر بالمعروف اور نھی عن المنکر" ہے۔ آپ نے اب تک اس یونٹ میں جتنی آیات پڑھی ہیں۔ اس مین اس فریضہ کی اہمیت کئی طریقوں سے واضح کی گئی ہے۔ مثلاً کہیں حکم دے کر اور کہیں اسے "صفت اہل ایمان" بتا کر وغیرہ۔

(۳) پہلی آیت (۷:الف) میں تو "امر بالمعروف اور نھی عن المنکر" اہل ایمان کی عام ضروری صفت کے طور پر مذکر ہوا ہے مگر دوسری آیت (۷:ب) میں اسے ان اہل ایمان کی پہچان یا فریضہ کے طور پر بیان ہوا ہے جن کو اللہ تعالیٰ زمین میں حکومت یا اقتدار عطا فرمائے تو وہ کس طرح حکومت کریں گے اور ان کی انتظامی۔۔۔ بلکہ حقیقت میں دفاعی۔ پالیسی اور اندرونی استحکام کا بنیادی اصول یہی "امر بالمعروف اور نھی عن المنکر" ہوگا۔ اس آیت پر مزید بحث اس سے پہلے آپ پڑھ چکے ہیں دوبارہ اس پر نظر ڈال لیجئے:۔

اس آیت (۷:ب) کا تعلق "غلبہ دین حق" کے موضوع سے بھی ہے اور " امر بالمعروف اور نھی عن المنکر" سے بھی ہے۔ اس سے آپ یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ خود

Marfat.com

"غلبہ دین" اور " امربالمعروف اور نھی عن المنکر" کے بغیر "غلبہ دین حق" کے لیے راہ ہموار ہی نہیں ہو سکتی اور "غلبہ دین حق" کو استحکام "امربامعروف اور نھی عن المنکر" کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

☆☆☆

Marfat.com

عقائد و عبادات

Marfat.com

دینِ اسلام-1

(توحید)

ہم مسلمانوں کے دین کا نام اسلام ہے۔ دینِ اسلام کی تعلیمات پر بات کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان دو الفاظ دین اور اسلام کے بنیادی، لفظی اور اصطلاحی معنی اور مطلب سے آگاہ ہو لیں۔ اتنی سی بات بھی بڑی حد تک آپ کی سوچ اور فکر کا صحیح راستہ متعیّن کر دے گی۔

دین کے معنی:

لفظ دین عربی زبان کے جس فعل سے نکلا ہے، اس کے چار لفظی معانی ہیں:

۱- بدلہ دینا، محاسبہ کرنا

۲- حکم چلانا، مالک اور متصرِف ہونا

۳- حکم ماننا، اطاعت کرنا اور فیصلہ قبول کرنا

۴- مذہب یا مسلک بنا لینا، طریقہ اختیار کرنا (نظری یا عملی) دستور اور ضابطہ بنا لینا۔

ان میں سے پہلے تین معانی، جیسا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے، ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہیں۔ بلکہ صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ دین میں دو ایسے فریقین یا طرفین کے تعلق کا مفہوم موجود ہے، جن میں سے ایک دوسرے کے تابع فرمان ہوتا ہے - لله الدّین (۱) (دین صرف اللہ ہی کے لئے ہے) کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔

۱- یہ قرآن کی ایک آیت کا حصہ ہے۔ (الزمر : ۳) پوری عبارت یوں ہے:
الا لله الدین الخالص (دیکھو خالص اطاعت اللہ کے لیے ہے)۔

Marfat.com

۱۔ حکم دینے کا حق صرف اللہ کو ہے۔

۲۔ حکم صرف اللہ کا ماننا چاہیے۔

ان معنوں سے ہی "دین" کا چوتھا معنیٰ پیدا ہوتا ہے، اس لیے کہ حکم چلانے یا فیصلہ کرنے اور حکم بجا لانے یا فیصلہ ماننے کی وضاحت کسی دستور، ضابطے اور قانون سے ہو گی۔

دین کے ان سب معنوں میں مشترک خصوصیت "لازمی ہونا" ہے۔ (الف) وہ جس کا حکم ماننا لازمی ہے، (ب) وہ جس پر حکم ماننا لازمی ہے، (ج) وہ حکم جسے ماننا لازمی ہے۔

لفظِ "دین" کے تمام معنوں، مثلاً حکم، بدلہ، فیصلہ، جزا، ضابطہ، قانون، دستور، مذہب، مسلک اور طریقہ وغیرہ تمام الفاظ میں "لازمی" کا معنی موجود ہے۔

قرآن کریم میں لفظ دین ۹۲ جگہ آیا ہے اور زیادہ تر دستور زندگی یا ضابطہ حیات کے معنوں میں ہی آیا ہے۔ یعنی ان معنوں میں جن کے لئے اصطلاح کے طور پر اردو میں "مذہب"، انگریزی میں "RELIGION" اور ہندی میں "دھرم" یا "مت" کے الفاظ مستعمل ہیں۔ یوں تو "مذہب" بھی عربی لفظ ہے مگر اس کے معنی صرف "جانے کا راستہ" ہیں۔ یہ لفظ اپنے معنوں میں لفظ "دین" کی سی وسعت نہیں رکھتا اور نہ یہ لفظ (مذہب) قرآن کریم میں کہیں استعمال ہوا ہے۔ اردو میں اب یہ لفظ (مذہب) اپنے اصل عربی معنی کے بجائے "دین" کے معنوں میں ہی استعمال ہوتا ہے، بلکہ ہر لحاظ سے اس کا مترادف بن گیا ہے، اس لئے کم از کم اردو میں "دین اسلام" یا "مذہب اسلام" دونوں طرح کہنا درست ہے، پھر بھی مذہب کی جگہ دین کا لفظ اختیار کرنا بہتر ہے، اس لیے کہ قرآن کریم میں یہی لفظ آیا ہے۔ یہی بات انگریزی، ہندی یا دنیا کی کسی بھی زبان کے ایسے لفظ کی بابت درست ہو گی جو "مذہب" کے معنی رکھتا ہو۔ لفظ "دین" ان سب سے جامع اور وسیع لفظ ہے۔ لہذا اردو میں بھی مذہب کی

Marfat.com

بجائے دین کے لفظ کو رواج دینا چاہیے (۱)۔

اسلام کے معنی

اب آیئے ذرا دین اسلام کے دوسرے لفظ اسلام کے معنی سمجھئے:

لفظ اسلام کے عربی میں تین بنیادی لغوی معنی ہیں :

الف: آفتوں وغیرہ سے محفوظ ہونا - سلامتی پانا

ب- صلح کرنا ' امن و امان پانا '

ج- حکم بجا لانا ' فرماں برداری اختیار کرنا ' سر تسلیم خم کر دینا -

دین کی طرح لفظ اسلام کے لغوی معنوں سے بھی ذہن میں یہ بات خود بخود آتی ہے کہ اس لفظ کے ساتھ ایک ایسی زبردست قدرت اور طاقت والی ہستی کا تصور لازمی ہے ' جس کا حکم دل و جان سے مان لینا امن اور سلامتی کی ضمانت ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں لفظ " اسلام " اکثر اللہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے ۔ اس طرح اس کا مطلب ہو گا " اللہ تعالی کے آگے اطاعت کے لئے سر جھکا دینا اور اس کا حکم بے چوں و چرا بجا لانا"۔ یہی معنی اب اگر اس کے ساتھ اسم جلالت (اللہ) استعمال نہ بھی ہو تب بھی صرف لفظ " اسلام " سے مطلقاً اطاعت کے لئے سر جھکا دینا نہیں بلکہ اللہ تعالی کے آگے سر جھکا دینا ہی مراد لیا جائے گا ۔

لفظ "اسلام " قرآن کریم میں ۶ جگہ استعمال ہوا ہے اور اس سے مشتق (نکلنے والے) اسماء اور افعال بکثرت آئے ہیں ۔ مثلاً لفظ مسلمؔ کے معنی ہوں گے "اللہ تعالی کے بے چوں و چرا فرماں برداری اختیار کرنے کا طریقہ یا مذہب "۔ اس طرح ہمارے دین کے نام سے ہی امن و صلح ' حفاظت اور سلامتی کے علاوہ اللہ تعالی کی اطاعت کا

۱- اسلامی اصطلاح کے طور پر مذہب فرقے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ' مثلاً شیعہ ' سنی وغیرہ ' لفظ " فرقہ " میں سے الگ الگ ہونے اور پھوٹ پڑ جانے کی بُو آتی ہے ۔ اس لئے ہم اس کتاب میں ان معنوں کے لئے " اسلامی فرقے " کی بجائے ہر جگہ " اسلامی مذاہب " کا لفظ استعمال کریں گے ۔

Marfat.com

تصور وابستہ ہے ۔ دینا کے کسی مذہب کے نام میں یہ بات نہیں پائی جاتی ۔ دوسرے مذاہب اپنے بانیوں کے نام ' لقب ' قوم یا علاقے وغیرہ کی طرف منسوب ہوتے ہیں ۔ کسی مذہب کے نام سے اس مذہب کی غرض و غایت یا اس کے احکام اور پروگرام یا اس کی کسی نظریاتی خصوصیت کی طرف اشارہ نہیں پایا جاتا ۔

یہ صرف ہمارے ہی دین (اسلام) کی امتیازی خصوصیت ہے کہ اس کے نام میں ہی اس کے مقصد اور اس کے پیغام کی طرف واضح اشارہ موجود ہے ۔

عقیدے اور ایمان کے معنی

اب تک ہم نے زیادہ تر " دین " اور " اسلام " کے لفظی معنوں پر ہی بات کی ہے ۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ :

الف- دین ' کے لفی معنوں میں ہی ایک ایسی برتر اور قادر ہستی کا تصور موجود ہے جو بے بس نہیں بلکہ اس کا حکم چلتا ہے ' جو دانا اور عادل بھی ہے اور اپنے احکام کی تعمیل کے بارے میں محاسبہ بھی کرتی ہے ۔

ب- " اسی طرح " اسلام " کے لفظی معنوں میں ہی اس برتر ہستی کی فرماں روائی کے آگے سر تسلیم خم کرنے اور اس کے تمام احکام بے چوں و چرا بجا لانے کا تصور پایا جاتا ہے "۔

اسلام میں اس " بزرگ و برتر ہستی " کا نام " اللہ " ہے ۔ تصور کی بجائے ہم " عقیدے " کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں کیونکہ " تصور " میں محض ایک سوچ کا مفہوم ہے جبکہ عقیدے میں یقین کی ایسی پختگی کا مفہوم موجود ہے جو آدمی کے دل و دماغ پر مسلط ہو کر اس کے تمام اعمال میں سرایت کر جائے ۔

عقیدے کا لفظ " عقد " سے نکلا ہے ' جس کے معنی ہیں " مضبوط گرہ باندھنا ' مضبوط اور پکا کر لینا " ۔ عقیدے کا لفظ اگرچہ " تصور " اور نظریے " سے بلند تر اور بہتر ہے اور اس لفظ (عقیدے) کو ہم بطور اصطلاح عام استعمال کرتے ہیں ۔ تا ہم قرآن

Marfat.com

کریم میں یہ لفظ کہیں بھی استعمال نہیں ہوا۔

قرآن کریم میں اس کی بجائے لفظ "ایمان" اختیار کیا گیا ہے۔ لفظ "ایمان" میں صدق اور یقین کا دل کی گہرائیوں تک اتر جانے کا جو مفہوم ہے وہ لفظ "عقیدے" میں بھی نہیں ہے۔ ایک فرق ان دونوں لفظوں میں یہ بھی ہے کہ عقیدے کا لفظ اپنے اندر "پختگی" کا معنی تو رکھتا ہے مگر "درستی" اور "راستی" کا اس میں پایا جانا ضروری نہیں۔ "عقیدہ" غلط یا باطل بھی ہو سکتا ہے۔ مگر ایمان اپنے لفظی معنوں کے لحاظ سے اکثر اور اصطلاحی معنوں کے لحاظ سے ہمیشہ حق اور صداقت کے لئے بولا جاتا ہے۔ مثلاً آپ "غیر اسلامی عقیدے" کا لفظ تو استعمال کر سکتے ہیں مگر "غیر اسلامی ایمان" کہنا درست نہیں ہو گا۔

بہرحال "ایمان" یا "درست عقیدہ" دین کی بنیاد بلکہ اس کی جان ہے کیونکہ ایمان محض "جان لینے" کا نہیں بلکہ دل سے "مان لینے" کا نام ہے۔ جب تک بات دل میں نہیں اترتی ' وہ دین یا دستور کیسے بنے گی؟ اسی لیے اسلام اور اسلامی تعلیمات کی بات کرتے ہوئے پہلے سبق کا اصل موضوع اسلام کے بنیادی عقائد یا "ایمانیات" کا بیان ہے مگر اس سے بھی پہلے دین اسلام کی اہمیت کو جان لینا ضروری ہے' اس لیے کہ جب دین اسلام کی عظمت ' ضرورت اور اہمیت سے آگاہ ہوں گے تو خود بخود "دین اسلام" کو سمجھنے اور اس کے عقائد اور احکام کو جاننے کا شوق پیدا ہو گا۔

دین اسلام کی اہمیت

دین اسلام کے بارے میں قرآن کریم میں دو بنیادی باتیں بیان ہوئی ہیں ' ان کو ذہن میں رکھنا چاہیے :-

الف- انّ الدینَ عِندَ اللہِ الاسلَام (آل عمران: ١٩) "یقیناً اللہ تعالیٰ کے ہاں تو دین صرف اسلام ہی ہے۔ کیا آپ نے غور کیا کہ اس آیت میں دین کے بجائے "الدین"

Marfat.com

اور اسلام کے بجائے "الاسلام" آیا ہے۔ یعنی دونوں لفظوں کے شروع میں " ال" لگا ہوا ہے - یہ عربی گرامر کی بات ہے اور ہم آپ کو اس میں الجھانا نہیں چاہتے ' تاہم یہ بات ذہن میں رکھ لیجئے کہ آیت کے ترجمہ میں " تو "، "صرف" اور " ہی " سے جو زور پیدا ہوا ہے ' وہ اسی " اَل" کی وجہ سے ہے - عربی میں " اَل" کا وہی مفہوم ہے جو انگریزی میں "The" کا ہے -

ب- وَمَن یَّبتَغِ غَیرَ الِاسلامِ دِیناً فَلَن یُّقبَلَ مِنہ ۔ وَھُوَ فِی الاٰخِرَۃِ مِنَ الخٰسِرِینَ .(آل عمران:۸۵) " اور جو شخص اسلام (اور صرف اسلام) کے سوا کوئی اور دین ، مذہب یا طریقہ (اختیار کرنا) چاہے گا تو اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ زیاں کاروں میں سے ہو گا۔"

ان دونوں آیتوں کا مضمون یوں تو واضح ہے تاہم اگر ذرا غور و فکر سے کام لیں تو اتنے سے مضمون پر بھی کچھ سوالات ذہن میں ابھر سکتے ہیں ۔ ہم ان سوالات کو خود ہی آپ کے ذہن میں ابھار کر ، ان کے جوابات کا ذکر، اختصار کے ساتھ ہی سہی ، اس لیے پہلے کرنا چاہتے ہیں کہ اس سے آپ کا ذہن دین کے متعلق آئندہ بیان کردہ باتوں کو سمجھنے کے لئے تیار ہو جائے گا ۔ یہ سوالات کچھ اس قسم کے ہو سکتے ہیں:

ا- اللہ سے کیا مراد ہے ؟ (۲) جب دین اسلام اللہ کی فرمانبرداری کے طریقے کا نام ہے تو وہ کون سے احکام ہیں جن میں فرمانبرداری مطلوب ہے ؟ (۳) یہ بات کہ " اسلام کے سوا کوئی بھی دوسرا دین اللہ کی طرف سے نہیں " کیسے درست ہو سکتی ہے' جبکہ اسلام کا آغاز تو ایک خاص زمانے سے ہوا (آج سے کوئی چودہ سو سال پہلے) کیا اس سے پہلے اللہ تعالی کی طرف سے کوئی دین تھا ہی نہیں ؟ (۴) انسانوں کے لئے یہ کیوں ضروری ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی " دین" خواہ مخواہ اختیار کریں ؟ اگر کوئی آدمی دین بھی اختیار نہ کرے تو؟ (۵) آخرت سے کیا مراد ہے؟

اب جوابات بھی اسی ترتیب سے سنیئے:

(۱) پہلے سوال کا مختصر جواب ابھی اوپر گذر چکا ہے ' مگر اس کی تفصیل آگے

Marfat.com

توحید کے بیان میں آ رہی ہے۔

(۲) دوسرے سوال کا جواب بھی آگے "رسالت" کے عنوان میں آئے گا۔

(۳) تیسرے سوال پر دوبارہ "رسالت" کے عنوان کے تحت بھی بات آئے گی تاہم یہاں بھی اس کی وضاحت ضروری ہے۔ یاد رہے کہ قرآن کریم میں یہ بات ایک سے زیادہ جگہ پر واضح کر دی گئی ہے تمام نبی اور رسول، جو دین لے کر آتے رہے وہ اسلام ہی تھا۔ اس کے بنیادی عقائد (مثلاً توحید، رسالت، آخرت) اور عبادات و احکام (مثلاً نماز، روزہ اور زکوٰۃ) ہمیشہ اصولی طور پر یکساں ہی رہے، صرف کیفیت میں فرق ہونا اور بات ہے۔ تمام انبیاءؑ اور ان کے پیرو اپنے زمانے کے مسلمان تھے، چاہے ان کی اپنی زبان میں "اسلام" کے لیے جو بھی لفظ بولا جاتا رہا ہو۔ اس لئے کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام کے معنی میں کسی بھی شخص، زمانے، علاقے یا نسل وغیرہ کا سرے سے مفہوم ہی موجود نہیں ہے۔

ہمارے نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے بھی، جو سب سے آخری نبی ہیں، وہی دین (اسلام) پیش کیا جو پہلے انبیاء پیش کرتے رہے۔ فرق صرف تین باتوں میں ہے۔ (ا) پہلی امتیں اپنے رسولوں کی اکثر تعلیمات محفوظ نہ رکھ سکیں جبکہ اللہ تعالی نے آنحضرت ﷺ کی اصل تعلیمات کی خصوصی طور پر حفاظت فرمائی ہے، (ب) دوسرے یہ کہ پہلے کبھی دین کی باتیں اتنی جامع اور مکمل بھی نہیں بتائی گئیں جتنی آنحضور ﷺ کے ذریعے بتائی گئیں (ج) آنحضرت ﷺ آخری نبی ہیں۔ اب احکام کی تفصیل میں آپؐ کی پیروی کی جائے گی۔ کیونکہ پہلے انبیاء کے احکام یا تو محفوظ نہ رہے یا جامع اور مکمل نہ ہونے کے باعث وقتی تھے، دائمی نہ تھے۔

دین اسلام کے ہمیشہ سے ایک ہی دین ہونے کا ایک ثبوت یوں ملتا ہے کہ اب بھی تمام مذاہب میں کچھ نہ کچھ تعلیمات ملتی جلتی ہیں۔ یہ بات خود ہمارے نبی ﷺ کی سچائی کی دلیل بھی ہے، اس لیے کہ آپؐ نے ہمیشہ اسلام ہی کے اصل دین ہونے پر زور دیا۔ دین اسلام کی آخری، مکمل اور محفوظ شکل وہی ہے جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ

Marfat.com

نے پیش کی ' لہٰذا اب ہم اصطلاحی معنوں میں " اسلام" کا لفظ اسی لیے استعمال کرتے ہیں ۔

(۴) اب آیئے چوتھے سوال کی طرف تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ انسان کوئی " دین " بھی اختیار نہ کرے ۔ آپ پڑھ آئے ہیں کہ دین کا مطلب ہے طریقہ زندگی یا دستور حیات ۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی آدمی زندگی گزارنے کے لئے کوئی بھی اصول یا طریقہ اختیار نہ کرے ؟ یہ تو ہو سکتا ہے کہ وہ ہر چار دن کے بعد طریقہ یا مذہب بدلتا رہے ' مگر " بے اصول" اور " بے دین" ہونا بھی ایک اصول یا دین ہی تو ہوا۔ فرق تو صرف غلط یا صحیح دین اور اچھے یا بُرے " طریق زندگی " کا ہی رہ گیا۔(۱) گویا لفظی معنوں (طریق زندگی) کے لحاظ سے تو دنیا میں کوئی آدمی بھی " بے دین " نہیں ہوتا' البتہ اصطلاحی معنوں کے لحاظ سے " بے دین" اسے کہا جاسکتا ہے جو دین اسلام کا پیرو اور پابند نہ ہو ۔ بات یہ ہے کہ دنیا میں کوئی آدمی ایسا نہ ہوا ہے نہ ہو گا ' جس نے کبھی اپنے اور اس دنیا کے آغاز اور انجام کے بارے میں کچھ نہ کچھ پوچھا یا سوچا نہ ہو ۔ اس کا جواب اسے جو بھی ملے ' جہاں سے بھی ملے ۔ اپنی سوچ اور مطالعہ سے ' معاشرتی ماحول سے ' یا بچپن کی تربیت سے -- شعوری یا غیر شعوری طور پر اس سوال کا کوئی نہ کوئی جواب اس کا ذہن قبول کرتا ہے اور پھر اس " جواب" کے مطابق اس کے ذہن میں زندگی کا ایک مقصد متعین ہو جاتا ہے ۔ اس کے بعد اس کے تمام اعمال اور سارے کام اس کے ذہن میں محفوظ مقصد کے مطابق سرزد ہوتے رہتے ہیں 'گویا پہلے افکار یا عقائد اور پھر ان کے مطابق کردار -- " دین " یہی تو ہے - غلط نظریات کی بنیاد پر غلط طریق زندگی اختیار کرنے سے اول تو لازماً معاشرے کے دوسرے افراد کو تکلیف پہنچے گی اور بالآخر غلط طریقہ اختیار کرنے والے کو بھی اس کا نقصان اٹھانا پڑے گا ' اسی طرح اصل اسلام کو چھوڑ کر کسی بھی دوسرے مذہب کو کسی بھی درجے میں اپنانے کا بُرا نتیجہ اسے دیکھنا ہی پڑے گا ۔

پانچویں سوال کا مفصل جواب اسی یونٹ میں آگے چل کر " آخرت " ہی کے

۱- قرآن کریم کی آیت لَکُم دِینُکم وَلِیَ دِین (تمہیں تمہارا دین اور مجھے میرا دین) الکافرون-٦ میں اسی فرق کی طرف اشارہ ہے ۔

Marfat.com

عنوان سے آرہا ہے ۔ آپ نے شاید نوٹ کیا ہو گا کہ مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں "دین" اور "اسلام" کے الفاظ معناً یک دوسرے کے لازم و ملزوم بلکہ تقریباً مترادف آئے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم صرف "دین" کہتے ہیں تو بھی ہمارا مطلب دین اسلام" ہی ہوتا ہے اور صرف اسلام کہیں تو اس سے "اسلام بطور دین کامل" مراد لیا جاتا ہے - خود قرآن کریم میں دِینَ اللہ (اللہ کا دین) ' دِینِ الحقِّ (سچائی کا دین) اور اَلدِینُ القَیِّمُ (مضبوط اور پکا دین) وغیرہ کہکر "اسلام" ہی مراد لیا گیا ہے ۔ اسلام کے متعلق بہت سے باتیں صرف دین کہکر کی گئی ہیں مثلاً مسلمانوں کا باہم اخوان فی الدین (دینی بھائی) ہونا ' اِقَامَۃُ الدّین (دین کا نفاذ) واجب ہونا ' تَفَقُّہ فِی الدّین (دین کی سوجھ بوجھ) پیدا کرنا ' غُلوُ فِی الدین (دین میں مبالغہ آمیزی) کی مذمت اور تفرقہ فی الدین (دین میں فرقہ بندیاں قائم کرنے) کی ممانعت وغیرہ - یہ ساری باتیں دین اسلام ہی کے بارے میں ہیں ۔

۵-۱ دین اسلام کی تعلیمات کا تاریخی پس منظر

یہاں تک تو ہم نے "دین"، "اسلام"، "عقیدہ" اور "ایمان" کے لفظی اور اصطلاحی معنوں ' ان کے مضمرات اور ان کے باہمی تعلق کی نوعیت کا جائزہ لیا ہے۔ اب ہم اصطلاحی اسلام یعنی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے ' بتائے ہوئے اور سکھائے ہوئے دین پر اس کے تاریخی نقطہ آغاز کے پس منظر میں ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہیں ۔ اس سے ہمیں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اپنی نسبت اور اس کے تقاضوں کا کچھ احساس ہو گا اور یہ احساس بھی ہمیں اپنے ہادی و رہنما پیغمبر ﷺ کے دین کے کم از کم ضروری پہلوؤں سے آگاہ ہونے پر آمادہ کرے گا ۔

دین اسلام کا یہ "محمدی دور" آج سے کم وبیش چودہ سو سال پہلے اس دن شروع ہوا ' جس دن حضرت محمد ﷺ نے اعلان نبوت فرمایا ۔ اس سے پہلے آنحضور ﷺ اپنے شہر مکہ مکرمہ میں اپنی عمر کے چالیس سال گزار چکے تھے ۔ آپؐ کے

Marfat.com

ہم وطنوں کا عام مذہب شرک اور بت پرستی تھا ۔ وہ لوگ اور بھی بیسیوں قسم کی خرابیوں میں مبتلا تھے کیونکہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ کسی زندگی کے قائل نہ تھے بلکہ سختی سے اس کا انکار کرتے تھے ۔ اس ماحول میں ہمارے آقا (محمد بن عبداللہ) ﷺ نے اپنی زندگی کے چالیس برس اس طرح گزارے کہ سب لوگ ان کے اخلاق و عادات اور سیرت و کردار کے مداح تھے ۔ سارے شہر میں ان کی سچائی اور امانت کی دھوم تھی ۔ اس وقت آنحضور ﷺ نے اپنے ہم وطنوں کے سامنے یہ دعوی کیا اور اس بات کی تبلیغ شروع کی کہ :

> اللہ تعالی نے خود مجھے تمہاری طرف اپنا پیغام پہنچانے والا (رسول) مقرر کیا ہے اور اس پیغام کی بنیادی باتیں دو ہیں ۔(۱) یہ کہ اللہ کے سوا ' بلکہ اس کے ساتھ بھی کسی اور کی عبادت ہرگز درست نہیں۔(۲) یہ کہ مرنے کے بعد تم سب دوبارہ زندہ کیے جاؤ گے اور وہاں تم سے اس زندگی میں کیے گئے کاموں کا حساب لیا جائیگا ۔

جن لوگوں نے آپؐ کی تصدیق کی ' آپؐ پر ایمان لائے یعنی آپؐ کی ساری کی ساری باتوں کی دول سے سچ جان کر مان لیا) ' وہ مسلمان کہلائے اور انکار کرنے والے کافر ' آہستہ آہستہ ان دو گروہوں کا دائرہ پورے ملک عرب تک اور پھر ساری دنیا تک وسیع ہو گیا ۔ ۲۳ برس تک حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے دین اسلام کی تبلیغ کی ' یہاں تک کہ پورے عرب میں آپؐ کا دین پھیل گیا ۔ اس مدت میں آپؐ کو کیا مشکلات پیش آئیں اور آپؐ کو کیسے کامیابی حاصل ہوئی ' اسے بیان کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے ۔ " سیرت پاکؐ " پر لکھی ہوئی سینکڑوں کتابوں میں پوری طرح یہ داستان محفوظ ہے ۔ جو بات اس وقت ہم کہنا چاہتے ہیں ' وہ یہ ہے کہ آنحضور ﷺ نے ۲۳ برس کی اس مدت میں دین اسلام کے بنیادی عقائد یا ایمانیات اور ہر قسم کے ضروری عملی احکام جس تفصیل اور وضاحت سے بیان فرمائے وہ سب کچھ " کتاب و سنت "

Marfat.com

(قرآن کریم اور حدیث نبوی) میں محفوظ ہے ۔ ہم آج بھی محمد رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے ' بتائے ہوئے بلکہ پورے اور مکمل طور پر عمل کر کے دکھائے ہوئے دین اسلام کو " قرآن و حدیث " کی مدد سے بالکل اسی طرح سمجھ سکتے ہیں جیسے آنحضرت ﷺ کے اپنے زمانے میں ' بلکہ آپؐ کے سامنے بیٹھ کر سیکھنا ممکن تھا ۔

اسلام کی پوری اور اصل تعلیمات کا محفوظ ہونا بھی ہمارے دین کی ایک اور امتیازی خصوصیت ہے ۔

ایمانیات کی اہمیت

اس یونٹ کے آئندہ صفحات میں ہم سب سے پہلے اسلام کے اہم بنیادی عقائد یا ایمانیات کی بات کریں گے اس لیے کہ (۱) آنحضرت ﷺ جب خود اسلام کی تبلیغ فرماتے تھے تو سب سے پہلے عقائد کی اصلاح یا ایمان کی دعوت دیتے تھے ۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ " ایمانیات " اور عقائد میں آنحضورؐ خود کس بات پر زیادہ زور دیتے تھے ' کیونکہ اصل دین وہی ہے اور (۲) اس لیے بھی کہ ہم دین اور اسلام کے لفظی معنوں میں بھی یہ بات دیکھ چکے ہیں کہ ایمان یا درست عقیدہ ہی دراصل دین کا لازمی اور بنیادی جزو ہے۔

اسلام کے بنیادی عقائد جنہیں بعض دفعہ عام اصطلاح میں ایمانیات یا اجزائے ایمان بھی کہتے ہیں ' متعدد ہیں لیکن تین باتیں ایسی ہیں جو تمام " اسلامی مذاہب " میں متفقہ طور پر اسلام کی اصل اور بنیاد ہیں ۔ اسلام کے یہ تین بنیادی عقائد یا " اصول ثلاثہ " حسب ذیل ہیں۔

۱-توحید ۲- رسالت ۳- آخرت

اب ہم ان تینوں موضوعات پر کتاب و سنت کی روشنی میں بات کریں گے ۔
یہ تو ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ دین اسلام کی اصل اور صحیح تعلیمات کا منبع اور سرچشمہ "کتاب و سنت " یا قرآن کریم اور حدیث نبوی ہے ۔

Marfat.com

جب بھی دین کے بارے میں کسی مسئلہ میں ' یا مسلمانوں کے کسی عام رواج یا کسی بھی اور معاملے میں آپ صحیح دینی اسلامی نقطہ نظر ' موقف یا حکم دریافت کرنا چاہیں تو ہمیشہ جواب "کتاب و سنت" کے حوالے سے طلب کریں ۔ آپ کا شمار اچھے پڑھے لکھے مسلمانوں میں ہو گا ۔ دینی امور یا دنیوی مسائل کے حل میں (کیونکہ ہمارا دین ہر طرح کی رہنمائی دیتا ہے بلکہ ہر جگہ پر اپنی ہر رہنمائی پر اصرار کرتا ہے) ہمیشہ دین کے اس اصل سرچشمے کی طرف رجوع کریں ' وہیں پورا دین موجود اور محفوظ ہے ۔ یہی علم ہے ۔ یہی دیانت اور یہی اصل مسلمانی ہے ۔ کبھی یہ نہ دیکھیے کہ کون کیا کہہ رہا ہے؟ یا کتنے لوگ کہہ رہے ہیں ؟' یہ دیکھیے کہ کیا کہا جا رہا ہے اور کتاب و سنت کی رو سے اس کی کیا حیثیت ہے ؟ یہ اصول آپ کے لیے دین اسلام کا صحیح علم اور اس سے صحیح رہنمائی حاصل کرنے کا دروازہ کھول دے گا ۔ ان شاء اللہ .

☆☆☆

Marfat.com

۲- توحید

توحید کے لفظی اور اصطلاحی معنی

لفظ ''توحید'' کے لغوی معنی ہیں ''ایک بنانا'' اور ''یک جا کر دینا'' اس کی اصل ''وحدت'' ہے اور اسی سے نکلے ہوئے ایک اور لفظ اتحاد سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ اصطلاح کے طور پر لفظ ''توحید'' اب لا الہ اللہ کے معنوں میں استعمال ہے، یعنی: اللہ کے سوا کسی اور کو ہرگز الہ نہ ماننا۔

قرآن کریم میں لفظ ''توحید'' تو استعمال نہیں ہوا البتہ اللہ تعالیٰ کے لیے ''واحد'' اور ''اَحَد'' کے نام آنے کی بنا پر اور اس موضوع پر قرآن کریم کی بکثرت تفصیلات اور بتکرار تعلیمات کے بطور ایک ''عنوان'' کے یہ اصطلاح اختیار کی گئی ہے اور اس لیے عربی میں ایک اور لفظ ''وحدانیۃ'' بھی مستعمل ہے۔ مگر زیادہ مشہور اصطلاح ''توحید'' ہی ہے۔

شرک کے لفظی اور اصطلاحی معنی:

توحید کے مقابل اور اس کی ضد لفظ ''شرک'' ہے۔ یہ لفظ قرآن کریم میں بھی استعمال ہوا ہے اور توحید ہی کو سمجھانے کے لیے استعمال ہوا ہے اس لیے کہ توحید' شرک کا نہ ہونا اور شرک' توحید کا نہ ہونا - شرک کے لغوی معنی ہیں ''حصہ دار بنا لینا یا مان لینا اور ساتھ شامل کر لینا۔'' لفظ اسلام کے معنی کی طرح یہاں بھی ''اللہ'' خود بخود سمجھا جاتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو بھی حصہ دار مان لینا' اس طرح اصطلاحاً شرک کا مطلب ہے:

اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی اِلٰہ مان لینا۔

Marfat.com

توحید اور شرک کا تعلق

توحید اور شرک کے لفظی اور اصطلاحی معنوں سے ہی یہ بات تو واضح ہو گئی کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں ۔ توحید اور شرک ہرگز ہر گز ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے اور ان میں کسی طرح کا سمجھوتہ " دھوپ اور چھاؤں" کے یکجا ہونے کی طرح ناممکن ہے ۔

اس کے ساتھ جب ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ توحید ' دین اسلام کا پہلا بنیادی اصول ہے ۔ اسلام کا سارا نظام ہی توحید کے گرد گھومتا ہے ۔ توحید ہی تمام انبیاءؑ کی دعوت کا نقطہ آغاز تھا اور اسلامی زندگی اول و آخر توحید کے ساتھ وابستہ ہے ۔ دوسری طرف شرک ' توحید کی نفی ہے ۔ شرک ہی تمام برائیوں اور گمراہیوں کی اصل ہے اور اسے قرآن کریم میں سب سے بڑا ظلم اور ناقابل معافی جرم قرار دیا گیا ہے :

اِنَّ الشِّرکَ لَظُلْمٌ عَظِیمٌ یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے ۔ (لقمان -۳)

اِنَّ اللهَ لَا یَغفِرُ اَن یُّشرَکَ بِه وَ یَغفِرُ مَا دُونَ ذٰلك لِمَن یَّشَآءُ ۔ یقیناً اللہ تعالیٰ یہ بات تو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے ' البتہ اس کے علاوہ (گناہ) جسے چاہے معاف کر دے ۔(النساء :۴۸:۱۱۶)

حدیث شریف میں شرک کو " اَکبَرُ الکَبَائِر" بڑے گناہوں میں سے بھی سب سے بڑا گناہ ' کہا گیا ہے ۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ کوئی امت اور کسی مذہب کے پیرو اس مہلک خرابی سے محفوظ نہیں رہے اور جہاں بھی اس برائی کی ذرا ابتداء ہوئی ' اس نے بہت جلد ایک وباء کی صورت اختیار کر لی ۔ ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمارے لیے نہایت ضروری ہے کہ ہم توحید اور شرک کا مطلب اچھی طرح سمجھ لیں۔ آپ نے ابھی پڑھا کہ توحید کا مطلب ہے " اللہ کے سوا کسی اور کو ہرگز الٰہ نہ ماننا " اور شرک کا مطلب ہے " اللہ کے سوا کسی اور کو بھی الٰہ مان لینا "۔ اس سے یہ بات خود بخود معلوم ہو جاتی ہے کہ

Marfat.com

اگر ہم نے " اللہ اور الٰہ " کا مطلب جان لیا تو پھر توحید اور شرک کا فرق بھی سمجھ میں آ جائے گا۔

الٰہ کے معنی

ہم پہلے الٰہ کے معنی کو لیتے ہیں ' اس لیے کہ ہر قسم کے " الٰہ" کے انکار اور نفی کے بعد ہی اللہ تک پہنچنا ممکن ہے۔ لفظ " الٰہ " کے لفظی معنی عربی میں اس طرح ہیں:

(۱) جس کی عبادت (پوجا یا پرستش) کی جائے۔ (۲) جس کے بارے میں عقل حیران ہو۔ (۳) جس سے بے پناہ محبت اور عقیدت ہو۔ (۴) جو انسانی حواس سے ماورا اور پوشیدہ ہو۔

ان سب معنوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے الٰہ کا ترجمہ " معبود "، " دیوتا" یا "God" کیا جاتا ہے تاہم اردو میں زیادہ مستعمل لفظ " معبود " ہے۔

الٰہ سے مراد کوئی ایسی ہستی لی جاتی ہے جو بے پناہ قوتوں اور طاقتوں کی مالک ہو ' نظروں سے غائب ہونے کے باوجود اس سے تعلق اور ربط ممکن ہو ' جو انسانوں کو حسی اور مادی وسائل سے ماوراء طریقوں پر نفع یا نقصان پہنچانے پر قادر ہو اور جس کی خوشنودی یا ناراضگی کے ساتھ انسان کی خوش قسمتی یا بدقسمتی وابستہ ہو۔

مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں اور خود عرب میں بھی لوگوں نے اس قسم کی صفات رکھنے والی متعدد ہستیوں کا عقیدہ اختیار کیا ' اسی لیے عربی میں " الٰہ " کی جمع " آلھتہ " بھی استعمال ہوتی ہے۔ دوسری زبانوں میں بھی الٰہ کے ہم معنی الفاظ میں یہی (واحد جمع والی) بات پائی جاتی ہے۔ ان مختلف " الھتہ " یا معبودوں کو ساری اہمیت یا عظمت زیادہ تر صرف " فائدہ پہنچانے والے " یا " ضرر سے بچانے والے " سمجھ لینے کی وجہ سے دی جاتی رہی ہے۔ ورنہ انہیں اس کائنات یا اس کے کسی حصے کا پیدا کرنے والا کبھی نہیں سمجھا گیا۔ الٰہ کے لفظی معنوں میں بھی " پیدا کرنے " کا مفہوم شامل نہیں

Marfat.com

ہے ۔ الہ کو مالک تو سمجھ لیا جاتا ہے ۔ مگر خالق کبھی نہیں سمجھا گیا ۔ خالق کے ساتھ مالک کسی اور کو سمجھ لینا ہی تو شرک ہے ۔

اللہ کا مطلب

متعدد اور مختلف " اٰلھۃ " اور معبودوں یا " مالکوں " کے اس تصور کے ساتھ ہمیشہ سے انسانوں میں اس پوری کائنات کے ایک پیدا کرنے والے خالق اور مالک کے وجود کا عقیدہ بھی موجود رہا ہے ۔

قرآن کریم میں جہاں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ ہر طرح کے نفع و نقصان کا اصل اختیار بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے وہاں زیادہ زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ زمین و آسمان کا بنانے والا ' روئے زمین پر زندگی کو وجود میں لانے والا ' کائناتی قوتوں (ہوا ' بجلی ' پانی ' بارش ' پہاڑ ' سمندر ' نظام شمسی وغیرہ) کا پیدا کرنے والا اور انہیں مقررہ قوانین کا پابند کرنے والا اللہ اور صرف اللہ ہے ۔ اللہ کے ساتھ دوسرے الہ بنا لینے والوں میں سے کسی نے بھی کبھی کسی بھی الہ کو مندرجہ بالا کام کرنے والا نہیں مانا۔

ان سب سے برتر " الہ " بلکہ واحد الہ کا تصور یا خیال اول تو ہر انسان میں فطری طور پر پایا جاتا ہے ۔ فطرت کی اس آواز کے علاوہ عقلی طور پر بھی انسان نے جوں جوں غور کیا ' اسے سورج ' چاند ' ستارے ' ہوا ' پانی ' نباتات ' حیوانات ' غرض کائنات کے ہر چیز نہایت محکم اور ناقابل تغیر قوانین کی پابند نظر آئی ۔ یہ قوانین مقرر کرنے والا کون ہے ؟ کوئی اسے کسی نام سے پکارے مگر اس کے " ہونے " سے انکار ہرگز نہیں کیا جا سکتا ' کیونکہ کائنات کا ایک ایک ذرہ اس کے قوانین کی گرفت میں ہے اور انسان جیسے جیسے علم اشیاء یا سائنس میں ترقی کرتا جاتا ہے اسے ان طبیعی قوانین کے پیچھے کسی نہایت زبردست علم اور طاقت ور ارادے والی ہستی کا ہاتھ کار فرما نظر آتا ہے۔ تمام سائنسی انکشافات اس حقیقت پر شاہد اور تمام سائنسدان اس کے قائل ہیں ۔

Marfat.com

اسی غیبی طاقت ، اسی پوشیدہ قوت ، اسی خالق و مالک اور بزرگ و برتر ہستی کو عربی زبان میں ایک نامعلوم زمانے سے " اللہ " کہا جاتا رہا ہے ۔

اسلام سے پہلے عربوں نے الٰہ تو کئی بنا رکھے تھے مگر اللہ ایک ہی تھا۔

یہی نام (اللہ) قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے ۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی " لآ اِلٰہ اِلا اللّٰہ " کے ذریعے یہی تعلیم دی کہ صرف اللہ ہی الہ ہے ، دوسرا کوئی الہ ہے ہی نہیں ۔ دنیا کی دوسری زبانوں میں یقیناً اس خالق و مالک کے لیے مختلف نام پائے جاتے ہیں اور ان ناموں سے مراد ایک ہی ذات پاک ہے ۔ تاہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم نے اسی نام " اللہ " کو اختیار کر لیا ہے ۔ ہمارے نبی ﷺ نے اسی نام کی تعلیم دی۔ اب یہ نام، اسم علم یا اسم ذات شمار ہوتا ہے ، اس لئے اس کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں نہیں کیا جا سکتا ہے ۔

البتہ اگر اس زبان کے بولنے والے مسلمان بھی اپنی عام گفتگو میں " اللہ " کے لیے اپنی زبان کا وہ لفظ استعمال کریں جس سے ان کی مراد وہی خالق و مالک کائنات ہو تو یہ بات درست ہو گی ۔ مثلاً ہندی میں " ایشور " یا انگریزی میں "God" کہنا ۔ ہمارے ہاں " اللہ " کی بجائے "خدا " کا لفظ رائج ہونے کی وجہ یہی اصول ہے ۔ " خدا" فارسی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی " بڑا " یا " مالک" کے ہیں ۔ (مثلاً فارسی میں وہ خدا ، گاؤں کے چودھری کو کہتے ہیں) اسلام جب ایران میں پہنچا تو فارسی بولنے والوں نے اللہ کے لیے بھی وہی لفظ " خدا " استعمال کرنا شروع کر دیا جو ان کے ہاں پہلے سے اس ذات برتر کے لیے استعمال ہوتا تھا ۔ کثرت استعمال سے یہ لفظ " خدا " اب اسم جلالت " اللہ " کے ہم معنی اور مترادف ہو گیا ہے ۔ اس لئے اب اس کا استعمال درست سمجھا جاتا ہے ۔

تاہم بہتر بات یہی ہے کہ ہمیشہ " اللہ تعالی" استعمال کیا جائے ، البتہ خداوند کہنا کسی طور پر جائز نہیں ہے ۔

Marfat.com

اسماء اللہ الحسنٰی (اللہ کے پیارے نام)

اب جب کہ آپ نے "اللہ اور" الہ" کے معنی کسی حد تک سمجھ لیے ہیں تو یقیناً توحید (یعنی اللہ تعالی کے ساتھ کسی اور کو ہرگز الہ نہ ماننا) یا لآ اِلٰہ اِلا اللّٰہُ (اللہ کے سوا ہرگز کوئی معبود نہیں ہے) کا مطلب بھی سمجھ لینے کی ابتداء ہو گئی ہے۔

یہ بات کہ کس میں کون سی صفات مان لینے سے وہ "الہ" سمجھا جاتا ہے، مسلمان کو جان لینا نہایت ضروری ہے تا کہ وہ غلطی سے بھی کسی اور کو الہ نہ سمجھ بیٹھے۔ یہ بات قرآن کریم میں نہایت تفصیل کے ساتھ اور بار بار سمجھائی گئی ہے۔

ان باتوں کو جاننے کا ایک آسان اور مختصر مگر جامع طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالی کے اسماء حسنی (جس سے مراد ۹۹ صفاتی اسماء مبارکہ ہیں) کو مع ترجمہ یاد کر لیا جائے۔ اللہ تعالی کے اسماء مبارکہ تو خود عربی زبان اور قرآن و حدیث میں بھی ۹۹ سے زیادہ ہیں۔ اگر دنیا بھر کی زبانوں کو سامنے رکھیں تو یہ اسماء حد و شمار سے باہر ہیں۔ صرف ۹۹ اسماء پر زور اس لیے دیا گیا ہے کہ ان کے سمجھ لینے سے توحید کی حقیقت سمجھ میں آ جاتی ہے، توحید کامل یہ ہے کہ ان تمام صفات میں اللہ تعالی کو واحد اور احد (یکتا و لاثانی اور لاشریک) مانا جائے۔ آپ کو زندگی میں جب بھی موقع ملے، "اسماء حسنی" کی کوئی اچھی سی شرح (جو ہر زبان میں ملتی ہیں) بھی ضرور پڑھ لیجئے گا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالی کو دعاؤں میں ان اسماء کے ساتھ پکارنے کا حکم دیا گیا ہے۔

وَ للہ الاسماء الحسنی فادعوہ بھا . اور اللہ کے ہیں بہت اچھے نام، تم اسے ان ناموں سے پکارا کرو(الاعراف:۱۸۰)

ان اسماء کو سمجھ کر یاد کر لینے پر ہمارے نبی ﷺ نے جنت کی خوشخبری دی ہے۔ یہاں صرف چند (بلحاظ ربط مضمون) نہایت اہم اسماء حسنی مع ترجمہ لکھے جاتے ہیں:

اَلرَّبُّ -- پروردگار، ہر چیز کی پرورش کرنے والا

Marfat.com

اَلمَالِكُ یا مَالِكَ المُلكِ -- مالک اور حکمران

اَلْخَالِقُ -- قبل از وجود اندازہ کرنے والا

اَلبَارِیُ -- عدم سے پیدا کرنے والا

اَلمُصَوِّرُ -- صورت دینے والا

اَلقَاھِرُ -- سب پر غالب

اَلعَزِیزُ -- ذرّہ ذرّہ پر متصرف

اَلوَھَّابُ -- داتا ' سب کو ہر چیز عطا کرنے والا

الرَّزّاق -- سب کو ہر طرح کا رزق دینے والا

اَلعَلِیمُ -- سب کچھ جاننے والا

اَلخَبِیرُ -- سب اندرونی باتوں سے آگاہ

اَلسَّمِیعُ -- سب کچھ سننے والا

اَلبَصِیرُ -- سب کچھ دیکھنے والا

المُجِیبُ -- دعا کو قبول کرنے والا

اَلمُحیِی -- زندگی بخشنے والا

اَلمُمِیتُ -- موت دینے والا

اَلْقَدِیرُ -- زبردست قدرت والا

اَلتَّوّابُ -- توبہ قبول کرنے والا

اَلغَافِرُ ' اَلغَفّار -- گناہ معاف کرنے والا

توحید کی اہمیت

توحید کی اہمیت پر مختصر بات پہلے بھی ہو چکی ہے ' تاہم اب تک زیادہ وضاحت اس بات کی کی گئی ہے کہ توحید کیا ہے ؟ اب ہم دین اسلام میں توحید کی اہمیت پر (یعنی یہ کہ کیوں ضروری ہے؟) قرآن و سنت کی روشنی میں نظر ڈالتے ہیں ۔ توحید کا

Marfat.com

مضمون قرآن کریم میں بار بار اور کئی طریقوں سے بیان ہوا ہے ۔ مثلاً:

۱- لَا اِلٰه إلا اللّٰه (اللہ کے سوا کوئی بھی الہ نہیں ہے) یہ عبارت قرآن کریم میں ۱۲ جگہ آئی ہے ۔

۲- لا اله إلا هو (اس اللہ کے سوا کوئی بھی الہ نہیں ہے) یہ بات قرآن مجید میں ۳۰ دفعہ دہرائی گئی ہے ۔

۳- خود اللہ تعالی کی طرف سے متکلم کے صیغہ میں لا اله الا اَنَا (میرے سوا کوئی الہ نہیں ہے) تین جگہ آیا ہے ۔

۴- إلٰهُکم اله واحدٌ (تم سب کا الہ ایک ہی ہے) یہ بات قرآن کریم میں ۶ جگہ بیان ہوئی ہے ۔

۵- اسی طرح کہیں انما اللّٰه اله واحدٌ (بات صرف یہ ہے کہ اللہ ہی اکیلا الہ ہے) کہیں انما هو اله واحد (بات تو صرف اتنی ہے کہ وہی اکیلا الہ ہے) کہیں وما من الهٍ الا اللّٰه (اللہ کے سوا کسی طرح کا کوئی الہ ہے ہی نہیں اور کہیں ما لکم من اله غیرہ (تمہارا اس کے ساوا کوئی اور کسی طرح کا الہ نہیں ہے) کہہ کر مختلف طریقوں سے یہی مضمون ذہن نشین کرایا گیا ہے ۔ پورے قرآن کریم میں اسم جلالت " اللہ" کل ۲۲۹۶ دفعہ آیا ہے اور لفظ " اله " ۱۲۵جگہ اور " الهة " (اله کی جمع) کل ۳۶ جگہ آیا ہے ۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ قرآن مجید میں اس مضمون پر کس قدر تفصیل اور وضاحت سے بات کی گئی ہے۔

قرآن کریم میں یہ بات متعدد بار ' مختلف طریقوں سے اور مختلف سورتوں میں بتکرار بیان ہوئی ہے کہ تمام نبیوں اور رسولوں کی تعلیم میں توحید ہی سرفہرست تھی ' کسی بھی بگڑی ہوئی امت کی اصلاح کا پیغمبرانہ طریقہ یہی رہا ہے کہ سب سے پہلے عقیدہ توحید درست اور مضبوط کیا جائے ۔ خود ہمارے نبی ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز اسی سے فرمایا۔

قرآن کریم نے صرف یہی نہیں سمجھایا کہ توحید کتنی اہم اور ضروری ہے ' بلکہ

Marfat.com

یہ بھی وضاحت سے سمجھایا ہے کہ توحید کسے کہتے ہیں ۔ یہ مضمون "کتاب و سنت" میں اس تفصیل سے بیان ہوا ہے کہ صرف اس موضوع پر مستقل تالیفات موجود ہیں ۔

شرک کی مختلف صورتیں

توحید کو مختلف انداز سے سمجھانے کے ساتھ ساتھ شرک کی مذمت اور اس کی مختلف صورتوں ' اس کے وبال اور برے انجام کا ذکر قرآن کریم میں ۱۵۰ سے زائد جگہ آیا ہے ۔ توحید کو سمجھنے کے لیے شرک کی کیفیت کو جاننا ضروری ہے ۔ کیونکہ شرک سے بچنے کا نام ہی " توحید" ہے۔

شرک کا مطلب اللہ تعالیٰ کا انکار نہیں ہے بلکہ اللہ کے اقرار کے ساتھ ساتھ کسی اور کو بھی الہ بنا لینے کا نام شرک ہے ۔ مشرکین عرب بھی اللہ کے منکر نہ تھے (خود یہ نام ان میں صدیوں سے رائج تھا) وہ اپنے خود ساختہ الہۃ (معبودوں) کو اللہ کے ہاں اپنا سفارشی سمجھتے تھے اور ان کے ذریعے اللہ کا قرب تلاش کرتے تھے ۔ مشرکین عرب کے ان اعتقادات کا ذکر خود قرآن کریم نے کئی جگہ کیا ہے ۔

ویقولون هؤلآء شفعاءُ نا عندالله . اور وہ کہتے ہیں یہ ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے ہاں (یونس:۱۸) - ما نعبدهم الا ليُقربُونآ الى الله زلفى. ہم ان کی عبادت محض اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے ہاں ہمیں بلحاظ درجہ قریب تر کر دیتے ہیں ۔(الزمر:۳)

اسی لیے قرآن کریم میں اللہ کے سوا کسی اور کو کسی طرح عبادت کرنے اور خاص کر دعا میں تو اللہ کے سوا ہی نہیں ' بلکہ اس کے ساتھ ملا کر بھی کسی اور کو پکارنے سے قطعی طور پر روک دیا گیا ہے ' کسی کو دعا میں پکارنے کا مطلب ہے اس میں ان کی کچھ نہ کچھ صفات ماننا یا اسے کسی بھی درجہ میں الٰہ مان لینا اور یہی شرک ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے چند صفات یا کسی ایک بھی صفت کو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی بھی مخلوق میں ماننا شرک ہے ' اسی طرح مخلوق کی کسی کمزوری مثلاً

Marfat.com

نیند، بھوک، تھکاوٹ، کسی سفارشی کے آگے بے بسی یا دھاندلی وغیرہ کو اللہ تعالیٰ کی صفت تسلیم کرنا یا اللہ تعالیٰ کی بعض صفات (مثلاً دیکھنا، سننا، جاننا وغیرہ) کو مخلوق کی دیسی ہی صفات پر قیاس کرنا بھی شرک ہی کی ایک صورت ہے جسے اصطلاح میں تشبیہ کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ میں کون سی صفات ضرور ماننا چاہئیں اور کون سی ہر گز نہیں ماننا چاہئیں، اس کا ایک مختصر مگر جامع بیان آیۃ الکرسی (البقرہ ۲۵۵) میں ہے۔ ہو سکے تو کسی ترجمے والے قرآن مجید میں کم از کم اس کا ترجمہ ضرور پڑھ لیں۔

قرآن کریم نے شرک کی ان تمام صورتوں کو بیان کر دیا ہے جو دنیا میں کبھی اور کسی جگہ بھی مشرکین میں رائج رہی ہیں۔ پھر ہر ایک قسم کے شرک کو دلیل کے ساتھ غلط اور باطل ثابت کیا ہے۔ اگر شرک کی ان تمام صورتوں کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو پھر شرک کو دور سے پہچاننا آسان ہو جاتا ہے۔ جس راستے پر شرک کی کوئی بھی صورت نظر آئے، یقین مانیے کہ وہ راستہ توحید کی طرف نہیں لے جا سکتا، لہٰذا ہم قرآن میں بیان کردہ شرک کی تمام صورتوں کا ایک جائزہ لیتے ہیں۔

آج تک جن چیزوں یا ہستیوں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک (حصہ دار)، الٰہ بنایا گیا ہے۔ قرآنِ کریم کی روشنی میں شرک کی ان تمام صورتوں کو تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱- ایسے بالکل فرضی اور افسانوی دیوی دیوتاؤں کی پرستش جن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں، مثلاً صحت یا دولت کی دیوی، جنگ یا امن کا دیوتا وغیرہ کی بالکل فرضی اور خیالی تصویریں یا بت بنا کر، ان کے آستانے مقرر کر کے، وہاں ان کی عبادت کرنا اس قسم کے شرک کو قرآنِ کریم نے یہ کہہ کر باطل قرار دیا ہے کہ یہ سب کچھ صرف تخیل کی پیداوار اور چند فرضی نام ہیں (یہ مضمون سورۂ یوسف: ۴، الاعراف: ۷۱ اور النجم: ۲۳ میں بیان ہوا ہے)۔

۲- بعض کائناتی قوتوں کی پرستش مثلاً سورج، چاند، ہوا، آگ، بجلی وغیرہ۔

Marfat.com

یہ چیزیں فرضی بھی نہیں بلکہ فی الواقع موجود ہیں اور ان میں انسان کو نفع یا نقصان پہنچانے کی طاقت بھی ہے۔ اس لئے بعض دفعہ انسانوں نے ان کو بھی عبادت کے لائق دیوی دیوتا سمجھ لیا۔ قرآنِ کریم میں اس قسم کے شرک کو یوں غلط ٹھہرایا گیا ہے کہ ان طاقتور چیزوں کا بھی ایک پیدا کرنے والا ہے اور وہی "اللہ" ہے۔ وہ تو ان چیزوں کا بھی اللہ ہے، نیز یہ ارادہ و اختیار سے محروم ایک مخلوق ہے، آگ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ کسی کو حرارت دے اور کسی کو نہ دے، کسی کو جلائے اور کسی کو نہ جلائے، وغیرہ۔ (اس مضمون کے لئے دیکھیے سورۃ النّحل: ۱۷، حٰم السّجدہ: ۳۷)۔

۳- اللہ کے نیک بندوں کی پرستش۔ بعض امتوں نے اپنے انبیاء اور اولیاء کی تعظیم اور احترام میں حد سے بڑھ کر انہیں "الٰہ" ہی بنا ڈالا۔ تاریخ میں اس قسم کی قدیم ترین مثال حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں ملتی ہے، جس نے اپنے کچھ نیک لوگوں (ودّ، سواع وغیرہ) کو "الٰہ" بنا کر ان کے بت بھی تراش لیے تھے۔ پھر اللہ کے ایک نبی اور رسول کو "خدا" اور "خدا کا بیٹا" بنا ڈالنے کی سب سے بڑی مثال حضرت مسیح علیہ السلام کے نام لیواؤں نے قائم کر دی۔ اس قسم کے شرک کی تردید قرآنِ کریم نے یوں کی ہے:

(ا) اوّل تو ان بزرگوں نے کبھی یہ تعلیم نہیں دی تھی کہ خود ان کو ہی الٰہ بنا لیا جائے، بلکہ وہ سب تو خود توحید کے پابند تھے اور تمام لوگوں کو بھی یہی تعلیم دیتے تھے۔

(ب) دوسرے یہ کہ ایسے نیک بندے اپنے نام لیواؤں کی اس حرکت پر خوش نہیں بلکہ سخت ناراض ہو کر آخرت میں ان کے خلاف گواہی دیں گے۔

شرک کی یہ قسم سب سے زیادہ خطرناک اور عام ہے، اس لیے کہ اسے نیک بندوں کی تعظیم و توقیر سمجھا جاتا ہے جو بذاتِ خود دین کا ایک اہم حکم ہے۔ شرک ہمیشہ محبت اور عقیدت سے پیدا ہوتا ہے، نفرت یا انکار سے نہیں۔ نیکوں کی توہین اور عداوت بھی مہلک گناہ ہے اور ان کی مشرکانہ تعظیم بھی تباہ کن جرم ہے۔ لہٰذا نہایت

Marfat.com

احتیاط اور اعتدال سے کام لینا ضروری ہے۔

شرک یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو بھی الٰہ بنا لینے کی مندرجہ بالا تینوں صورتوں کا تعلق زیادہ تر ضرورت کے وقت "الٰہ" سے دعا اور غیبی امداد حاصل کرنے سے ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید میں خود "الٰہ" بن بیٹھنے کی بھی ایک صورت بیان ہوئی ہے جس کا تعلق زیادہ تر قانون اور حکم چلانے کے اختیارات سے ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال قرآن کریم نے فرعون کی بیان کی ہے جس نے " انا ربکم الاعلیٰ" (میں ہی تمہارا سب سے اونچا رب ہوں: النّزعٰت:۲۴) اور ما علمت لکم من الٰہ غیری (میں تمہارے لیے اپنے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں مانتا : القصص :۳۸) کے دعوے کر ڈالے تھے۔ اطاعت کے لحاظ سے "خدا" بنا لینے کی دوسری مثال قرآن کریم نے یہود و نصاریٰ کی دی ہے کہ انہوں نے اپنے احبار (علمائے دین) اور رہبان (مشائخ) کو " اربابا مّن دون اللہ" (اللہ کے سوا خدا) بنا لیا تھا۔

قرآنِ کریم میں بھی بیان ہوا ہے کہ بعض لوگ تو " اتّخذ الٰھہ ھواہ" (اس نے اپنی خواہش کو ہی اپنا خدا بنا لیا تھا۔ الفرقان: ۲۰) کا نمونہ بنے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے جی کی خواہش کو بھی اپنا " الٰہ" یا "خدا" بنا لیتے ہیں ' یعنی ان پر صرف "خواہشات کی حکمرانی" ہوتی ہے۔

عقیدۂ توحید کے تقاضے

الٰہ بنا دینے اور بن بیٹھنے کی مندرجہ بالا تمام صورتوں کو ذہن میں رکھ کر ایک بار پھر " لا الٰہ الا اللہ " پڑھیے ' اس کے معانی پر غور کیجیے تو عقیدۂ توحید کا مطلب اور اس کے تقاضے کچھ یوں سامنے آتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ پر اس کی ساری صفات کے ساتھ ایمان لانا ' اللہ کی کسی بھی صفت میں کسی دوسرے کو اس کا شریک نہ ماننا ۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرنا

Marfat.com

۳- اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو صحت و مرض ' زندگی و موت اور عزت و ذلّت کے معاملہ ' بلکہ کسی بھی معاملے میں نفع اور نقصان کا مالک اور حاجت روا نہ سمجھنا اور ہمیشہ دستِ دعا صرف اللہ تعالیٰ کے آگے پھیلانا۔

۴- اللہ تعالیٰ ہی کو اپنی ساری محبت اور عقیدت کا مرکز بنانا۔

۵- کسی خود ساختہ "خدا" کی خدائی ہر گز تسلیم نہ کرنا۔ ہر فرعون کے آگے موسیٰؑ کی طرح ڈٹ جانا۔

۶- زندگی میں قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کے احکام سے ہی رہنمائی حاصل کرنا اور اللہ کی رضا اور خوشنودی کو ہر شے پر مقدم رکھنا۔ اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین سے سرتابی نہ کرنا ' صرف اسی کی ناراضگی سے ڈرنا اور اس کے لئے کسی بیرونی (مثلاً کسی ظالم کے) یا کسی اندرونی (مثلاً اپنی ہی خواہشات کے) دباؤ کے آگے نہ جھکنا۔

عقیدۂ توحید کی برکات

جب عقیدۂ توحید آدمی کے دل و دماغ میں رچ بس جاتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ :

۱- آدمی صرف ایک معبودِ حقیقی "اللہ" کے خوف کے سوا ہر قسم کے خوف اور ڈر سے نجات پا لیتا ہے۔ ہر شرک کے پیچھے ایک خوف پوشیدہ ہوتا ہے ' جب شرک نہیں رہتا تو آدمی بے خوف اور نڈر ہو جاتا ہے ۔ وہ شخص جو اس بات پر پکا ایمان رکھتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اسے نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان ' ہر خوف اور اندیشے سے بالاتر ہو جاتا ہے۔

۲- آدمی توہمات کی گندگی اور جھوٹے "خداؤں" کی گندگی سے بلند تر ہو کر انسانیت کے حقیقی شرف سے بہرہ ور ہو سکتا ہے ' ایک خدا کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے وہ جگہ جگہ ناک رگڑنے کی ذلّت سے بچ جاتا ہے اور اس میں

Marfat.com

جذبۂ حریّت پیدا ہوتا ہے۔

۳۔ ایک ہی الٰہ (اللہ) کی مخلوق اور بندے ہونے کی حیثیت سے تمام انسان برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عقیدۂ توحید سے خود بخود آدمی کے اندر بنی نوعِ انسان کی وحدت اور مساوات کا تصوّر ابھرتا ہے۔

۴۔ جہاں "سب ایک مالک کے بندے" کا عقیدہ موجود ہو وہاں ہر قسم کے طبقاتی، علاقائی اور نسلی امتیازات مٹ جاتے ہیں (اگر ان امتیازات پر بھی اصرار ہے اور توحید کا اقرار بھی، تو پھر یہ اقرارِ توحید مشکوک ہو جاتا ہے۔)

مذاہبِ عالم پر اسلام کے عقیدۂ توحید کے اثرات

مسلمانوں کے اس عقیدۂ توحید کا اثر تمام مذاہبِ عالم پر یہ پڑا ہے کہ آپ سب مذاہب، مذہب کی صداقت کا معیار اور سچائی کی دلیل، مسئلہ توحید کو سمجھنے لگے ہیں۔ بت پرست بھی اب بتوں کو صرف وسیلہ کہنے لگے ہیں اور دو تین خداؤں (ثنویت اور تثلیث) کے قائل ہیں۔ اپنے اپنے مذہب میں توحید ثابت کرنے کی فلسفیانہ کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔

توحید کا جتنا سادہ مگر جامع اور واضح تصوّر اسلام میں ہے کسی اور مذہب میں نہیں۔ عقیدۂ توحید ہی اسلام کی اساس اور بنیاد ہے۔ اس کے باقی تمام عقائد کا انحصار اور دارومدار اسی عقیدۂ توحید پر ہے، اس لئے اس موضوع پر بات ذرا طویل ہو گئی۔ آپ توحید کی اس بحث کو دو تین دفعہ پڑھیے۔ یہ نہ صرف امتحان میں بلکہ آئندہ پوری زندگی میں اور زندگی کے ہر نازک مرحلے اور مشکل موڑ پر کام آنے والی اور مایوسیوں سے نجات دلانے والی باتیں ہیں۔

☆☆☆

Marfat.com

رسالت و آخرت

رسالت

عقیدۂ رسالت یا "ایمان بالرسل" یعنی رسولوں پر ایمان لانا ' دینِ اسلام کا دوسرا بنیادی اصول ہے۔

عقیدۂ رسالت و توحید کا تعلق

بظاہر عقیدۂ رسالت کو عقیدۂ توحید سے پہلے بیان کرنا مناسب تھا ' کیوں کہ توحید اور آخرت وغیرہ چیزوں کی خبر دراصل رسولوں کے ذریعے ہی معلوم ہوئی۔ تاہم عقیدۂ توحید کو پہلے بیان کرنے کی چند وجوہات تھیں:

۱- خود انبیاء و رسل علیہم السلام نے اپنی دعوت کا آغاز ہمیشہ توحید سے کیا اور سب سے پہلے غیر اللہ (اللہ کے سوا دوسری چیزوں) کی عبادت سے روکا۔ اس لیے دین میں سب سے پہلے توحید کا سمجھنا ضروری تھا۔

۲- عقیدۂ توحید تک آدمی انبیاء سے خبر پائے بغیر بھی اپنی فطرت اور عقل کی اصل رہنمائی سے پہنچ سکتا ہے۔ اس معاملے میں انبیاء و رسل صرف "مذکر" یعنی ایک بھولی ہوئی یاد دلانے والے ہیں۔ البتہ انبیاء عقیدۂ توحید کی کچھ ایسی تفصیلات بتاتے ہیں جن کے بارے میں عقلِ انسانی ٹھوکر کھا سکتی ہے اور شرک کی تمام صورتیں اسی ٹھوکر کی مظہر ہیں۔ اس لئے بھی توحید کو پہلے بیان کرنا مناسب تھا۔

تاہم عقیدۂ رسالت کو توحید کے بعد بیان کرنے کی بھی کچھ وجوہ ہیں:

۱- توحید اور خاص طور پر اللہ تعالیٰ کی صفات کے بیان میں " اللہ کی فرماں برداری" " اللہ کے احکام" ' "اللہ کے دین" " اللہ کی عبادت" وغیرہ کا ذکر بار بار آیا

Marfat.com

ہے۔ یہ باتیں کہاں سے اور کیسے معلوم ہوں گی؟ اس لحاظ سے عقیدۂ رسالت کا ایک تقاضا اور ضرورت بھی ہے ۔ اس لیے اسے توحید کے بعد بیان کرنا ہی مناسب ہے۔

۲۔ آدمی کلمہ طیّبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ۔ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں (اور) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں کے اقرار اور اعلان سے مسلمان ہوتا ہے یہ کلمۂ شہادت پڑھ کر جو یوں ہے۔ اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ بس وہی اکیلا بغیر کسی شریک یا حصہ دار کے (معبود) ہے۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں)۔

آپ نے دیکھا ان دونوں کلموں میں نصفِ اوّل توحید اور نصفِ دوم رسالت کے مضمون پر مشتمل ہے۔ اس لئے بھی رسالت کا بیان توحید کے فوراً بعد ہی مناسب ہے۔

رسالت کے لغوی اور اصطلاحی معنی

سب سے پہلے ہم رسالت اور رسول کے لغوی معنی اور اصطلاحی معنی بیان کرتے ہیں۔

رسالۃ (جو عربی زبان میں اسی طرح لکھا جائے گا ' تاہم اردو میں لمبی ت لکھنا درست ہے) کے لفظی معنی ہیں پیغام یا MESSAGE اور "رسول" کے لفظی معنی ہیں پیغامبر "قاصد" یا MESSENGER لفظ "رسالۃ" میں پیغام بھیجنے والے (۲) پیغام (۳) پیغام لے جانے والے اور (۴) جس کی طرف پیغام ہے کا مفہوم موجود ہے۔

اپنے لفظی اور لغوی معنوں میں یہ الفاظ ہر طرح کی پیغام رسانی کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں اور عربی زبان میں شب و روز استعمال ہوتے ہیں۔

اب رسالت کے اصطلاحی معنی محض "پیغام" نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا پیغام ہے اور رسول کا مطلب صرف پیغامبر نہیں بلکہ " اللہ کا پیغام لانے والا" ہے۔ "خدا" کی طرح

Marfat.com

"رسول" کے لیے بھی فارسی کی اصطلاح "پیغمبر" یا "پیمبر" (اور اس طرح لکھ کر اسے عام پیغامبر یا "پیام بر") سے ممتاز کر دیا جاتا ہے رسالت کے لئے پیغمبری اور رسول اللہ کی بجائے "پیغمبرِ خدا" اردو میں بھی عام مستعمل ہے ' تا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہنا بہتر اور زیادہ اسلامی طریقہ ہے۔

اب صرف رسول کے معنی بھی "رسول اللہ" ہی کے ہوں گے۔ خصوصاً جہاں "الرسول" لکھا ہو وہاں تو رسول اللہ ہی مراد ہوں گے۔ (ال) سے THE کی طرح معنی کا تعین معرفہ کے لئے ہوتا ہے۔

عقیدۂ رسالت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی ہدایت (مسائل زندگی میں درست راہنمائی) کی خاطر دوسرے انسانوں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لئے ان ہی میں سے بعض کو چن لیا کرتا تھا۔ یہ برگزیدہ انسان اللہ کے رسول کہلاتے تھے اور وہ اللہ کے پیغامِ ہدایت کو بندوں تک پہنچاتے تھے۔

نبوّت اور رسالت کی ضرورت

یہاں ایک سوال آپ کے ذہن میں ابھر رہا ہو گا کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عقل جیسی نعمت دے دی ہے جس کا ایک کرشمہ وہ حیرت انگیز ترقی ہے جو انسان نے گزشتہ پانچ ہزار سال سے اب تک کی ہے ' تو کیا یہ عقل ہی ہر قسم کی رہنمائی کے لئے کافی نہیں ہے؟ عقل بھی تو ہدایت ربانی ہی کی ایک صورت ہے۔ اس کے بعد نبوت یا رسالت کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے؟ تو سنیے! اگر ہم کائنات میں غوروفکر کریں تو یقیناً ہمیں ہر جگہ اور ہر چیز میں "خدائی رہنمائی" کے آثار اور مظاہر نظر آتے ہیں ' مگر اس کے درجے اور صورتیں مختلف ہیں۔ اب ذرا ہر چیز کے اندر اسی "ربانی رہنمائی" کے چند نظارے اور نمونے دیکھیے ذرّوں کے اندر ان کے اجزاء کو اور کائنات میں سیاروں کو کس نے ایک مقررہ راہ پر لگا دیا ہے؟ نباتات کی جڑوں اور پتوں کو کس نے اپنا اپنا کام "سمجھا" دیا ہے؟ حیوانات میں رہنمائی کا ایک اور ذریعہ جبلت

Marfat.com

(INSTINCT) کہاں سے آگیا؟ شہد کی مکھی کو پھولوں سے رس لانا ' عجیب و غریب چھتے بنانا اور شہد تیار کرنے کی تعلیم کسی نے دی؟ بعض پرندے اسی جبلّت کی رہنمائی سے کس طرح موسم کے تغیرات کو بھانپتے اور ہزار ہا میل تک نقل مکانی کرتے ہیں جبلّت سے اوپر رہنمائی کا درجہ یا ذریعہ عقل (INTELLEGENCE) ہے۔ اس کے کچھ مظاہر بعض حیوانات میں بھی نظر آتے ہیں مگر اس کی بہتر اور ترقی یافتہ صورت انسان کو عطا ہوئی ہے' جو عقلی استدلال (REASONING) سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ پھر انسانوں میں عقل سے بھی ذرا اونچا ذریعہ ہدایت وجدان (INTUITION) جو بہت کم اور خاص خاص لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ وجدان عقلی استدلال کے بغیر براہِ راست کسی معاملے میں حقیقت کو پا جانے (DIRECT PERCEPTION) کا نام ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ رہنمائی کے یہ تمام ذرائع بعض دفعہ ایک ہی مسئلے میں مختلف نتائج تک پہنچاتے ہیں۔ یہ اختلاف ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ عقل اور وجدان سے بھی بالاتر ایک ایسے ذریعہ علم و ہدایت کی ضرورت ہے جس کے بعد کسی شک یا اختلاف کی گنجائش نہ رہے۔ یہی ذریعہ نبوّت یا رسالت ہے۔

عقیدۂ رسالت کا مطلب - بنیادی نکات

اب ہم کتاب و سنت کی روشنی میں ایمان بالرسل یا عقیدۂ رسالت سے متعلق تمام ضروری باتیں بالترتیب بیان کرتے ہیں:

پہلی بات تو یہ ہے کہ رسالت پر ایمان لانا واجب ہے یعنی اس بات پر بھی کہ رسالت برحق ہے اور اللہ رسول بھیجا کرتا ہے اور اس بات پر بھی کہ فلاں فلاں بزرگ اللہ کے بھیجے ہوئے نبی اور رسول ہیں۔ ہر نبی اور رسول نے دعوتِ توحید کے ساتھ اپنے "رسول" ہونے پر زور دیا اور رسول پر ایمان لانے کا مطلب ہے" اس کے تمام دعوؤں ' وعدوں اور تعلیمات کی دل سے تصدیق کرنا اور زبان سے اس بات کا اقرار بھی کرنا" یہ تمام توجہ طلب ہے۔ اگر رسول کی کسی ایک بات کو بھی سچ نہ مانا تو یہ

Marfat.com

تکذیب ہی کی ایک صورت رہی۔

ہر نبی یا رسول کے ماننے والے اپنے زمانے کے مسلمان اور تکذیب و انکار کرنے والے ہی اس زمانے کے کافر ہوتے تھے۔ یعنی نبی یا رسول کے لئے نبوت اور رسالت کا دعویٰ کرنا ضروری ہے اور یہ دعویٰ کوئی معمولی دعویٰ نہیں ہوتا۔ اس کے تسلیم کرنے سے ایک نئی امت وجود میں آتی ہے۔ نبوت یا رسالت کے دعویٰ کے بعد اسے ماننے یا نہ ماننے میں کوئی "غیر جانبدار" نہیں رہ سکتا۔ اسلام یا کفر کے دو راستوں کے سوا تیسرا کوئی راستہ ہی نہیں ہوتا۔

تمام انبیاء اور رسولوں کو اللہ کی طرف سے پیغام ایک خاص غیر مرئی ' غیر حسی مخلوق کے ذریعے پہنچتا تھا ' جنہیں ملک یا فرشتہ کہتے ہیں۔ اس خدمت پر مامور خاص فرشتے کا نام قرآن و سنت میں "جبریل" آیا ہے۔ اس طریقۂ پیغام رسانی کو "وحی" کہتے ہیں۔ ملائک (فرشتوں) پر ایمان لانا بھی مسلمان کے لئے لازمی ہے۔ ہم فرشتوں کی حقیقت سے آگاہ نہیں کیوں کہ یہ بھی ان حواس سے پوشیدہ اور غیر مادی نظام (غیب) کا ایک حصہ ہیں' جس پر ایمان لائے بغیر آدمی مادہ پرستی کے جال سے نہیں نکل سکتا۔ فرشتوں کے متعلق جو باتیں قرآن و سنت میں آئی ہیں ہم ان کو سچ سمجھتے ہیں ' بس یہی کافی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بعض رسولوں کو بندوں کی ہدایت کے لئے کتابیں بھی دیں۔ قرآنِ کریم میں حضرت موسیٰؑ کو تورات ' حضرت عیسیٰؑ کو انجیل اور حضرت داؤدؑ کو زبور کا دیا جانا بیان ہوا ہے اس کے علاوہ صحف ابراہیمؑ (حضرت ابراہیمؑ کے کتابچوں) کا ذکر بھی ہے۔

ان کتابوں میں اللہ کا کلام اور پیغام ہوتا تھا اور زندگی کے معاملات میں ہر قسم کی ضروری رہنمائی بہم پہنچائی جاتی تھی ' مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان انبیاء کی امتوں نے اپنی کتابوں میں تحریف کر ڈالی ۔ اب وہ کتابیں صرف کلامِ الٰہی باقی نہیں رہیں بلکہ کچھ کلامِ الٰہی اور کچھ اضافی ملی جلی باتیں ہیں۔ اللہ کی آخری کتاب "قرآنِ

Marfat.com

مجید" ہے جو اللہ کا کلام ہے اور یہ واحد آسمانی کتاب ہے جو آج تک اپنی اصلی حالت میں محفوظ و موجود ہے۔

ختمِ نبوّت - آخری رسالت اور اس کے خصائص

ہمارے آقا و مولیٰ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلۂ انبیاء کی آخری کڑی ہیں۔ آپؐ اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں۔ آنؐ نے ہی یہ دعویٰ اور اعلان کیا کہ اب آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا (۱)۔ آپؐ سے پہلے سب انبیاءؑ اپنی امتوں کو ایک آنے والے عظیم نبی (۲) کی بشارت دیتے رہے۔ آپؐ نے کسی آنے والے کی بشارت دینے کی بجائے آئندہ نبوّت کا دعویٰ کرنے والے کو "کذّاب" (سب سے بڑا جھوٹا) کہا۔ آپؐ کا نبوت ختم ہونے کا اعلام انسانیت پر ایک بڑا احسان ہے۔ اب کوئی کسی ماوراء الحواس ہستی یا ذریعے کے حوالے سے اپنی بات یا شخصیت کو لوگوں پر نہیں تھوپ سکتا۔ اب ہر ایک کو عقل کی مدد سے آخری وحی الٰہی کی روشنی میں چلنا ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دین مکمل ہو گیا' وہی دینِ اسلام جو حضرت آدمؑ سے لے کر آنحضورؐ سے پہلے تک تمام انبیاء اور رسول پیش کرتے رہے۔ اب وہ اپنی آخری شکل میں آپؐ کے ذریعے انسانوں کو دیا گیا۔ دینِ اسلام کی تعلیمات آپ پر قرآن کریم کی صورت میں نازل ہوتی رہیں۔ آپؐ نے اس کتاب کو بحکم الٰہی نظامِ حفظ و کتابت کے ذریعے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایسا محفوظ کر دیا کہ اس کے کسی ایک

۱- آپؐ کے بعد کسی اور کو نبی ماننا گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دعویٰ کو جھٹلانا ہے۔ اس لئے صریح کفر ہے۔ آخری نبیؐ ہی سب انبیاء سے افضل ہے کیونکہ انؐ پر ایمان لائے بغیر سابقہ انبیاء پر ایمان لانا بے کار ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو نبی ماننا اس کو آپؐ سے افضل ماننا ہے۔ اور یہ بھی کفر ہے۔

۲- جس سے مراد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے۔ آپؐ ہی "دعائے خلیل" اور "نوید مسیحا" تھے اور انبیاء کی بشارتوں کا مصداق۔

Marfat.com

لفظ بلکہ حرف کے طریقِ املاء و تلفظ تک میں ذرا بھر تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور اس کتاب کی حفاظت کا یہ انتظام اور نظامِ "خطانا آشنا" (FOOL PROOF) ہے۔ کہ آئندہ بھی کوئی تبدیلی ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ قرآن کریم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے معنوں کی بھی یوں حفاظت کی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنِ کریم کے ایک ایک حکم پر مکمل عمل کر کے اور پورا دینِ اسلام برپا کر کے دنیا کو دکھادیا۔ قرآنِ کریم کے معنی اور مطلب کی اس عملی تعبیر اور تفسیر کا مکمل ریکارڈ سنّت کی صورت میں موجود ہے۔ سیرت اور حدیث کی ساری کتابیں اسی "سنتِ رسول" کا بیان ہیں۔ دین کے مکمل ہو جانے اور دین کی اصل تعلیمات کے تحریف سے محفوظ ہو جانے میں بھی اسی بات کا اشارہ ہے کہ اب نبوّت ختم ہو گئی۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیاء صرف اپنے اپنے ملک یا قوم کے لئے مبعوث کئے جاتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سارے انسانوں اور پوری دنیا کے لئے اللہ کے رسول ہیں۔ آپؐ کا دین ہمہ گیر بھی ہے اور عالمگیر بھی۔ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے "اسوۂ حسنہ" مقرر کیا تو آپؐ کی پوری سیرت بھی محفوظ کر دی۔ کوئی شعبۂ زندگی ایسا نہیں جس کے بارے میں آپ کی دی ہوئی تعلیمات میں رہنمائی موجود نہ ہو۔ آپؐ کی زندگی اتنی متنوع اور جامع تھی کہ حکومت اور سیاست ' تجارت اور معاشرت ' زہد اور عبادت فصاحت اور خطابت ' قانون اور عدالت اور انقلابی اور حربی قیادت بلکہ تعلیم و تربیت تک ہی نہیں بلکہ ہر جگہ آپؐ ایک اسوۂ حسنہ یا کامل نمونہ نظر آتے ہیں۔ مسلمان فخر سے سر اٹھا کر کہہ سکتا ہے کہ اسے زندگی کے کسی بھی مسئلے میں راہنمائی کے لئے کسی بھی "ازم" کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ ہمارا ہادی ' ہمارا آقا ' محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہر معاملے میں رہنما ' صرف زبانی ہی نہیں بلکہ اپنے عملی نمونے کے ساتھ رہنما ہے۔ آپؐ کی رہنمائی کے مطابق چلنے میں فلاح اور آپؐ کی رہنمائی سے انحراف ہلاکت کی راہ ہے۔

Marfat.com

حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم (مسلمانوں) پر حقوق

مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے تعلق کی صحیح نوعیت معلوم ہونی چاہیے۔ کہنے کو تو اور بھی کئی امتیں اپنے انبیاء کی نام لیوا ہیں، مگر حالت یہ ہے کہ توحید جیسی بنیادی چیز کو ترک کر کے آخرت کو بالکل بھول چکی ہیں۔ قرآن و سنت میں ہمیں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کو سمجھنے اور اسے ہمیشہ درست رکھنے کے بارے میں واضح ہدایات موجود ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱- حضورؐ پر ایمان لانا آپؐ کے تمام دعوؤں اور تعلیمات کی سچائی پر یقین اور اس کا اعلان کرنا۔

۲- آپؐ کی فرمانبرداری اور اطاعت کرنا، آپؐ کا ہر حکم بجا لانا اور آپؐ کا ہر فیصلہ شرحِ صدر کے ساتھ قبول کرنا اور آپؐ کے نمونے کو اپنانے میں فخر محسوس کرنا۔

۳- آنحضورؐ سے بے پناہ محبت کرنا۔ اپنے تمام مفادات اور اپنی تمام خواہشات کو حضورؐ کے احکام کے تابع کر دینے کو اس محبت کا مظہر اور معیار بنانا۔

۴- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے زیادہ ادب اور احترام کرنا اور آپؐ کی عظمت اور جلال کے احساس سے ہمیشہ تواضع اور انکسار سے رہنا۔ آپؐ کی ادنیٰ سی نافرمانی اور خلاف ورزی سے بھی ہر وقت بچتے رہنا۔

۵- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت یعنی تمام مسلمانوں کی خیر خواہی کرنا اور ان کے مسائل اور مصائب میں اضافے کا سبب نہ بننا۔

۶- حضورؐ کے پیغام کو اپنے قول اور عمل سے آگے پھیلانا۔ تبلیغ دین سے غافل یا بے تعلق نہ رہنا۔

Marfat.com

آخرت

عقیدۂ آخرت کی اہمیّت

ایمان بالیوم الآخر (آخری دن پر ایمان) یا عقیدۂ آخرت اسلام کا تیسرا بنیادی اصول یا عقیدہ ہے۔ اس عقیدے کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے حسبِ ذیل امور پر غور کیجیے:

۱- قرآن میں آخرت کا بیان اتنی جگہ اور اتنی آیات میں ہوا ہے کہ مجموعی طور پر یہ توحید و رسالت کے بیان سے بھی زیادہ بنتا ہے۔

۲- قرآنِ کریم میں چوبیس (۲۴) مقامات پر ایمان کا ذکر صرف "اللہ" اور آخرت پر ایمان کہہ کر کیا گیا ہے۔(حالانکہ ایمان کے اصول میں اللہ کے رسولوں بلکہ اس کے فرشتوں اور کتابوں پر ایمان لانا بھی شامل ہے) اس سے صرف عقیدۂ توحید کے ساتھ عقیدۂ آخرت کا تعلق اور اس کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

۳- قرآنِ کریم میں آخرت کا ذکر "الیوم الآخر" کہ کر ۲۴ جگہ آیا ہے۔ اور لفظ "الآخرۃ" ۱۱۲ جگہ پر آیا ہے۔ اس کے علاوہ "یوم البعث" (جی اٹھنے کا دن)، یوم الحسرۃ (حسرت کا دن)، یوم الحساب (حساب کا دن)، یوم الفصل (قطعی فیصلہ کا دن) یوم الخروج (نکلنے کا دن) یوم القیامۃ (کھڑے ہونے کا دن)، یوم الحق (برحق دن) وغیرہ کوئی بیس کے قریب ناموں سے اس کا ذکر آیا ہے۔ یوم۔۔۔(جس دن کہ) یا یومئذ۔۔۔(آج کے دن) سے شروع ہونے والی دو سو کے قریب آیات میں آخرت کا بیان موجود ہے۔

۴- قرآن کریم میں تقابل پر زور دینے کے لئے بیس سے زائد مقامات پر "دنیا اور

Marfat.com

آخرت" کا یک جا ذکر ہوا ہے(۱)۔ اس کے علاوہ عقیدۂ آخرت کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرنے کے لئے ثواب الآخرۃ (آخرت کا ثواب)، اجر الآخرۃ (آخرت کا اجر) دار الآخرۃ (آخرت کا گھر)، عذاب الآخرۃ (آخرت کی سزا) حرث الآخرۃ (آخرت کی کھیتی) اور نکال الآخرۃ (آخرت کی ذلّت) وغیرہ تراکیب کا استعمال بکثرت کیا گیا ہے۔

۵۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو دنیا کے تمام مذاہب میں کسی نہ کسی شکل میں پایا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ آخرت کا خیال فطری طور پر ہر شخص کے اندر گاڑ دیا گیا ہے۔ جب سے انسان اس دنیا میں بسنے لگا ہے، یا کم از کم جب سے اس کی تاریخ کسی طرح سے بھی معلوم ہوئی ہے، "خدا" اور "آخرت" کا عقیدہ یا ان کا کچھ نہ کچھ تصور انسانوں میں موجود رہا ہے۔

۶۔ قرآنِ کریم میں جن انبیاءؑ کے حالات بیان ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نبی نے توحید، رسالت اور آخرت کے عقیدے کو ہمیشہ اپنی دعوت کا نقطۂ آغاز قرار دیا۔

۷۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ "عقیدۂ آخرت" اسلام کا اساسی عقیدہ ہے۔ توحید اور رسالت کی طرح اس کے بارے میں بھی کسی شک و شبہ میں مبتلا رہنا اسلام اور ایمان کے یکسر منافی ہے۔ اس لئے ان تمام عقائد کو عقلی دلائل سے سمجھ کر علی وجہ البصیرت اختیار کیجیے۔ قرآنِ کریم نے خود یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔

۱۔ ہمارے ہاں عموماً "دین اور دنیا" ایک دوسرے کے مقابل تصور کئے جاتے ہیں۔ قرآن و سنّت کے مطابق اصل مقابلہ دین اور دنیا میں نہیں بلکہ "دنیا اور آخرت" میں ہے۔ مسلمان کو دنیا چھوڑ دینے کا حکم نہیں ہے۔ البتہ جہاں دنیا اور آخرت کے فائدے میں سے ایک کو چھوڑنا ضروری ہو جائے تو مسلمان وہ ہے جو دنیا کے مقابلے میں آخرت کے فائدے کو ترجیح دے۔

Marfat.com

آخرت کے لغوی اور اصطلاحی معنی

آگے چلنے سے پہلے ہم " آخرۃ" کے لفظی اور اصطلاحی معنی بیان کرتے ہیں۔ عربی میں "آخر" کا معنی ہوتا ہے "آخری" سب سے پیچھے، کسی لمبائی مثلاً رسی یا فاصلے وغیرہ کا دوسرا سرا (آخر کی ضد یا مقابل کا لفظ "اوّل" ہے جو اردو میں بھی مستعمل ہے) انگریزی میں اس کا ترجمہ Last یا Letter end, end سے کر سکتے ہیں۔ لفظ "آخرۃ" اسی "آخر" کا مؤنث ہے۔ قرآنِ کریم میں چونکہ یہ لفظ "اَلدّار" (گھر) کے ساتھ بطورِ صفت کے استعمال ہوا ہے۔ اور دار کا لفظ عربی میں مؤنث ہے۔ (جیسے اردو میں مکان کہیں تو مذکر اور کوٹھی کہیں تو مؤنث ہو گا اس لئے صفت بھی مؤنث "آخرۃ" استعمال ہوئی ہے اور یوں" الدار الآخرۃ" کا معنی بنا "آخری گھر" کثرت استعمال سے "دار" کا لفظ ساتھ استعمال نہ ہونے پر صرف لفظ "الآخرۃ" کے معنی بھی وہی " آخری گھر" ہی ہوں گے۔"یوم" (دن) کا لفظ چونکہ عربی میں بھی (اردو کی طرح) مذکر ہے اس لئے اس کے ساتھ ترکیب توصیفی میں "آخر" بھی مذکر استعمال ہوتا ہے اور یوں آخرت کے معنوں میں دوسرا لفظ "الیوم الآخر" بنتا ہے، جس کے معنی ہیں "آخری دن"۔

اب آیئے اصطلاحی معنوں کی طرف ۔ کون سا آخری گھر؟ کون سا آخری دن؟ "آخرۃ" (جسے اردو میں آخرت لکھنا درست ہے) کے اصطلاحی معنی یوں بنتے ہیں کہ "مرنے کے بعد دوسری زندگی اور اس میں ملنے والا ٹھکانا"۔ اور " ایمان بالیوم الآخر" یا عقیدۂ آخرت کا مطلب ہوا کہ " اس بات کا اعتقاد کہ مرنے کے بعد دوبارہ ایک زندگی ملے گی"۔ قرآنِ مجید میں اس آخری یا دوسری زندگی کے لئے ایک لفظ "معاد" بھی استعمال ہوا ہے اور اس کے معنی ہیں لوٹنے کا وقت یا جگہ اور اصطلاحی معنی وہی ہیں جو "آخرت" کے ہیں، مگر یہ لفظ اردو میں بہت کم استعمال ہوتا ہے۔

اگر بات صرف دوبارہ زندگی کی ہوتی تو اس میں گھبرانے کی کیا ضرورت، اس سے تو بظاہر مسرت ہونی چاہیے کہ ہم دوبارہ زندہ ہوں گے لیکن مسئلہ صرف دوبارہ

Marfat.com

زندگی پانے کا نہیں۔ اس کے ساتھ کچھ اور امور بھی وابستہ ہیں۔

عقیدۂ آخرت کا مطلب - چھ بنیادی نکات

اب ذرا قرآنِ حکیم اور سنتِ رسول کی روشنی میں عقیدۂ آخرت کی کچھ تفصیل سنیے۔ یہ مضمون قرآنِ کریم کی سینکڑوں آیات کا خلاصہ ہے۔ انفرادی طور پر تو ہر انسان کی موت ایک قطعی اور یقینی امر ہے جس سے دنیا کا کوئی آدمی انکار نہیں کر سکتا۔ قرآنِ کریم میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ایک دن یہ پورا کرۂ ارض تباہ ہو جائے گا اور سب کے سب انسان مر جائیں گے۔ قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے انبیاء بھی یہی تعلیم دیتے رہے۔ اس تباہی کے وقت کو قرآنِ کریم میں چالیس مقامات پر "الساعۃ" (مقررہ گھڑی یا وقت) کہا گیا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر اس کے لیے لفظ قیامت بولا جاتا ہے اور اب یہ الساعۃ کے معنی ہی رکھتا ہے۔ تاہم قرآنِ کریم میں "یوم القیامۃ" مرنے والے دن کے لئے نہیں بلکہ دوبارہ جی اٹھنے کے دن کے لئے آیا ہے) اس کی بڑی خوفناک کیفیت بیان ہوئی ہے۔

کفار ہمیشہ رسولوں کی اس بات کو ناممکن کہہ کر اس کا مذاق اڑاتے۔ ان کے دانشور کہتے تھے کہ دنیا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ طوفان' زلزلہ' سیلاب' جنگ' وباء وغیرہ میں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں انسان ضرور مر سکتے ہیں' مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دنیا میں ایک بھی انسان زندہ نہ رہے۔ انبیاءؑ صدیوں تک یہ بات دہراتے رہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو پہلے نبی سے ہزاروں سال بعد آخر میں تشریف لائے انہوں نے بھی یہ بات فرمائی' بلکہ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اب وہ وقت دور بھی نہیں ہے۔ اس کو بھی چودہ سو برس گذر چکے۔ اب ایٹمی جنگ کا خطرہ اور اس کی وہی تباہ کاریاں جن کا ذکر انبیاءؑ نے اور قرآنِ کریم نے کیا' اب وہ سر پر منڈلا رہی ہیں۔ اب پوری دنیا کا تباہ ہو جانا ممکن ہی نہیں بلکہ ناگزیر اور اغلب (PROBABLE) نظر آرہا ہے۔ وصدق المرسلون اور رسولوں نے تو بالکل سچ کہا (یٰسین :۵۲)۔

Marfat.com

موت انفرادی ہو یا اجتماعی ' یہ زندگی کا انجام نہیں ہے ' بلکہ ایک اور زندگی کا آغاز ہے۔ ہر انسان مرتے ہی ایک طرح کی " عبوری نئی زندگی" شروع کرتا ہے ' جسے قرآنِ کریم نے "برزخ" کہا ہے۔ جب اجتماعی ہلاکت واقع ہو چکے گی تو اس کے بعد دوبارہ سب کے سب انسانوں کو زندہ کیا جائیگا۔ اب ایک ایک فرد سے اکیلے اکیلے اس پہلی (دنیا کی) زندگی میں کیئے گئے اعمال کا پورا پورا حساب لیا جائے گا۔ انسان کی کوئی نیکی یا بدی چھپی نہیں رہ جائے گی۔ قرآنِ کریم نے اس یوم الحساب کی جو تفصیلات بیان کی ہیں ' وہ لرزانے والی ہیں۔ اس دن دھن ' دھونس ' دھاندلی بروں کے کچھ کام نہیں آسکے گی ' نہ سفارش نہ بہانہ ' معافی کا وقت بھی گزر چکا ہو گا۔ اس کے ساتھ اس دنیا میں بظاہر ضائع جانے والی نیکیوں کے مسرّت افزاء نتائج نیکوں کے سامنے آئیں گے۔ قرآنِ کریم کی صرف دو آیات اس حساب کتاب کی کیفیت سمجھانے کے لئے کافی ہیں۔ فرمایا:

فمن یعمل مثقال ذرة خیرا یره ۔ ومن یعمل مثقال ذرة شرا یره ۔

(الزّلزال : ٧ ' ٨)

تو جو ایک ذرّہ بھر بھلائی کرے گا' اسے دیکھ لیگا اور جو ایک ذرّہ بھر برائی کرے گا ۔ اسے دیکھ لے گا۔

اس حساب کتاب کے نتیجے میں مجموعی طور پر نیک و بد اور اچھے اور برے انسان الگ الگ کر دیے جائیں گے۔ دونوں قسم کے انسانوں کو اب ایک ابدی زندگی دی جائے گی۔ جس میں موت نہیں آئے گی مگر زیادہ نیکی کرنے والوں کو نعمتوں سے نوازا جائے گا ' جب کہ زیادہ برائی کرنے والے بدترین سزا پائیں گے۔ اس انعام اور اس سزا کا ذکر قرآنِ کریم نے "جنة" (بہشت) اور جہنم (دوزخ) کہہ کر کیا ہے۔ آخرت کے اس حساب کتاب میں ۔ اللہ کی عدالت میں ۔ کون سے قانون کے مطابق پرکھ کی جائے گی؟ نیکی و بدی کا معیار کیا ہو گا؟ گواہ کہاں سے لائے جائیں گے؟ ہر آدمی کے اعمال کا ریکارڈ کہاں سے لیا جائیگا؟ یہ سب کچھ اس دین اور قانون کے مطابق ہو گا جس کی خبر

Marfat.com

اس زندگی میں رسولوں کے ذریعے دے دی گئی تھی۔ اسی لئے اس دن کا نام بھی قرآن میں ”یوم الدین“ آیا ہے، یعنی جزاء سزا کا دن یا ”دین“ کے نتائج کے ظہور کا دن۔ اس دن توحید، رسالت اور آخرت پر ایمان یا ان کے انکار کے اچھے برے نتائج سامنے آ جائیں گے۔ اس دن انبیاء کی تبشیر (خوشخبری دینے) اور انذار (ڈرانے) کی ایک ایک بات درست ثابت ہو گی۔ تمام انبیاء کی عظمت اور ان کی تعلیمات کی صداقت اس دن روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گی۔ ہمارے آقا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دن اپنے بلند ترین مرتبے ”مقام محمود“ پر جلوہ گر ہوں گے۔

قرآنِ کریم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موت کے بعد اس آنے والی زندگی میں شعور کا تسلسل (CONTINUITY OF CONSCIOUSNESS) جاری رہے گا، یعنی تمام اچھے یا برے لوگ اپنے اس دنیاوی زندگی میں کیئے گئے کاموں اور کہی گئی باتوں کو یاد کریں گے، انہیں علم ہو گا اور بتا دیا جائے گا کہ انعام کس لئے مل رہا ہے۔ اور سزا کس لئے؟

عقیدۂ آخرت کا عقلی ثبوت

یہ تو تھا عقیدۂ آخرت یعنی موت کے بعد کی زندگی کا مختصر حال، جس طرح قرآنِ کریم نے بیان کیا ہے۔ اب ذرا دوسرے پہلو پر غور کیجیے۔ ان تمام باتوں کے واقع ہونے پر یقین کرنا یا ایمان لانا واقعی آسان کام نہیں ہے۔ عقل کوتاہ بین کو یہ ساری باتیں ناممکن اور بے بنیاد نظر آتی ہیں۔ پہلے انبیاء کے مخاطب بھی اور کفارِ مکہ اور مشرکین عرب بھی مرنے کے بعد دوبارہ کسی زندگی کے تصور کو ”دماغ کا خلل“ سمجھتے تھے۔ وہ سب سے زیادہ اسی ”عقیدۂ آخرت“ اور ”حیات بعد الموت“ کو جھٹلاتے اور اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ آج بھی بہت سے لوگ آخرت کے صریح منکر یا کم از کم اس کے بارے میں شک و شبے میں مبتلا ہیں۔ آیئے دیکھیں قرآنِ کریم نے انکار آخرت کے ”دلائل“ کو کس طرح معقول جوابات سے رد کیا ہے اور اس ”آخرت“ کے ثبوت میں

Marfat.com

کیسے دل میں اتر جانے والے دلائل پیش کیے ہیں۔

کفارِ مکہ کا پہلا اعتراض بڑا "سائیٹفک" قسم کا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ جب انسان کی ہڈیاں بھی گل سڑ گئیں تو وہ زندہ کیسے کیا جائیگا انہیں اپنے اس استدلال پر بڑا ناز بھی تھا۔ اسے وہ مکہ کی ہر مجلس میں دہراتے پھرتے تھے۔ یہ تو ایک سائنسی حقیقت ہے کہ انسان جن عناصر کا مجموعہ ہے کم از کم جسم کی حد تک (روح کا معاملہ تو سائنس کی حد سے باہر ہے) ان سب کا علم ہے باہم تناسب اور توازن تک کا۔ مگر مرنے کے بعد یہ سب عناصر منتشر ہو جاتے ہیں۔ ان سب کا دوبارہ ' ایک جگہ ' اسی ترکیب اور تناسب سے جمع ہونا ممکن ہی نہیں۔ لہٰذا موت کے بعد زندگی ہی ثابت نہیں ہو سکتی تو آخرت کی باقی باتیں خودبخود غلط ثابت ہو جاتی ہیں۔ اس کا جواب قرآنِ کریم نے بار بار یہ دیا ہے کہ تم اپنی پہلی زندگی پر غور کرو۔ تمہارے اس فانی جسم کے عناصر کس کس طریقے سے کہاں کہاں سے جمع کر کے تمہیں یہ زندگی دی گئی۔ کائنات میں دیکھتے نہیں کس طرح بے جان (INORGANIC) عناصر سے زندگی (LIVING ORGANIZM) پھوٹتی ہے۔ نباتات ' حیوانات اور خود انسان کے مراحل تخلیق اور تولد و تناسل پر غور کرو۔ وہ زبردست طاقت ' جو علیم و حکیم اور عزیز و قدیر اس کرۂ ارض پر حیات کے یہ عجائبات دکھا سکتا ہے اس کے لئے تمہیں دوبارہ زندگی دینا کیسے ممکن نہیں؟ زمین سے نکلنے والی کن کن خوراکوں کے ذریعے تمہاری تولید کا سامان تمہارے والدین کے جسم میں لا جمع کیا۔ پھر رحم مادر سے جس زندگی کا آغاز ہوا ' اس کے مراحل پر غور کرو۔ تم جب ماں کے پیٹ میں تھے ' تو کیا اپنی بیس سال کی عمر کے تجربات کا کوئی تصور کر سکتے تھے؟ حالانکہ ان بیس برسوں میں تو تمہاری جسمانی زندگی کا تسلسل بھی موجود رہا ہے' پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں ؟

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان اس کرۂ ارض پر رہنے والی تمام مخلوقات سے افضل اور بہتر ہے۔ یہ صاحب عقل و ارادہ مخلوق ہے۔ اس کے اندر حیرت انگیز جسمانی' ذہنی اور روحانی صلاحیتیں موجود ہیں۔ اگر نظریۂ ارتقاء کو مان لیا جائے تب بھی یہ زندگی

Marfat.com

کی سب سے زیادہ "ارتقاء یافتہ" صورت ہے۔ تو کیا اس کا موت کے ذریعے بالکل ضائع ہو جانا عقلاً قابلِ قبول ہے؟ کیا یہ سارا ارتقاء اور انسان کی ساری استعداد ایک "فعل عبث" ہے؟

افحسبتم انما خلقنکم عبثا و انکم الینا لا ترجعون (المؤمنون — ۱۱۵)

کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم نے تمہیں یونہی بیکار پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے؟

کائنات کی ہر چیز کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے کوئی چیز بیکار نہیں اور غور کیجئے انسان کو کائنات کی ہر شے کی ضرورت ہے مگر انسان کی ضرورت کس کو ہے؟ ہر چیز انسان کے بغیر رہ سکتی ہے۔ مگر انسان، زمین، ہوا اور پانی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تو کیا یہ عقل کی بات ہے کہ یہ مخلوق (انسان) جس کے لئے گویا سب کچھ بنایا گیا ہے، یہ خود بے کار محض ہو؟ انسانی ذہن اسے قبول نہیں کر سکتا۔ عقل ہی کہتی ہے کہ حضرت انسان کے لئے یقیناً

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

انسان کے اندر نیکی و بدی یا اچھائی، برائی کا ایک فطری تصور موجود ہے۔ اجتماعی عقل انسانی یعنی تمام قوموں اور ملکوں کے لوگ بعض کاموں کے برا ہونے اور بعض کاموں کے اچھا ہونے پر متفق ہیں۔ اسی بنیاد پر مختلف قوموں میں جرم و سزا اور قانون و انصاف کے پیمانے بنائے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہم یہ اکثر دیکھتے ہیں کہ بعض انسان ساری دنیا کی رائے میں برے کام کرتے ہیں، مگر پوری زندگی میں وہ کسی طرح قانون و انصاف کی گرفت میں نہیں آتے، مر کر یہ بھی خاک ہو گئے۔ دوسری طرف کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو زندگی بھر وہ تمام اچھے کام کرتے ہیں جنہیں ساری دنیا اچھے کام کہتی ہے مگر پوری زندگی میں کوئی انہیں داد نہیں دیتا۔ نہ وہ کوئی انعام پاتے ہیں نہ شہرت، اپنی نیکی کا انہیں کوئی دنیوی فائدہ نہیں پہنچتا۔ یہ بھی مر کر خاک ہو جاتے ہیں۔ دونوں برابر ہو گئے، وہ بھی خاک یہ بھی خاک۔ پاک اور ناپاک کا ایک ہی انجام!

Marfat.com

عقل اسے کیسے تسلیم کرے ؟ انسانی ضمیر اور فطرت کا تقاضا ہے کہ کوئی ایسا نظامِ انصاف ہونا چاہیے ' جہاں نیکی اور بدی کو پرکھ کر آخری اور مکمل نتائج سامنے لائے جائیں۔ یہی ہے عقیدۂ آخرت کا فطری تقاضا اور عقلی ثبوت ۔ قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

أم نجعل الّذين آمنوا وعملوا الصّلحٰت كالمفسدين فى الأرض۔ أم نجعل المتّقين كالفجّار (ص:۲۸)۔ کیا ہم ایمان لانے اور اچھے کام کرنے والوں کو ان جیسا کر دیں جو زمین میں بگاڑ پھیلاتے ہیں۔ یا ہم پرہیزگاروں کو نافرمان شریروں کے برابر کر دیں؟

کفار کو ' منکرین آخرت کو موت کے بعد زندگی اور جزا و سزا پر تعجب تھا۔ قرآنِ کریم نے ' فطرتِ انسانی نے ' انبیاءؑ اور رسولوں نے کس طرح خود ان کی دانشوری کو ایک تعجب انگیز حماقت ثابت کر دیا ہے۔ وللہ الحمد۔

عقیدۂ آخرت کی برکات

عقیدۂ آخرت کے خوشگوار اثرات اور ذریعۂ تعلیم و تربیت کے طور پر اس کے استعمال کے فوائد دو طرح سے ظاہر ہو سکتے ہیں:

۱- برائی سے بچنے میں

۲- نیکی کی طرف چلنے میں

قرآن کریم نے ایک جگہ (سورۃ المومنون: ۱۲-۱۶میں) انسان کی تخلیق اور تولید کے مختلف مراحل کا ذکر کر کے اس سے "احسن الخالقین" کی قدرتِ کاملہ پر استدلال کیا ہے۔ اس کے بعد فرمایا ہے۔

ثم انكم بعد ذلك لميتون۔ ثم انكم يوم القيامة تبعثون۔

" تو پھر یقیناً اس کے بعد تم ضرور ہی مرنے والے ہو۔ پھر یقیناً تم سب قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے"۔

مرنے کے بعد دوبارہ زندگی کو زور دار الفاظ میں بیان کرنا تو خیر کوئی بات

Marfat.com

ہوئی۔ آیاتِ بالا میں قابل غور بات یہ ہے کہ موت کے "یقیناً" اور "ضرور ہی" واقع ہونے کی خبر دینا بھی کوئی ناقابل یقین بات ہے؟ کون نہیں جانتا کہ موت تو آئے گی ہی ۔پھر ان آیتوں میں "موت" اور "موت کے بعد زندگی" کو یکساں یقین انگیز الفاظ بلکہ موت کے یقینی ہونے کو زیادہ تاکید کے ساتھ بیان کرنے میں آخر حکمت کیا ہے؟ ہاں یقیناً ہے ۔ آدمی اگر مرنے کے بعد آنے والی زندگی کو بھول بھی جائے اور صرف یہی یاد رکھے کہ اسے مرنا ضرور ہے اور کچھ معلوم نہیں موت کس وقت آ جائے تو اتنی سی بات بھی اسے ہزاروں برائیوں سے روک سکتی ہے۔ "میں جو یہ ناجائز ذرائع سے ملازمت کر رہا ہوں یا دولت حاصل کر رہا ہوں کیا ممکن نہیں کہ میں دنیا میں ہی اس سے فائدہ نہ اٹھا سکوں"؟ "مکروفریب سے حاصل ہونے والے مفادات سے استفادہ کب تک"؟ "کسی مظلوم کی آہوں کی قیمت پر ' معاشرے کو تباہ کرنے کے عوض میں اور قوم ' ملک یا دین سے غداری کے انعام میں مجھے جو کچھ مل رہا ہے کیا یہ کچھ بعید ہے کہ مجھے دو دن بھی اس سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہ مل سکے؟ تو پھر آخر یہ کیوں کروں " ؟اگر ایک آدمی برائی کرتے وقت اس انداز میں اور ان خطوط پر سوچنے لگے تو کیا صرف موت کے ذکر سے ہی وہ برائی سے بچ نہیں سکتا ؟ اور پھر اگر انسان کو آخرت کے حساب کتاب کا خیال بھی ہو تو وہ ہر وقت اپنا احتساب کیوں نہیں کرے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ عقیدۂ آخرت کے بغیر بہتر اور صالح معاشرے کا قیام ناممکن ہے۔

عقیدۂ آخرت کی حکمتوں ' فائدوں ' معاشرتی زندگی پر اس کے صحت مند اثرات اور اخلاقی نظام میں اس کی اہمیت کا یہ صرف قانونی یا زیادہ سے زیادہ اخلاقی پہلو ہے۔ یہ بھی اچھا ہے۔ مگر اتنا ہی جتنا ایک طالب علم کا صرف فیل ہونے سے بچ جانا۔ آخرت کی سزا کا تصور بس برائی سے بچا سکتا ہے ' بھلائیوں کی دوڑ میں آگے نکلنے پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ یہ کام عقیدۂ آخرت کا دوسرا پہلو یعنی آخرت کی نعمتوں سے تصور ہوتا ہے۔ " جب ایک آدمی اس بات پر دل سے ایمان لاتا ہے کہ اس دنیا کی ساری نعمتیں اور لذتیں آخرت کے مقابلے میں ہیچ ہیں ' تو دنیا کی آرائش اور ضرورت سے

Marfat.com

زائد چیزوں سے پرہیز اور قناعت کے ساتھ ساتھ آخرت کی فکر ' ان کاموں سے دلچسپی جو اخروی زندگی میں نفع دے سکیں۔ اللہ کے سامنے حاضری کا شوق ' جو کچھ اللہ کے ہاں ہے اسے دنیا پر ترجیح دینا ' ایمان پر خاتمہ اور اللہ کی راہ میں موت کا استقبال یہ امور اس کے احساس و شعور اور ایمان و وجدان کا جزو و وجدان کا جزو بن جاتے ہیں۔ ایسا آدمی جب آخرت کا ذکر کرتا ہے تو ایک بے ساختگی لذت اور لطف کی کیفیت سے کرتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت بڑی قوت ' گرم جوشی اور یقین کے ساتھ دیتا ہے۔ یہ در اصل عقیدۂ آخرت کی خاصیت ہے کہ وہ قدرتی طور پر اپنے ماننے والوں میں اس زندگی کی بے وقعتی ' خواہشات پر قابو اور مردانگی و حق پرستی کے اوصاف پیدا کرتا ہے۔ اس میں قطعاً شک نہیں کہ اسلام کی ابتدائی دور کی فتوحات و ترقیات اور اس کی عام تبلیغ و اشاعت اسی ایمان اور عقیدۂ آخرت کو مرہونِ منت تھیں۔

مگر خیال رہے کہ عقیدۂ آخرت اور اس دنیا کی زندگی کے حقیر و قلیل ہونے کے بارے میں قرآنِ کریم واسلام یک نقطۂ نظر کا اس ناپسندیدہ رہبانیت اور ترکِ دنیا کے تصور سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں مگر جسے اسلام کی تعلیمات سے غفلت اور بعض غیر اسلامی رجحانات کے زیرِ اثر خود مسلمانوں میں بھی راہ پا گیا تھا۔

عقیدۂ آخرت اس دنیا کی حق تلفی اور اس کی صحیح قدروقیمت سے انکار کے بغیر صرف آخرت کی ترجیح پر قائم ہے اس کی بنیاد آخرت کی جدوجہد حق و صداقت کے لئے سعیٔ مسلسل اور لازوال زندگی کے حصول کے لئے عارضی اور فانی خواہشات کی قربانی اور رضائے الٰہی کی طلب ہے۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ مسلمان صرف اسی عقیدے کی کمزوری کی وجہ سے کمزور ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کی نئی نسل جو آج کل ہوا و ہوس میں گرفتار نظر آ رہی ہے۔ اس کو اس عقیدے ' عقیدۂ آخرت کی تجدید ' اس کے ازسرِ نو احیاء اور مسلمانوں میں اس کی اشاعت کی شدید ضرورت ہے۔ کھسکی ہوئی چول اس وقت تک اپنی صحیح جگہ پہ نہیں آئے گی اور مسلمانوں کا ایمان اس وقت تک مکمل

Marfat.com

نہیں ہو گا ' جب تک وہ اس زندگی اور آنے والی زندگی کو قرآنِ کریم کے نقطہ نگاہ سے دیکھنا شروع نہ کریں گے"۔

☆☆☆

Marfat.com

عبادات

عبادت کے معنی

عبادت کے لفظی اور اصطلاحی معنوں کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ''عبادت'' کا ترجمہ عام طور پر ''بندگی'' کیا جاتا ہے۔ عربی میں ''عبد'' اور فارسی میں ''بندہ'' زرخرید غلام کو کہتے ہیں (جن کا پہلے زمانے میں عام رواج تھا) اس لحاظ سے عبادت یا بندگی کا مطلب ہوا غلام ہونا ' غلامی قبول کرنا یعنی مالک کے ہر حکم کی دل و جان سے تعمیل کرنا۔ ہر کام اپنے آقا و مالک کی خوشنودی کے لئے کرنا۔ اسی سے عبادت میں ''پوجا اور پرستش'' کا معنی پیدا ہوتا ہے ' اسی سے عبادت کے اصطلاحی معنی نکلتے ہیں یعنی ''ایک خاص مقررہ کیفیت اور ہیئت کے ساتھ اپنے خلوص اور عاجزی کا اظہار کرنا'' جس کے مختلف طریقے ہر مذہب و ملّت میں رائج ہیں۔

آپ کو ''غلامی'' کے تصوّر سے عبادت کے معنوں کا تعلق شاید عجیب لگا ہو۔ غلامی تو سیاسی بھی بری اور معاشرتی بھی ۔ کیا اسلام کا مطلب ہے ''آزادی'' کھو دینا اور ''غلامی'' اختیار کرنا؟ جی ہاں ! مگر کس سے ''آزادی'' اور کس کی ''غلامی''؟ یہ بھی تو سوچئے۔ دنیا میں مطلق آزادی نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہاں ہر شخص کو چھڑی گھمانے کی آزادی اس حد پر ختم ہو جاتی ہے ' جہاں سے دوسرے کی ناک کی حد شروع ہوتی ہے۔ کیا کسی بھی انسانی معاشرے میں (اور آپ جانتے ہیں کہ انسان ہی وہ ''جانور'' ہے جو معاشرے کے بغیر نہیں رہ سکتا) ہر آدمی کو یہ آزادی دی جا سکتی ہے کہ وہ جو چاہے کرے تو بھئی ! آزادی کو محدود تو کرنا ہی پڑے گا اور مادر پدر آزادی کو تو آپ بھی برا ہی کہیں گے۔

لا الہ الا اللہ کا معنی آپ نے پڑھا اور سمجھا۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں

Marfat.com

یعنی ہم اللہ کے سوا کسی اور کے بندے اور غلام نہیں ہیں۔ یہی وہ غلامی ہے جو انسان کو باقی ساری "غلامیوں" سے نجات دلا دیتی ہے۔ ورنہ وہ آدمی قدم قدم پر' جگہ جگہ' قسم قسم کی غلامی میں گرفتار رہتا ہے۔ اسلام تو ابتداء ہی سے انسانیت کو شرف اور حریّت سے شناسا کرتا ہے۔ اللہ کی غلامی تو ظاہری "غلامیوں" سے ہی نہیں' باطنی "غلامیوں" مثلاً خواہشات تک کی غلامی سے آزاد کر دیتی ہے۔

عبادات کا عقیدے سے تعلق

آپ نے غور کیا کہ عبادت کے معنوں میں "عمل" اور "کام" کا مفہوم موجود ہے۔ آپ نے پہلے "دینِ اسلام" کے بنیادی اصول و عقائد کا مطالعہ کیا۔ یہ عقیدہ یا ایمان خود بخود آدمی سے عمل بلکہ عقائد کے مطابق عمل کا تقاضا کرتا ہے۔ حق اور سچ میں یہ تاثیر ہے کہ جب وہ دل و دماغ میں اترتا ہے تو فوراً عمل میں اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ اگر کوئی زبان سے حق قبول کرنے یا ایمان لانے کا اقرار کرے تو اس کو قول کی صداقت کا پہلا امتحان (TEST) بھی یہی ہے کہ اس "حق" یا "ایمان" کے عملی مطالبے اور تقاضے پورے کرنے پر آمادہ بھی ہے یا نہیں؟ عقیدے کے ساتھ اگر عبادت نہیں تو عقیدے کا اقرار مشکوک ہے۔

اسلامی عبادات کی اہمیت

اسی لیے اسلام میں ایمان یا عقیدے کی درستی کے بعد سب سے پہلے عبادات پر زور دیا گیا ہے۔

عبادات "اللہ کے ساتھ براہ راست ربط اور تعلق" کی ایک عملی صورت ہونے کے باعث' بذاتِ خود مقصد اور نصب العین بھی ہیں اور اسلام کے باقی احکام و قوانین پر عمل کے لئے آمادہ کرنے اور ان احکام کی روح کو سمجھنے کے لئے تربیت کا ایک "ذریعہ" بھی ہیں۔

قرن اول کے مسلمانوں کو ان عقائد اور عبادات نے ہی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔

Marfat.com

اللہ پر ایمان اور اس کے ساتھ ربط (بذریعہ عبادت) نے تمام مشکلات کو ان کی نظر میں ہیچ کر دیا' بڑی سے بڑی قربانی دینا ان کے لئے آسان ہو گیا اور وہ ایمان اور عبادت کی روح سے آشنا ہو گئے۔ ان کی زندگیاں' ان کے عقائد اور عبادات کے نتائج کی منہ بولتی تصویریں تھیں۔ وہ نہ دنیا سے لاتعلق تھے' نہ آخرت سے غافل۔ وہ عبادات کے احکام' ان کی ظاہری شکل و صورت' ان کی کیفیت اور ہیئت سے بھی واقف تھے اور عبادات کے معنیٰ' مقصد اور اس کی روح اور حقیقت سے بھی۔

یاد رکھئے! عبادات کا ظاہر بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا ان کا باطن اہم ہے۔

عبادات اور عبادت کا مفہوم

آیئے اب ہم اسلام کی بنیادی عبادات پر قرآن و سنت کی روشنی میں نظر ڈالیں۔ وہ عبادات یہ ہیں:

ا- نماز

ب- زکوٰۃ

ج- روزہ

د- حج

اور ہاں یاد رکھئے ہم نے انہیں "بنیادی عبادات" اس لئے کہا ہے کہ یوں تو اسلام کے ہر حکم کی تعمیل عبادت ہے' چاہے اس کا تعلق اللہ سے ہو یا اس کے بندوں سے ۔ بلکہ مکمل اسلامی زندگی بسر کرنے والے آدمی کا ہر کام حتّیٰ کہ خرید و فروخت' اٹھنا بیٹھنا' کھانا پینا' لکھنا پڑھنا سب ہی عبادت ہوتا ہے' مگر "مکمل اسلامی زندگی" کی بنیاد بلکہ عملی بنیاد تو یہ عبادات ہی ہیں۔ جب تک عمارت کی بنیاد ہی نہ رکھی جائے' اوپر کون سے محل تعمیر ہوں گے؟ تمام "اسلامی مذاہب" کے نزدیک ان چار عبادات میں کسی ایک کا انکار صریح کفر ہے اور ترک (چھوڑ دینا' عمل نہ کرنا) بھی کفر کے بعد سب سے بڑا گناہ اور جرم ہے۔ اس میں کسی کا ادنیٰ اختلاف بھی نہیں۔

Marfat.com

نماز

دین اسلام کا اوّلین ستون اور سب سے اہم عبادت "نماز" ہے۔

نماز کے معنی

نماز کے لئے اصل عربی لفظ جو قرآن و حدیث میں استعمال ہوا ہے ' صلوٰۃ (پڑھنے میں صلاۃ) ہے "نماز" قدیم فارسی زبان کا لفظ ہے اور غالباً اسلام سے پہلے وہاں کے مذہب میں یہ لفظ جسمانی عبادت کی صورت پر بولا جاتا تھا مگر کثرتِ استعمال سے اب یہ لفظ (نماز) صلوٰۃ کے بالکل ہم معنی اور مترادف ہو گیا ہے۔ (آپ کو یاد ہو گا یہی بات اس سے پہلے کلمات "خدا" ' پیغمبر" ' "دوزخ" ' "بہشت" ' "فرشتہ" اور "بندگی" کے بارے میں بتا چکے ہیں) لہٰذا لفظ نماز کا استعمال بالکل درست اور بجا ہے۔ عربی کے لفظ صلوٰۃ کے لفظی معنی تو کئی ہیں (اور دنیا کی تمام زبانوں میں متعدد معنوں والے اسم اور فعل عام ہیں) مگر جو معنی صلوٰۃ کے اصطلاحی معنوں سے قریب ہیں وہ ہیں "دعا ' رحمت ' استغفار اور حسن ثناء"۔

اصطلاح میں نماز " اللہ کی عبادت کا مقرّرہ اسلامی طریقہ ہے"۔

نماز کی اہمیت

نماز یا صلوٰۃ ایک بدنی عبادت کی حیثیت سے تمام مذاہب کا جزو رہی ہے۔ قرآن کریم میں بیان ہوا ہے کہ توحید خالص ' نماز اور زکوٰۃ ہمیشہ سے برحق دین والوں کا شعار رہا ہے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم ' حضرت اسماعیل ' حضرت موسیٰ ' حضرت زکریا اور حضرت عیسیٰ (علیہم السلام) کے نمازی ہونے کا ذکر قرآنِ کریم میں آیا ہے۔ پہلی امتوں کے نیک لوگوں کی خوبیوں میں ان کا پابندِ نماز ہونے کا ذکر بھی قرآنِ کریم میں ایک سے زیادہ جگہ پر آیا ہے۔

Marfat.com

قرآنِ کریم میں پہلی امتوں کے برے آدمیوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی ایک خاص خرابی "نماز ترک کرنا اور اس سے غفلت کرنا" بتائی گئی ہے۔

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس غارِ حرا میں پہلی وحی کے لئے جب جبرائیل امین آئے تو اس وقت آپ کو سب سے پہلے اللہ کی عبادت کا یہ طریقہ ' جسے ہم نماز کہتے ہیں ' سکھایا گیا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کے تیرہ برس میں مسلمانوں پر صرف یہی ایک عبادت "نماز" فرض تھی۔ باقی عبادات بہت بعد میں یعنی مدنی دور میں فرض ہوئیں۔

اسلام میں نماز کی تاریخ

شروع میں صبح و شام کی صرف دو نمازیں اور وہ بھی صرف دو دو رکعت کی فرض تھیں۔ مکی زندگی کے آخری برسوں میں واقعہ معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز کے اوقات دو کی بجائے پانچ کر دیے گئے۔ حدیث شریف میں ہے "الصلوٰۃ معراج المومنین" نماز مومنوں کے لئے معراج ہے۔

مدینہ پہنچ کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کی بنیاد رکھی اور باقاعدہ نماز باجماعت کا اہتمام فرمایا۔ اس کے لئے اذان کا طریقہ جاری فرمایا۔ ساتھ ہی فجر کے سوا باقی تمام نمازوں کی رکعتوں کی تعداد دو سے بڑھا کر چار کر دی گئی۔ البتہ مغرب کی تین رکعت مقرر کی گئیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر یا حضر ' بیماری یا صحت ' امن یا جنگ کسی حالت میں بھی آخر وقت تک نماز با جماعت کو نہیں چھوڑا ۔ خاص مجبوریوں میں نماز کے ادا کرنے میں احکام نرم کر دیے گئے(ا)۔ مگر اصل نماز کو کسی حالت میں ترک نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ کسی انتہائی مجبوری میں نماز چھوٹ جانے پر کسی دوسرے وقت میں اس کو

ا- مثلاً طہارت (وضو کی جگہ تیمم) قصر ' خوف وغیرہ کے احکام۔

Marfat.com

"قضا" کے طور پر بھی پڑھنے کا حکم دیا۔ نماز ہی ایسی عبادت ہے جو مسلمانوں کو ہوش و حواس کے ہوتے ہوئے کسی صورت میں معاف نہیں ہے۔ صرف خواتین کو ان کے خاص دنوں میں نماز پڑھنا منع ہے (اور اس کی قضا بھی نہیں ہے) تاہم ان کے لئے یہ مستحب (بہتر) ہے کہ وہ ان دنوں میں بھی نماز کے اوقات میں باقاعدہ وضو کر کے کسی صاف پاک جگہ پر کم از کم نماز کے وقت کے برابر دیر تک ویسے کوئی ذکر یا تسبیح پڑھتی رہیں اور یہ اس لئے کہ ان کی وضو اور نماز کی عادت ٹوٹنے نہ پائے' ورنہ بالکل ہی چھوٹ جانے کا خطرہ ہے۔

نماز کی اصطلاحات

ہم نے اوپر دو لفظ "فرض" اور "مستحب" استعمال کئے ہیں۔ اس سے ایک اور ضروری بات کی طرف بھی توجہ کریں۔ آپ نماز کے ضمن میں "رکعت"، "رکوع"، "سجود"، "تشہد"، "تکبیر" وغیرہ اصطلاحات سے ضرور واقف ہوں گے ۔ یہ اصطلاحات تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہی استعمال ہونے لگی تھیں۔ مگر "فرض" "سنت" (مؤکدہ یا غیر مؤکدہ) "واجب"، "مستحب" یا "نفل" وغیرہ کی اصطلاحات آپ کے بعد رائج ہوئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل نماز تو صرف وہ رکعات ہیں جنہیں ہم اب "فرض" کہتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسے صلوۃ مکتوبۃ یعنی "فرض کی گئی نماز" کہتے تھے اور یہی وہ نماز تھی جو حضورؐ نے مدنی دور میں ہمیشہ با جماعت ادا فرمائی۔ ابتداء میں ہم نے نماز کی رکعتیں دو دو اور بعد میں چار چار ہونے کا ذکر کیا تھا۔ اس سے بھی مراد اسی "فرض نماز" یا صلوٰۃ مکتوبۃ کی رکعتیں تھیں۔

مدنی زندگی کے دس سال میں صحابہ کرامؓ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح نماز پڑھتے دیکھا' اسی طرح خود پڑھی اور پھر آگے اسی طرح پڑھنا سکھائی۔ صحابہ کرامؓ نے دیکھا تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کی جماعت کرانے تشریف لاتے تو مختلف اوقات کی نمازوں میں اصل فرض رکعتوں (کی جماعت) سے پہلے

Marfat.com

یا بعد میں بھی کچھ رکعات پڑھا کرتے تھے۔ ان زائد از فرض رکعات میں سے بعض کا تو آپؐ نے ایسا التزام فرمایا کہ کسی حالت میں اور کبھی ان کو نہیں چھوڑا (۱)۔ مثلاً فجر کی دو سنتیں بعض رکعات کو آپ نے کبھی پڑھا اور کبھی نہیں بھی پڑھا۔ مثلاً عصر یا عشاء کی پہلی سنتیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل کو سامنے رکھتے ہوئے بعد میں ائمہ فقہاء نے نماز کی رکعتوں کی بلحاظ اہمیّت درجہ بندی کر دی تاکہ عام مسلمانوں کو زیادہ ضروری یا کم ضروری یا غیر ضروری کا فرق معلوم ہو تو کم از کم زیادہ ضروری کی پابندی تو ہر حالت میں کریں گے۔

نظامِ نماز - سنّتِ متواترہ

نماز کا مفصل نظام ' حدِ اوقات ' وضو ' اذان ' تکبیر ' جماعت ' رکعات ' قیام ' رکوع ' سجود ' تشہد ' سلام ' "نماز پنجگانہ" کے علاوہ زائد (نفلی) نمازوں ' تہجد ' اشراق وغیرہ کے اوقات ' جمعہ ' عیدین اور جنازہ وغیرہ خاص خاص نمازوں کی ساری تفصیل خود رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے عملی تواتر (یعنی ساری امت کا ایک دوسرے کو کرتے دیکھ کر سیکھتے سکھاتے چلے جانا) کے ساتھ ثابت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: "صلّوا کما رأیتمونی اصلّی" (جیسے مجھے نماز پڑھتے دیکھو اسی طرح پڑھا کرو)۔

جب عرب سے مختلف قبائل کے وفد اور لوگ اسلام قبول کرنے مدینہ آتے (آخری دورِ نبویؐ میں) تو اکثر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دو دن پاس ٹھہرا لیتے۔ایک دن پانچوں نمازیں اوّل وقت میں پڑھا دیتے۔ دوسرے دن ہر نماز اپنے آخری وقت میں پڑھاتے پھر رخصت کرتے وقت فرماتے "تم نے ہر نماز کا اوّل اور آخر وقت معلوم کر لیا۔ جاؤ اب ان ہی اوقات کے اندر نماز پڑھا کرو"۔

نماز کے پڑھنے کے طریقے میں ہمارے اندر جو اختلافات ہیں ' یہ بھی سب

۱- اصطلاح میں ان " فرض" رکعات کے علاوہ رکعات کو "رواتب" بھی کہتے ہیں

Marfat.com

حضورؐ سے ہی ثابت ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز ہماری طرح رٹی رٹائی نہیں تھی۔ آپ نماز میں جتنی دعائیں پڑھتے تھے ' وہ سب جمع کی جائیں تو ایک مستقل کتاب بن جائے۔ اسی طرح نماز کے ادا کرنے کی بعض کیفیات کے بھی آپؐ سے ہی ایک سے زائد طریقے ثابت ہیں جس امام کو جو بات کسی (اس کے نزدیک) زیادہ معتبر طریقے سے پہنچی اس نے اس کے مطابق عمل اختیار کر لیا۔ لہٰذا نماز کے طریقے جو سنت سے ثابت ہوں ' سب درست ہیں۔ اس میں کسی سے الجھنا نادانی اور جہالت ہے۔ ہاں اگر کہیں نماز میں یا اس سے پہلے یا بعد کوئی ایسی چیز بطور ثواب لازمی سمجھی جانے لگی ہو ' جو سنت سے ثابت نہ ہو سکے اور جس کا وجود عہدِ نبویؐ میں نہ تھا' تو یہ چیز یقیناً غلط ہو گی۔ آپ کو جب کبھی اس قسم کے اختلافات وغیرہ میں کوئی الجھن پیش آئے تو کسی ایسے عالمِ دین سے جس کے علم اور دیانت پر آپ کو بھروسہ ہو ' اس سے صرف یہ پوچھ لیجئے کہ یہ کام سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانے میں (جسے خیر القرون' بہترین زمانہ کہا گیا ہے) بھی اسی طرح ہوتا تھا۔ اگر نہیں تھا تو پھر یہ کام ہرگز کوئی نیکی نہیں کیونکہ اس کا مطلب تو یہ ہو گا کہ حضورؐ اور آپ کے صحابہؓ تو بعض نیکیوں سے محروم رہ گئے ' جواب ہمیں نصیب ہو رہی ہیں۔

ہمارے دین میں اجتماعی عبادات (نماز میں جماعت ' جمعہ ' عیدین وغیرہ) کا جو طریقہ ہمارے آقا و مولیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمایا اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ہماری عبادات تحریف سے محفوظ رہی ہیں جو کام سب مسلمان مل کر کرتے اور ہوتا دیکھتے رہتے ہیں ' اس میں کوئی نئی بات داخل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری نماز کے اندر کوئی ایسی نئی بات جو سنّت سے ثابت نہ ہو ' راہ نہیں پا سکی۔ مثلاً نماز میں سجدے ہر رکعت میں دو ہی ہیں۔ سجدہ سب سے بڑی عبادت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سجدے کی حالت میں بندہ اپنے رب کے قریب تر ہوتا ہے۔ اس کے باوجود سجدے دو کی بجائے تین یا چار کرنے کو کوئی بھی جائز نہیں کہے گا۔ اس لئے کہ حضورؐ کے عمل اور سنّت سے صرف دو سجدے ہر رکعت میں ثابت ہیں۔

Marfat.com

نماز کی روح اور خشوع

نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے وہ آپ کو معلوم ہی ہے ان عبارات کے اسرار و نکات اور ان کے معانی و مقاصد پر بات کرنا یہاں ناممکن ہے تاہم آپ ایک اچھے مسلمان کی حیثیت سے اور پڑھے لکھے مسلمان کی حیثیت سے اس موضوع پر کوئی کتاب کبھی ضرور مطالعہ کیجئے گا۔

نماز میں توجہ الی اللہ اور خشوع اور خضوع اور یکسوئی وغیرہ نہایت ضروری امور ہیں ' بلکہ نماز کی اصل روح اور غرض و غایت ہیں۔ یہ باتیں کیسے حاصل ہوں؟ اس کا کم از کم طریقہ تو یہ ہے کہ نماز پڑھتے وقت اپنے منہ سے نکلنے والے ایک ایک لفظ پر آپ خیال رکھیں کہ اب میں فلاں لفظ بول رہاں ہوں ' اس سے توجہ ادھر ادھر نہیں جائے گی ' لفظوں کی طرف ہی رہے گی گے۔

دوسرا اور بہتر طریقہ یہ ہے کہ پوری نماز کا ترجمہ یاد کر لیں۔ یہ کوئی ایسا مشکل کام بھی نہیں ہے۔ نماز پڑھتے وقت ان الفاظ کے معنی ذہن میں رکھیں تو بھی آپ اللہ سے ربط کی ایک لذّت محسوس کریں گے۔

اور تیسرا اور سب سے اچھا طریقہ یہ ہے جو خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان فرمایا ہوا ہے اور وہ یہ تصوّر ہے کہ ان تعبد اللہ کانك تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراك ۔ اللہ کی عبادت یوں کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم یہ نہیں کر سکتے تو یہ ذہن میں رکھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ ہمیشہ نماز با جماعت پڑھنے سے بھی بہت سی انفرادی خامیوں کی اصلاح خود بخود ہوتی رہتی ہے۔

نماز کا فلسفہ

بعض اوقات سوال کیا جاتا ہے کہ نماز کے فوائد کیا ہیں؟ نماز کے کچھ فوائد یا برکات قرآن و سنت میں بھی بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ آیت آپ نے پڑھی یا سنی ہو

Marfat.com

گی" ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر ۔ نماز بے حیائیوں اور برے کاموں سے روکتی ہے۔ اہل علم مسلمانوں نے نماز کے مقاصد و معانی ' اس کے منافع و برکات اور نماز کے پورے نظام کے "فلسفے" پر بہت کچھ لکھا ہے اللہ موقع دے تو ایسی کتابیں بھی ضرور پڑھئے گا۔ نماز (اور باقی سب عبادات بھی) بنیادی طور پر اللہ سے براہ راست ربط کا ذریعہ ہیں۔دن میں پانچ بار لازماً اور اللہ توفیق دے تو رات کی تنہائیوں میں جب سب لوگ میٹھی نیند سو رہے ہوں۔ اس وقت تہجد میں اس ربط اور دلی تعلق کو اور مضبوط بنایئے۔ جب تک نماز کے بعد مسرت اور اطمینان کی کیفیت محسوس نہ کرنے لگیں ' یہ مشق اور کوشش جاری رکھیں۔ اگر رب سے رابطہ بڑھا تو یہ خود بخود باقی تمام اعمال و اقوال پر چھا جائے گا اور نماز کی ساری برکات خود بخود حاصل ہوتی چلی جائیں گی۔ اگر اس ربط کے قائم کرنے میں ہی ناکام رہے یا اس پر توجہ نہ دی تو باقی فلسفے اور حکمتیں "بگھارنا" ذہنی عیاشی اور علمی بازی گری ہے۔

بے نمازیوں کا فلسفہ

منافع حاصل ہوں یا نہ ہوں ' حکمتیں سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں ' خود نمازیوں میں کوئی اثر نظر آئے یا نہ آئے ' نماز کو بے فائدہ چیز مت کہیں۔ نماز وہ چیز ہے جس کا اہتمام رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ فرماتے اور صحابہؓ کو بھی اس اہتمام کا حکم دیتے تھے۔ آپؐ نے نماز کو " دین کا ستون" قرار دیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ہمارے اور ان (غیر مسلموں) کے درمیان بنیادی فرق یا خطِ امتیاز نماز ہے۔ آپ کبھی ان لوگوں کی بات پر کان نہ دھریں جو اکثر کہتے ہیں کہ جو نماز لوگوں کا مال کھانے سے اور دوسروں پر ظلم کرنے سے نہیں روکتی ' ایسی نمازوں کا کیا فائدہ ؟

یاد رکھئے اگر کوئی نمازی ایسے کام کرتا ہے تو یہ سمجھئے کہ وہ ٹھیک طریقے پر

Marfat.com

اپنے رب کے سامنے پیش ہی نہیں ہوا ' وہ نماز کو اللہ سے رابطہ کا ذریعہ سمجھا ہی نہیں ' اس میں نماز پر کیا الزام ؟ رہ گئے ایسی باتیں کر کے نماز کی اہمیت گھٹانے والے لوگ ' آپ دیکھیں گے کہ اکثر ایسے لوگ خود بے نماز ہوتے ہیں اور اپنی اس حرکت اور غفلت کا جواز تلاش کرتے پھرتے ہیں۔

☆☆☆

Marfat.com

زکوٰۃ

زکوٰۃ کے معنی

زکوٰۃ (پڑھنے میں زکاۃ) عربی زبان کے جس فعل سے نکلا ہے اس کے لفظی معنی ہیں(۱) پھلنا پھولنا' بڑھنا' زیادہ ہونا (۲)پاک صاف ہونا۔ زکوٰۃ کسی چیز کے نہایت عمدہ اور بہترین حصّے کو بھی کہتے ہیں۔ اپنے اصطلاحی معنوں میں لفظ زکوٰۃ اپنے دونوں لفظی معنوں سے تعلق رکھتا ہے۔ زکوٰۃ سے مال پاک اور صاف ہو جاتا ہے (جو کمایا ہی حرام طریقے پر ہو یہ اس کی بات نہیں ہے) اور اپنی برکتوں (محض روحانی نہیں بلکہ اقتصادی بھی اور معاشی بھی) کے لحاظ سے یہ مال کی زیادتی کا باعث بھی بنتی ہے۔

اصطلاح میں "زکوٰۃ ایک مالی عبادت ہے جس میں شریعت نے مال کی مقدار' زکوٰۃ کی شرح اور اس کے مصارف کا تعیّن کر دیا ہے یعنی اپنے مال میں سے مقررہ قوانین کے مطابق ایک حصہ لازماً نکالنا"۔ زکوٰۃ کے لئے قرآن کریم میں دوسرا لفظ صدقہ (جس کی جمع صدقات ہے) استعمال ہوا ہے صدقے کا لفظی تعلق صدق (سچ) سے ہے اور صدقہ اس مال کو کہتے ہیں جو کسی کو ثواب اور نیکی کا کام سمجھ کر دیا جائے۔ تحفہ یا انعام یا بخشش وغیرہ کے طور پر نہیں۔ اسے صدقہ اسی لیے کہتے ہیں کہ اس سے گویا انسان اپنے مالک (اللہ تعالیٰ) کے سامنے اپنی عبودیت اور اقرارِ بندگی کو سچّا ثابت کرتا ہے۔ اسی لئے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقے کا مفہوم صرف "مال دینے کی بجائے زیادہ وسیع کر دیا۔ ایک طویل حدیث میں آنحضورؐ نے " انصاف کرنا' کسی کا ہاتھ بٹا دینا' سامان اٹھانے یا سوار ہونے میں مدد کر دینا' اچھی بات کرنا' نماز کی طرف چلنا' راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانا' کسی بے کس محتاج کی امداد کرنا' بھلائی کا حکم دینا' سب کو صدقہ کہا۔ حتّٰی کہ فرمایا " اور کچھ بھی نہیں کر سکتے تو لوگوں کے ساتھ برائی

Marfat.com

کرنے سے باز رہنا بھی صدقہ ہے"۔

اصطلاح میں اب صدقات کا لفظ عام ہے۔ یہ واجب اور غیر واجب (نفلی) صدقات سب پر بولا جاتا ہے۔ زکوٰۃ کا لفظ معیّن اور فرض صدقے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ بھی آپ نے نوٹ کیا ہو گا کہ زکوٰۃ کی جگہ کسی غیر عربی لفظ نے نہیں لی بلکہ فارسی، اردو، پنجابی، ترکی وغیرہ میں قرآن کریم کا اصل لفظ زکوٰۃ ہی اس مقصد کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

زکوٰۃ کی اہمیت

اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل امور سامنے رکھیئے:

قرآن کریم میں آٹھ جگہ زکوٰۃ ادا کرنے اور نماز کو قائم کرنے کا حکم ساتھ ساتھ ملا کر دیا گیا ہے۔ نماز کی اہمیت پر پہلے بات ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ انفاق (مال خرچ کرنا) اور صدقے کے الفاظ سے بھی زکوٰۃ کا حکم متعدد جگہ آیا ہے۔

نماز کی طرح زکوٰۃ کو بھی پہلے انبیاء نے دین کا ضروری حصہ قرار دیا۔ حضرت اسماعیل اور حضرت عیسیٰ (علیہم السلام) کے "پابندِ زکوٰۃ" ہونے کا ذکر قرآن کریم میں ہوا ہے۔

پہلی امتوں کے نیک لوگوں اور اس امت کے عنداللہ بلند مرتبہ پانے والوں کی ایک خاص صفت "زکوٰۃ ادا کرنا اور اپنے مال میں مستحق کا حق ماننا" بیان ہوئی ہے۔

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی طرح زکوٰۃ کا بھی ایک معیّن نظام قائم فرمایا اور اس نظام کو چلانا حکومت کا فریضہ قرار دیا۔ بڑی تفصیل کے ساتھ اس کے احکام جاری فرمائے۔ یہی وجہ تھی کہ حضورؐ کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ نے منکرین زکوٰۃ کو بھی مرتدین کی طرح اسلام کے باغی قرار دے کر ان سے جہاد کیا۔

زکوٰۃ کے احکام

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زکوٰۃ کی جو تفصیلات ثابت ہیں ان کا بیان

Marfat.com

خاصا طویل ہے۔ چند اہم اور اصولی امور مختصراً لکھے جاتے ہیں۔ آپؐ نے اموال کی نشاندہی فرما دی۔ جن پر زکوٰۃ واجب ہو گی۔ اس میں (i) زرعی پیداوار[1] (ii) معدنیات یا کوئی دفینہ (iii) سونا چاندی اور نقدی (iv) مویشی (اونٹ، بھیڑ، بکری اور گائے) شامل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک چیز کی (ماسوائے دفینہ یا معدنی دولت کے) وہ کم از کم مقدار مقرر فرمائی جس پر زکوٰۃ لی جائے گی۔ اس مقدار کو اصطلاح میں ''نصاب'' کہتے ہیں۔ جن چیزوں پر زکوٰۃ واجب تھی، آپؐ نے اس کی شرح زکوٰۃ بھی مقرر فرما دی، جس کی چار قسمیں کی جا سکتی ہیں، یعنی ۵/۱، ۱۰/۱، ۲۰/۱ اور ۴۰/۱ یا علی الترتیب ۲۰ فیصد، ۱۰ فیصد، ۵ فیصد اور ۲.۵ فیصد۔ مصارف زکوٰۃ خود قرآن کریم نے بیان کر دیے تھے۔ آپؐ نے اہل بیت پر زکوٰۃ لینا حرام قرار دیا۔

یہ ہیں وہ بنیادی باتیں جن سے مختلف اسلامی مذاہب کے ائمہ نے زکوٰۃ کے مختلف مسائل نکالے ہیں۔ آپ جسے درست سمجھتے ہیں، اس کے قول پر عمل کیجئے۔

زکوٰۃ کے مقاصد

زکوٰۃ کا نظام بنیادی طور پر اصول پر قائم ہوا ہے کہ دراصل حر چیز کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، اس نے بندوں کو حق ملکیت انسان کی تکریم اور اس پر اعتماد کے لیے دیا ہے۔ ملکیت کی لذت بھی انسان کے اندر فطری طور پر رکھی گئی ہے اور اس کرۂ ارض پر انسان کی ترقی میں اس فطری جبلت کا بڑا ہاتھ ہے ۔ البتہ اس کے غلط استعمال سے روکنے کے لیے اسلام نے ملکیت کو امانت بلکہ خدا کی امانت قرار دیا ہے اور اسی لیے انفاق کے احکام دے کر بندوں کی تربیت اور آزمائش کا بندوبست یکجا کر دیا ہے ۔

اگر نماز براہ راست اللہ کے ساتھ رابطے کی صورت ہے تو زکوٰۃ براہ راست خدا کے (غریب و مستحق) بندوں کے ساتھ رابطے کو لازمی قرار دیتی ہے ۔ اسلامی

۱۔ زرعی پیداوار کی زکوٰۃ کے لئے ہم عشر (دسواں حصہ) کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے ہمارے ہاں زکوٰۃ اور عشر دو الگ الگ نام رائج ہو گئے ہیں لیکن درحقیقت عشر بھی زکوٰۃ ہی ہے۔

Marfat.com

حکومت بھی اموال ظاہرہ (جسے بآسانی دیکھا جا سکتا ہو) کی زکوۃ وصول کرتی ہے۔ اموال باطنہ (وہ مال جس کا مالک کو علم ہے دوسرے معلوم ہی نہیں کر سکتے مثلاً زیورات وغیرہ) کی زکوۃ خود مستحقوں تک پہنچانا فرض ہے۔ زکوۃ ایسی عبادت ہے جس کا اصل مقصد مخلوق کو نفع پہنچانا ہے۔ یہ کام بندوں سے براہ راست رابطے کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اگر زکوۃ اور دوسرے صدقات اسی اصول اور جذبے سے ادا کئے جائیں تو معاشرے میں گداگر کوئی نہ رہے۔ بلکہ نظام زکوۃ کا مقصد ہی گداگری کو روکنا ہے۔ جب ہر زکوۃ دینے والا خود اللہ کے ان بندوں سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش میں لگا ہوگا' جب سوال کرنے والے مستحقین کو خود تلاش کیا جائے گا' تو گداگری اور خصوصاً پیشہ ورانہ گداگری کی حوصلہ شکنی ہو گی۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے زکوۃ اور صدقات کو الٹا گداگری کے فروغ کا سبب بنا دیا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ ہم نے پیشہ ور شخصوں یا اداروں یا انجمنوں یا جماعتوں کو زکوۃ دینے میں سہولت سمجھی اور مستحق کی تلاش ایک مشکل کام نظر آیا یا پھر غریب' عزت نفس رکھنے والے محتاج سے براہ راست رابطے کو شاید اپنی وجاہت اور وقار کے خلاف سمجھا۔

عام لوگ زکوۃ کو ایک ٹیکس کہہ دیتے ہیں۔ یاد رکھئے زکوۃ ٹیکس نہیں' عبادت ہے۔ سرکاری ٹیکس تو ایک طرح کا جرمانہ سمجھ کر بامر مجبوری ادا کیا جاتا ہے' زکوۃ میں تو الٹا یہ خوف رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بارگاہ الٰہی میں قبول ہی نہ ہو۔ زکوۃ اور حکومت کے ٹیکسوں میں بنیادی فرق ایسا ہے کہ یہ ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں۔ زکوۃ امیروں سے لے کر غریبوں کو دی جاتی ہے' جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے: تُؤخذُ من اَغنیائهم و تُرَدُّ الی فُقَرَائِهِم "ان (مسلمانوں) کے امیروں سے لی جاتی ہے اور ان کے فقراء (غریبوں) کی طرف لوٹائی جاتی ہے"۔ اس کے برعکس دنیا بھر کی حکومتوں کے ٹیکس عموماً غریبوں سے لیے اور امیروں پر خرچ کیے جاتے ہیں۔ براہ راست یا بالواسطہ ٹیکس کا بوجھ غریب پر پڑتا ہے' مگر براہ راست یا بالواسطہ اس کا زیادہ حصہ حکومت کے بڑوں کے کام آتا ہے۔

Marfat.com

زکوۃ اور ربا (سود) ایک دوسرے کے یکسر مخالف نظام بلکہ دو باہم متضاد ذہنیتوں کا مظہر ہیں، سودی نظام عصر حاضر کی سب سے بڑی لعنت ہے۔ اسلام نے اسی لیے سود کو قطعاً حرام اور زکوۃ کو واجب قرار دیا۔ ربا(سود) سے محنت (LABOUR) اور خطرے (.RISK) کے بغیر زیادہ سے زیادہ دولت اپنی تجوریوں میں بھرنے کا جنوں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس زکوۃ خطرات اور مشکلات کا مقابلہ کر کے سخت محنت سے کمائے ہوئے پیسے میں بھی دوسروں کو حصہ دار بنانے کا ایک نظام ہے۔ ایک صرف "لینے" میں ہی مسرت حاصل کرتا ہے دوسرا "دینے" کی لذت سے آشنا ہوتا ہے۔

آج کل معیشت اور اقتصاد کی اصطلاحوں میں بات کرنا وقت کی ضرورت بن گیا ہے۔ نظام معیشت کے لیے گردش زر (CIRCULATION OF WEALTH) کو اب آب حیات سمجھا جانے لگا ہے۔ اسلام نے اپنے بہت سے احکام کے ذریعے اس گردش زر کا انتظام کیا ہے، زکوۃ ان میں سے ایک ہے۔

زکوۃ دولت کو منجمد رکھنے کی بجائے، سرمایہ کاری کی ترغیب دیتی ہے، جو مال ایک سال تک زائد از ضرورت پڑا رہے، اس پر زکوۃ لگتی ہے اور اگر وہ سال گزرنے سے پہلے کسی تجارت وغیرہ میں لگا دیا جائے، تو اس پر زکوۃ نہیں ہو گی۔ بلکہ صرف اس کے منافع پر ہو گی۔ اس طرح زکوۃ نہ صرف ہمارے روحانی تزکیہ کا سبب بنتی ہے کہ وہ ایک عبادت ہے، بلکہ ہماری معاشرت اور معیشت کے بہت سے روگوں کا علاج بھی بہم پہنچاتی ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ زکوٰۃ آدمی کے مال میں سے "کم از کم" لینے کے اصول پر فرض ہے، زکوۃ کے علاوہ نفلی صدقات اسلامی تعلیمات کا ایک نمایاں باب ہیں۔ سب سے بڑھ کر قرآن کریم نے یہ معیار دیا ہے کہ ضرورت سے زائد سب محتاجوں پر خرچ کر دو اور "ضرورت سے زائد" کا تعین کون کرے گا؟ عقیدہ توحید اور عقیدہ آخرت کے اصل اثرات ظاہر ہونے کا مقام یہی ہے۔ نبی کریم ﷺ، صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ اور ان میں سے بھی خصوصاً حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت علیؓ نے

Marfat.com

اس کی عملی مثالیں قائم کر دیں کہ حکمران ہوتے ہوئے بھی خود اپنی خوراک ' لباس اور مکان وغیرہ کا معیار زندگی اس سے اونچا نہیں ہونے دیا جو وہ اپنی رعیت کے افراد کو کم از کم دے سکتے تھے۔

روزہ

روزے کے معنی

دین اسلام میں تیسری بنیادی عبادت " روزہ " ہے۔ روزے کے لیے اصل عربی لفظ " صوم " ہے اور اس سے مصدر " صیام " ہے جس کے معنی ہوتے ہیں " روزہ رکھنا "۔ قرآن و حدیث میں یہ دونوں لفظ " صوم اور صیام" استعمال ہوئے ہیں۔ "روزہ" بھی ایک فارسی لفظ ہے اور بعض دوسری اصطلاحات کی طرح یہ لفظ بھی اسی طرح " صوم " کے ہم معنی اور مترادف ہے۔

اسلامی اصطلاح کے طور پر روزے کا مطلب ہے فجر سے لے کر مغرب تک کھانے ' پینے اور فعل جنسی سے مکمل اجتناب ' اسلام میں صوم (روزہ) کی بہت سی اقسام ہیں ' جن کی تفصیل " کتاب و سنت " سے معلوم ہوتی ہے ' بعض روزے واجب(فرض) ہوتے ہیں۔ مثلاً رمضان اور کفارہ یا نذر کے روزے ' بعض دنوں میں روزہ رکھنا مستحب(بہتر) ہے اور بعض دنوں میں روزہ رکھنا ممنوع ہے۔ جن روزوں کو اسلامی عبادات میں ایک " رکن" کی حیثیت حاصل ہے ' اس سے مراد ہیں " صیام رمضان" یعنی رمضان مبارک کے پورے مہینے کے روزے رکھنا ' یہی وجہ ہے کہ بنیادی اسلامی عبادت اور اسلام کے ایک " رکن " کی حیثیت سے جب لفظ " روزہ " بصیغہ واحد بھی بولا جاتا ہے۔ تو اس سے ماہ رمضان کے روزے ہی مراد ہوتے ہیں۔

Marfat.com

روزے کی اہمیت

روزے کی اہمیت اور فرضیت کو سمجھنے کے لیے حسب ذیل امور سامنے رکھئے:

قرآن کریم میں واضح الفاظ میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے:

كُتِبَ عَلَيكمُ الصيام (روزے رکھنا تم پر فرض کر دیا گیا ہے البقرۃ:۱۸۳)

قرآن کریم نے روزوں کے لیے ماہ رمضان کا تعین کر دیا ہے اور اس کی وجہ بھی بتا دی ہے کہ رمضان المبارک کا نزول قرآن سے تعلق اسے یہ اہمیت دیتا ہے۔

قرآن کریم نے روزے کے تمام بنیادی ضروری احکام (مثلاً سفر یا بیماری اور اوقات روزہ وغیرہ) بیان کر دیے ہیں۔

رمضان کے روزے پہلی دفعہ سن ۲ھ میں فرض ہوئے تھے ۔ اس وقت سے لیکر آخر تک نبی کریم ﷺ نے ہر سال نہ صرف روزے رکھے اور رکھائے بلکہ نماز اور زکوۃ کی طرح روزے کو بھی ایک اجتماعی نظام کی صورت دی ۔ اس کی سب سے نمایاں خصوصیات:(۱) سحور (سحری کھانے کے لیے اٹھنا (۲) قیام اللیل (رات کو قرآن کریم سنانے کے لیے زائد رکعات نماز پڑھنا ' جسے اب ہم تراویح کہتے ہیں) (۳) صدقہ الفطر (رمضان کے اختتام پر ضرورت مندوں کو " روٹی" بہم پہنچانے کی مہم اور (۴) عیدالفطر (کی محض تقریبات نہیں بلکہ نماز) کا اہتمام ہیں ۔

رمضان شریف قمری کیلنڈر کا مہینہ ہے اور اس کے آغاز اور اختتام کا دارومدار رویت ہلال (چاند دکھائی دینے) پر ہے آنحضورؐ نے نہ صرف اس رویت کے بارے میں بلکہ روزے کے دیگر ضروری احکام اور اس کے مقاصد کو بھی نہایت وضاحت سے سمجھایا' نماز اور زکوۃ کی طرح روزے کی ان تفصیلات سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔

قرآن کریم میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ روزہ پہلی امتوں میں بھی ایک فرض عبادت کے طور پر رائج تھا اور آج بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے لیکن اسلامی روزے میں یوں تو اور بھی بہت سی زائد خوبیاں ہیں مگر سال کا پورا ایک مہینہ اور وہ بھی اجتماعی

Marfat.com

نظم کے ساتھ روزے رکھنے کی تو دنیا بھر میں کہیں مثال نہیں ملتی۔

رمضان المبارک اپنے اس اجتماعی رنگ کی وجہ سے تمام عالم اسلام میں " نیکی کا میلہ " بن جاتا ہے۔ محلوں سے لیکر جھونپڑیوں تک اور شہروں سے لیکر دور افتادہ گاؤں تک ہر جگہ رمضان المبارک اپنی ایک شان کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ رمضان المبارک میں روزہ رکھنے کے لیے ایک مناسب اور سازگار ماحول پیدا ہو جاتا ہے اور نہیں تو آدمی عار کے خوف سے بھی روزہ رکھ لیتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ چیز بھی اس کے اندر کسی تبدیلی کا باعث بن جائے۔

روزے کے مقاصد

کھانے پینے سے بچنا روزے کی ظاہری صورت ہے، اگرچہ یہ بھی ضروری ہے مگر کتاب وسنت سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ دار کو ہر طرح کی بُری باتوں سے بچنا ضروری ہے۔ آنحضورﷺ نے تو صاف فرمایا کہ :- من لم یدع قول الزور والعمل به فلیس لله حاجة فی ان یدع طعامه و شرابه " جس نے جھوٹی بات اور اس پر عمل کو ترک نہ کیا تو اللہ تعالیٰ کو اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا اور پینا چھوڑ دے " کم من صائمٍ لیس من صیامه الا الظما- " کتنے ہی ایسے روزہ دار ہوتے ہیں جنہیں ان کے روزوں سے سوائے پیاس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

یہ بھی یاد رکھیے کہ روزہ اور رمضان المبارک صرف سلبی (NEGATIVE) پہلو نہیں رکھتے کہ جس میں صرف " مت کرو " یا (DON'TS) ہی پر زور ہو۔ ان کا ایک ایجابی (POSITIVE) پہلو بھی ہے۔ یہاں بہت سی نیکیوں کے لیے " ضرور کرو " (DO'S) بھی موجود ہے۔ نماز، نوافل، تلاوت قرآن، خیرات اور صدقات، الغرض اس مہینے میں ہرطرح کی نیکی بکثرت کرنے اور ہر طرح کی برائی سے باز رہنے کے احکام دیے گئے ہیں۔

روزے کے عام فوائد مثلاً صحت پر اچھے اثرات، جفاکشی اور سخت کوشی کی

Marfat.com

تربیت ' غریبوں کی بھوک کا احساس وغیرہ وغیرہ یہ سب باتیں اپنی جگہ درست اور بجا ' مگر دوسری عبادات کی طرح روزہ بھی اپنے رب سے براہ راست رابطے کی ایک صورت ہے ۔ روزے کی حالت میں آدمی کو ہر وقت یہ احساس ہوتا ہے اور ہونا چاہیے کہ اللہ اس کے قریب ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ علیحدگی میں بھی ' جہاں اسے کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا ۔ ہرگز کھانے پینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا ۔ یہی ہے اپنا احتساب خود کرنا جس کی بنا پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا :- من صام رمضان ایماناً و احتسابا غفرله ما تقدم مه ذنبه وما تأخر " جس نے ایمان اور احتساب کے ساتھ رمضان کے روزے رکھے اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف ہو گئے ۔

روزے کے متفرق احکام

مسافر یا بیمار یا کوئی اور " عذر شرعی " رکھنے والے مرد یا عورت کو رمضان میں فوت ہو جانے والے روزوں کی قضاء بعد میں دینا یعنی قضا روزے رکھنا اسی طرح واجب ہے جس طرح خود رمضان کے روزے رکھنا ضروری ہیں۔

رمضان کے روزے رکھ کر جانتے بوجھتے ہوئے توڑنے سے ساٹھ دن کے روزے رکھنا واجب ہو جاتا ہے ۔ بھول اور نسیان سے کچھ کھا لینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا ۔ اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کے احترام کی دیدہ دلیری سے خلاف ورزی کرنا سخت گناہ ہے ۔

کفارہ اور نذر کے روزے بھی قضا روزوں کی طرح واجب ہوتے ہیں ۔ ہر قمری مہینے کی ۱۳ ' ۱۴ ' ۱۵ (ایام بیض) ۹ ذی الحج (حج کا دن) اور ہر سوموار اور جمعرات کو روزہ رکھنا مستحب (یعنی اچھا اور بہتر) ہے ۔ دونوں عیدوں کے دن ' ایام تشریق ۱۱ ' ۱۲ ' ۱۳ ذی الحجہ اور صرف ہر جمعہ کے دن ' روزہ رکھنا جائز نہیں ہے ۔ روزوں کی ان اقسام کے اپنے کچھ احکام اور مسائل ہیں ۔ یہاں ہمارا مقصد صرف آپ کو روزے کی اہمیت' اس کے ضروری اور متفقہ احکام اور روزے کے مقاصد اور اغراض سے آگاہ کرنا تھا۔

Marfat.com

حج

حج کے معنی

ہماری چوتھی بنیادی عبادت حج ہے ' حج کے لفظی معنی زیارت کا ارادہ کرنا 'کسی کے پاس بار بار جانا ہیں ۔ لفظ حجۃ کے معنی " برس" اور " سال" بھی ہیں ۔ اس طرح حج کے لفظی معنی بنتے ہیں " سالانہ زیارت" عربی میں اسی لیے حج کے دنوں کو " موسم حج" بلکہ بعض دفعہ صرف " موسم" بھی کہتے ہیں ۔ حج کا یہ نام اس کے ہر سال آنے کی بنا پر رکھا گیا ہے۔

اسلامی اصطلاح کے طور پر حج کا مطلب ہے " ایام حج میں خانہ کعبہ کی زیارت کو جانا اور تمام مناسک حج پورے کرنا " ۔ اسلامی بنیادی عبادت کے طور پر حج ہر صاحب استطاعت مسلمان پر زندگی میں ایک دفعہ واجب ہے ۔ مندرجہ بالا عبارت میں " ایام حج"، " خانہ کعبہ "، " مناسک "، " استطاعت " اور " ایک دفعہ" کے الفاظ غور طلب ہیں اور تشریح طلب بھی ۔

"ایام حج" سے مراد قمری تقویم کے آخری مہینے ذوالحجہ کی ۸ سے ۱۳ تاریخ تک کے دن ہیں ۔ اصل حج کا دن تو ۹ ذوالحجہ ہے مگر حج کے تمام مناسک مذکورہ تاریخوں میں پورے کیے جاتے ہیں ۔ ایام حج کے علاوہ خانہ کعبہ کی زیارت کو " عمرہ " کہتے ہیں۔

"کعبہ " مکہ مکرمہ کے اس "کمرہ نما " مرکز عبادت کو کہا جاتا ہے ۔ جس کی بنیاد آج سے قریباً چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رکھی تھی ۔ اسے "کعبہ " تو اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی لمبائی ' چوڑائی اور اونچائی قریب قریب برابر ہے۔ یعنی " مکعب نما"۔ اس کا دوسرا مشہور بلکہ اصل نام " بیت اللہ " (اللہ کا گھر) ہے ۔ اسے قرآن کریم میں " البیت الحرام" (عزت والا گھر) ، " البیت العتیق" (قدیم

Marfat.com

ترین گھر) اور بعض دفعہ صرف " البیت "(گھر) بھی کہا گیا ہے ۔ فارسی کے لفظ " خانہ" کے معنی گھر یا مکان ہی ہیں۔ اسی سے خانہ کعبہ (ترکیب توصیفی) اور خانہ خدا (ترکیب اضافی) ہمارے ہاں مستعمل ہیں ۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ عربی میں بیت عموماً رہائشی جگہ ' گھر کو نہیں بلکہ صرف مکان کو کہتے ہیں ۔ رہائشی مکان یا جگہ کو عربی میں "دار " کہا جاتا ہے ۔ اسی لیے کعبہ کو اللہ کی طرف نسبت دیتے ہوئے " دار اللہ " نہیں بلکہ بیت اللہ کہتے ہیں ' کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی خاص جگہ نہیں رہتا ' وہ تو سب جگہ ہے ۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس کا نام بیت اللہ اس لیے رکھا تھا کہ اس میں صرف اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کی جائے گی ۔ ان معنوں میں ہی ہم مسجد کو بھی اللہ کا گھر کہتے ہیں۔ اسی لیے مسجدوں کے بارے میں قرآن کریم میں آیا ہے : وان المساجد لله فلا تدعوا مع الله احداً - (" یقیناً مسجدیں صرف اللہ (کی عبادت) کے لیے ہیں ۔ پس اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو۔" الجن:۱۸)

مناسک حج سے مراد وہ تمام شرعی احکام ' رسوم اور قواعد و ضوابط ہیں جن کی حج میں پابندی کی جاتی ہے ۔ اس میں میقات ' احرام ' طواف ' سعی ' عرفہ ' رمی ' قربانی وغیرہ امور شامل ہیں۔

استطاعت کا مطلب ہے کہ آدمی ہر لحاظ سے سفر حج پر جانے اور واپس آنے کے قابل ہو ۔ اس میں سفر کے مکمل اخراجات (بلکہ اس دوران اپنے گھر والوں کے اخراجات بھی) کے علاوہ صحت ' راستے کا امن وغیرہ شامل ہیں ۔ اگر مالی استطاعت ہو مگر دوسری رکاوٹیں نہ جانے دیں تو ایسے آدمی کو وصیت کر جانا چاہیے کہ اس کی موت کی صورت میں کوئی دوسرا آدمی (مرنے والے کے خرچ پر) اس طرف سے حج کرے ۔ اس حج کو حج بدل کہتے ہیں ۔ اسلامی عبادات میں سے " بدل" کا حکم صرف حج کے لیے ہے ۔

" ایک دفعہ " کا مطلب واضح ہے ' حج مسلمانوں پر زندگی میں صرف ایک دفعہ واجب ہے ۔ ایک سے زیادہ دفعہ حج کا موقع ملے تو یہ بڑی سعادت ہے ۔ مگر حکومت

Marfat.com

کی طرف سے دوسری دفعہ حج پر پابندی کو یہ جھوٹ بول کر توڑنا کہ "پہلی دفعہ حج پر جا رہا ہوں"، سخت گناہ ہے۔ پہلے ہی قدم پر جھوٹ بولا تو "حاجی صاحب" آگے کیا کچھ نہیں کر گزریں گے؟

حج کی اہمیت :

اسلام کی بنیادی عبادت ہونے کے لحاظ سے حج کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے حسب ذیل امور سامنے رکھیے:-

قرآن کریم میں مسلمانوں پر حج کے فرض ہونے کا ذکر کرنے کے ساتھ ہی استطاعت کے ہوتے ہوئے حج نہ کرنے کو کفر کہا گیا ہے۔ و لله على الناس حج البيت من استطاع اليه سبيلا . ومن كفر فان الله غنى عن العالمين. "لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض ہے (اس کے) گھر کا حج اور جو کفرو انکار کرے تو اللہ تعالیٰ سب جہانوں سے بے نیاز ہے"۔ (آل عمران:۹۷)

حج ہی ایک ایسی عبادت ہے جو ملت ابراہیمی کا خاص شعار ہے اور یہی واحد عبادت ہے جو پچھلے تین چار ہزار سال سے تاریخی تسلسل کے ساتھ چلی آ رہی ہے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ لوگوں کو "حج کعبہ" کے لیے بلائیں۔

رسول اللہ ﷺ نے واضح طور پر حج کو بھی دوسری بنیادی عبادات کی طرح ان چیزوں میں شمار کیا، جن پر اسلام قائم ہے اور جن میں سے کسی ایک کا انکار یا ترک ایوان اسلام کو گرا دینے کی کوشش سمجھا جائے گا۔

حج کے مقاصد اور منافع

حج کے بہت سے مناسک حضرت ابراہیمؑ، ان کی بیوی ہاجر(۱) اور ان کے بیٹے

۱- لفظ ہاجر ہے جو ایک غیر عربی نام ہے۔ ہمارے ہاں ہاجرہ یا ہاجراں اس کی مستعمل صورت ہے۔

Marfat.com

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعض اعمال کا اعادہ (دہرانا) ہے مثلاً طواف ' سعی ' رمی' قربانی وغیرہ ۔ قرآن و سنت میں یہ بات واضح طور پر بیان ہوئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دین اسلام کو اپنے عظیم جد اعلی حضرت ابراہیمؑ کی قائم کردہ سنت کی بنیادوں پر دوبارہ زندہ کیا۔

حج کا ایک اہم مقصد اسی سنت ابراہیمیؑ کی تجدید کا عہد کرنا ہے ۔ یہ بات قابل غور ہے آج کی دنیا میں حضرت ابراہیمؑ ہی واحد شخصیت ہیں ' جن کی تعظیم اور احترام اس کرہ ارض پر بسنے والے انسانوں کی اکثریت کے دل میں ہے ۔ اس لیے کہ مسلمانوں کے علاوہ مسیحی اور یہودی بھی اس میں شامل ہیں اور دنیا کی غالب آبادی ان تین مذاہب کے ماننے والوں پر مشتمل ہے ۔ حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو اللہ کی وحدانیت (توحید) اور اس سے اخلاص تھا ۔ حج اس کی دائمی یادگار اور زندہ دعوت ہے ۔

انسان ایک جذباتی مخلوق ہے ۔ انسان فطرت میں سب سے قوی جذبہ "محبت" ہے ۔ انسان کسی کو دل دے کر اپنی ساری شخصیت کو اس کے آگے جھکا دینے میں ایک فطری لذت محسوس کرتا ہے ۔ انسانی محبت و عشق کی داستانوں میں اسی فطری جذبے کی حیرت انگیز جلوہ گری نظر آتی ہے ۔ بڑے صاحب جبروت بادشاہوں نے اپنے کسی محبوب کے قدموں پر اپنا سر رکھنے میں ایک لذت محسوس کی ۔ وہ نام نہاد محبت جو انسان سے اغوا اور قتل جیسے جرائم کراتی ہے ۔ وہ محبت نہیں ہوس اور شیطانی خواہشات ہوتی ہیں۔ اصل محبت تو گھل گھل کر مرنے میں ایک لذت پانے کا نام ہے ۔ اسی لیے عشق مجازی (عشق بتاں) کو عشق حقیقی (عشق خدا) کو پانے اور سمجھنے کی ابتدائی مثال قرار دیا جاتا ہے ۔ حج اسی محبوب حقیقی (اللہ جل جلالہ) کے حضور میں حاضری کی ایک صورت ہے۔ اہل دل کے لیے سفر حج درمحبوب پر حاضری دینے کے ذوق کی تسکین اور لذت درد کا ایک سامان ہے ۔ محبوب کی یاد کی لذت ہر جگہ اور ہر وقت ممکن ہے مگر جو لطف محبوب سے نسبت رکھنے والے مکان دیکھنے میں ہے وہ صرف یاد میں کہاں؟ یہیں

Marfat.com

آکر تصوف اور شاعری کے تخیل کی حدیں آپس میں ملتی ہیں۔

بہت سی خرابیوں کے گھس آنے کے باوجود حج ہمیشہ اہل صدق و طلب اور وارفتگان ذات سبحانی کا بہت بڑا اجتماع ہوتا ہے۔ کعبے کی پوری تاریخ میں اس قسم کے انسانوں کا سب سے پہلا بڑا اجتماع حجۃ الوداع تھا' جس میں خود حبیب خدا ﷺ اپنے جاں نثاروں کو اپنے ساتھ لیے مناسک حج ادا فرما رہے تھے۔ بعد میں حاجیوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی (اور اب تو لاکھوں تک پہنچتی ہے) مگر وہ عشق و مستی غائب ہوتی چلی گئی ہے اور ہوتی چلی جا رہی ہے۔

دوسری عبادات کی طرح حج کے منافع اور مقاصد اور اس میں پوشیدہ حکمتوں کو جاننا اور سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ حج کی اہمیت کے مختلف پہلو جاننے کے لیے بھی اور اس لیے بھی کہ کس طرح آج مسلمانوں نے ان مقاصد کو نظرانداز کر رکھا ہے اور ان حکمتوں سے آنکھیں بند کر لی ہیں مثلاً (i) احرام کا لباس کس طرح شاہ و گدا کی تمیز مٹا دیتا ہے (اگرچہ کعبہ کے متولی ہمیشہ اس تمیز کو کسی نہ کسی رنگ میں برقرار رکھتے رہے ہیں آج بھی کعبہ کا دروازہ صرف بادشاہوں اور سربراہوں کے لیے کھولا جاتا ہے)(ii) دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک جگہ جمع ہو کر اپنے علمی و سیاسی اور معاشرتی مسائل پر بحث کا موقع ملتا ہے۔ (پرانے زمانے میں لوگ حج پر جا کر طلب علم کے لیے مہینوں اور برسوں وہاں قیام بھی کرتے تھے)۔ آج کل تو حج ایک مشینی عمل بن کر رہ گیا ہے۔ جانا' ایک رواں دواں پروگرام کے مطابق سب کاموں سے کم سے کم وقت میں فارغ ہونا اور واپس ہو جانا۔ بعض لوگ تو حج کو مسلمانوں کی ایک سالانہ کانفرنس ہی سمجھ لینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ حالانکہ حج ایک عبادت ہے۔ یہ کانفرنسوں کی طرح "نشستند' گفتند و برخاستند" والا معاملہ نہ ہے نہ ہونا چاہیے۔ حج کے تمام اصلی فوائد و مقاصد مثلاً مسلمانوں میں اتحاد و مساوات' باہمی خیر سگالی اور خیر خواہی' افہام و تفہیم وغیرہ اسی لیے حاصل نہیں ہو رہے کہ حج کو اللہ سے ربط کا ذریعہ نہیں سمجھا جاتا' جو تمام اسلامی عبادات کی اصل حکمت اور امتیازی شان ہے۔

Marfat.com

یہ تھا اسلام کی بنیادی عبادات ' نماز ' زکوۃ ' روزہ ' حج ' کا مختصر بیان ۔ اللہ کے ساتھ براہ راست ربط کی صورت ہونے کے باعث یہ عبادات بذات خود ایک "مقصد" ہیں ۔ ان کی ظاہری صورت پر عمل کرنا اور ان کی پابندی کرنا بھی برکات سے خالی نہیں اور اسی لیے یہ ظاہری پابندی بھی واجب ہے اور یہ وجوب قرآن و سنت سے ثابت ہے ۔ اسلام کے بہت سے مقاصد ان عبادات کی ظاہری بجا آوری سے بھی پورے ہو جاتے ہیں ۔ عبادات کی ظاہری اہمیت کو گھٹانا اور اس کے فلسفہ و حکمت اور اس کے ذریعہ تربیت اسلامی ہونے پر ہی زور دینا گاڑی کو گھوڑے کے آگے جوتنے والی بات ہے۔ رہا ظاہری پابندی کے ساتھ ساتھ ان عبادات کی باطنی حکمتوں پر غور و فکر اور ان کے حاصل کرنے کی کوشش کرنا ' تو اس سے انکار کرنے والوں کی جہالت میں کیا شک رہ جاتا ہے ؟

☆☆☆

Marfat.com

جہاد

اسلام الہامی مذاہب کے سلسلے کی تکمیلی کڑی ہے اور تمام عالم انسانی کے لیے ربانی پیغام اور ضابطہ حیات ہے ۔ چونکہ اسلام کا دیگر مذاہب پر غلبہ ' ولولہ جہاد اور بھرپور تیاری کے بغیر ممکن نہ تھا اس لیے اللہ تعالی نے جہاد کے احکام اپنی کتاب پاک میں نازل فرمائے اور رسالتمآب ﷺ نے اپنے قول و عمل سے ان احکام کی تشریح فرمائی۔

جہاد کا مفہوم:

لغت عرب میں اسلام کے معروف معنی امن و سلامتی کے ہیں اور امن و آشتی کے اس مقصد جلیل کو حاصل کرنے کا وسیلہ جہاد ہے ۔ جہاد کے لغوی معنی ہیں کمال درجہ کوشش کرنا اور قرآن و سنت کی اصطلاح میں اس کے معنی ایسی بھرپور سعی وجہد کے ہیں جو سچائی کی راہ میں یا اسلام کی سربلندی کے لیے کی جائے۔

قرآنی دلائل کی قوت سے دوسرے مذاہب پر اسلام کی فضیلت یا برتری ثابت کرنا جہاد بالقرآن ہے ۔ اگر یہ سعی بلیغ زبان سے کی جائے تو جہاد باللسان کہلائے گا اور زور قلم سے کی جائے تو اسے جہاد بالقلم کہیں گے ۔ اگر انسان اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پانے کی کوشش کرے تو یہ جہاد بالقلب ہے ۔ اگر اسلام کے دشمنوں سے نمٹنے کی بندہ مومن تدبیر کرے اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کر تو جہاد بالمال ہے او راگر اس راہ میں جان کی بازی لگادی جائے تو یہ جہاد بالنفس ہے ۔جہاد کے وسیع تر مفہوم کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو مسلمان کی ہر صبح و شام بلکہ ہر لمحہ اور ہر لحظہ حق اور اعلاء کلمۃ الحق کی خاطر بسر ہوتا ہے ۔ پس جہاد کا مفہوم اگر اسے دشمنوں کے مقابلے میں لڑنے

Marfat.com

اور خون بہانے تک محدود کر دیا جائے تو یہ بڑی زیادتی ہو گی ۔

اسلام کی تعلیمات کے بنیادی مآخذ قرآن مجید میں جہاد کے بارے میں پہلے پہل جو حکم نازل ہوا ' اس کے الفاظ پر غور فرمایئے اور دیکھیئے کہ کن لوگوں سے کن حالات میں اللہ تعالی نے جنگ کرنے کی اجازت دی ہے ۔ ارشاد ربانی ہے:-

اُذِنَ للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللّٰہ علی نصرھم لقدیر ۔ الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللّٰہ ." جن لوگوں سے جنگ کی جارہی ہے انہیں لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ ان پر ظلم ہوا ہے اور اللہ تعالی ان کی مدد پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے بے قصور نکالے گئے ان کا قصور صرف یہ تھا کہ اللہ تعالی کو اپنا پروردگار کہتے تھے ۔

اسلام کی تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ کفار مکہ نے السابقون الاوّلون (اوّلین مومنین) کو کتنی اذیتیں دیں ۔ ان کو ستانے کے لیے کیسے کیسے انداز ظلم وستم ایجاد کئے ۔ حبیب خدا ﷺ کو کیسی تکلیفیں دیں اور انہیں جلا وطن کرنے ' نظر بند کرنے بلکہ قتل کر دینے کے منصوبے باندھے ۔ یہاں تک کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ خدا کے حکم سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے ۔ وہاں حضورؐ نے مہاجرین و انصار کے تعاون سے ایک نئے معاشرے ' نئے تمدن اور نئی ریاست کی داغ بیل ڈالی ۔ کفار مکہ نے یہاں بھی انہیں آرام سے نہ رہنے دیا۔ پس اللہ تعالی نے اپنے حبیبؐ اور ان کے صحابہ کرام کو اپنی جان و مال ' عزت و ناموس اور دین کی حفاظت کی غرض سے جہاد کی اجازت دے دی۔

اگرچہ اسلام نے سب معاملات میں تحمل ' بردباری اور رواداری کی تعلیم دی ' لیکن اسلام نے انہیں کسی ایسے حملے کو برداشت کرنے کی تعلیم نہیں دی جو اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں پر اسلام کے سوا کوئی دوسرا نظام مسلط کرنے کے لیے کیا جائے ۔ اسلام نے سختی کے ساتھ حکم دیا کہ جو کوئی تمہارے انسانی حقوق چھیننے کی کوشش کرے ' تم پر ظلم وستم ڈھائے ' تمہاری جائز ملکیتوں سے تم کو بیدخل کرے ' تم سے ایمان

Marfat.com

وضمیر کی آزادی سلب کرے ، تمہارے اجتماعی نظام کو درہم برہم کرنا چاہے اور محض اس وجہ سے درپے آزار ہو کہ تم مسلمان ہو تو اس کے مقابلے میں ہرگز کمزوری نہ دکھاؤ اور اپنی طاقت اس کے ظلم کو روکنے میں صرف کردو ۔ جہاد اگرچہ فرض کفایہ ہے مگر جب اعلانِ عام ہو جائے کہ دشمن نے ایک اسلامی مملکت پر حملہ کیا ہے تو پھر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے اور ہر مسلمان پر جو جہاد کی قدرت رکھتا ہو ، فرداً فرداً اس پر فرضیت جہاد ہو جاتی ہے۔

جہاد ، قرآن کی نظر میں

و حرضِ المؤمنین علی القتال (اے پیغمبرؐ ! مومنین کو جنگ پر اکسایئے)۔

الذین امنوا یقاتلون فی سبیل الله والذین کفروا یقاتلون فی سبیل الطاغوت. (مومن اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور کافر شیطان کی راہ میں قتال کرتے ہیں)۔

جاھدوا باموالکم و انفسکم (اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرو)

و جاھدوا حق جھادہ .(جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے)۔

فضل الله المجاھدین باموالھم و انفسھم علی القاعدین درجة .(اللہ تعالی نے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والوں کو گھر بیٹھنے والوں پر درجہ کے اعتبار سے ترجیح دی ہے ۔

وقاتلوھم حتی لا تکون فتنة و یکون الدین کله للّٰه . (تم اہل کفر سے اس وقت تک لڑو کہ فتنہ مٹ جائے اور سارے کا سارا دین اللہ کے لیے ہو جائے ۔

جہاد ، حدیث کی رو سے

☆ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانا اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنا سب سے اچھا عمل ہے ۔

☆ خدا کی راہ میں ایک دن ڈٹ جانا دوسری جگہوں میں گزارے ہوئے ہزاروں دنوں سے بہتر ہے ۔

Marfat.com

☆ جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔
☆ جہاد فی سبیل اللہ کی ایک صبح یا شام دنیا کی ان تمام نعمتوں سے افضل ہے جن پر سورج نکلتا اور ڈوبتا ہے۔
☆ جہاد فی سبیل اللہ میں ایک دن اور رات کی پاسبانی کرنا ایک ماہ کے روزوں اور شب بیداری سے بہتر ہے۔
☆ جب تمہیں جہاد کے لیے بلایا جائے تو تم اپنے گھروں سے نکل پڑو
☆ وہ مومن جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتا ہے سب سے افضل ہے
☆ جس شخص کے پاؤں راہ خدا میں غبار آلود ہو جائیں اسے جہنم کی آگ نہ چھوئے گی۔
☆ جنت میں جانے کے بعد کوئی شخص دنیا میں لوٹنا پسند نہیں کرے گا مگر شہید اس کی آرزو کرے گا کہ وہ دنیا میں دس مرتبہ جائے اور دس مرتبہ مارا جائے کیونکہ وہ شہادت کا اجرو ثواب جانتا ہے۔
☆ سب سے پہلے جنت میں جانے والوں میں شہید بھی ہوں گے۔

☆☆☆

Marfat.com

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

Marfat.com

سیرتِ طیبہ کے مآخذ اور پاکستانی زبانوں میں تالیفاتِ سیرت

۱- سیرت کا لغوی مفہوم :

لفظ ... سیرۃ (عربی میں یہ لفظ اسی طرح لکھا جاتا ہے ' مگر اردو ' فارسی میں اسے لمبی . ت ' کے ساتھ لکھنے کا عام رواج ہو گیا ہے - اس لئے اس یونٹ - بلکہ کتاب -- میں بھی یہی املاء (سیرت) اختیار کی گئی ہے)-

یہ لفظ - عربی زبان کے جس مادے اور فعل سے بنا ہے ' اس کے لفظی معنی ہیں - چل پڑنا 'راستہ لینا ' رویہ یا طریقہ اختیار کرنا ' روانہ ہونا ' عمل پیرا ہونا وغیرہ - اس طرح سیرت کے معنی حالت ' رویہ ' طریقہ ' چال 'کردار ' خصلت اور عادت کے ہیں - صورت کے ساتھ مل کر یہ لفظ باطن کی صورت یا حقیقت کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً صورت و سیرت کہنا ' کسی کا شعر ہے :

سیرت کے ہم غلام ہیں ' صورت ہوئی تو کیا
سرخ و سفید مٹی کی مورت ہوئی تو کیا ؟

اس سے ہم اردو میں تعمیر سیرت ' سیرت سازی' پختگی سیرت ' نیک سیرت' بدسیرت اور حسن سیرت وغیرہ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں یہ لفظ (سیرۃ) صرف ایک جگہ آیا ہے۔ یعنی سنعیدھا سیرتھا الاولی (طه : ۲۱) کہ " ہم اسے اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے"۔ اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا (لاٹھی) کا سانپ بن جانے کے بعد دوبارہ اصلی حالت

Marfat.com

میں آجانے کی طرف اشارہ ہے۔ اس میں - جیسا کہ آپ نے دیکھا - لفظ "سیرت" حالت اور کیفیت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

لفظ "سیرت" واحد کے طور پر اور بعض دفعہ اپنی جمع "سیر" کے ساتھ، اہم شخصیتوں کے سوانح حیات اور اہم تاریخی واقعات کے بیان کے لئے بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ مثلاً "سیرت عائشہ" یا "سیرت المتأخرین" (یہ کتابوں کے نام ہیں) وغیرہ۔ کتب فقہ میں "السیر" جنگ اور قتال سے متعلق احکام کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے بیان میں غزوات (کفار سے جنگوں کا ذکر) خاصی اہمیت رکھتا ہے، اس لئے ابتدائی دور میں کتب سیرت کو عموماً "مغازی و سیر" کی کتابیں کہا جاتا تھا۔ لفظ مغازی بھی "مغزیٰ" کی جمع ہے۔ جس کے معنی ہیں جنگ (غزوہ) کی جگہ یا وقت، بعد میں اس کے لئے سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترکیب استعمال ہونے لگی۔

سیرت کا اصطلاحی مفہوم :

اس طرح ایک طویل تاریخی عمل کے بعد اب لفظ "سیرت" ایک اصطلاح بن گیا ہے اور اب اس سے صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کے جملہ حالات کا بیان مراد لیا جاتا ہے ۔ کسی اور منتخب شخصیت کے حالات کے لئے "سیرت" کا استعمال قریباً متروک ہو گیا ہے۔ اب اگر مطالعہ سیرت، کتب سیرت وغیرہ کا ذکر کیا جائے تو چاہے ساتھ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" نبیؐ "پیغمبر" یا "مصطفیٰ" وغیرہ الفاظ نہ بھی ہوں، تب بھی اس سے مراد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہی لی جاتی ہے بلکہ بعض دفعہ تو لفظ "سیرت" کو کتاب کے مصنف کی طرف مضاف کر کے بھی یہی (اصطلاحی) معنی لئے جاتے ہیں مثلاً "سیرت ابن ہشام" (کتاب) کا مطلب ابنِ ہشام (آدمی) کے حالاتِ زندگی نہیں ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات ہیں جو ابنِ ہشام (مصنفِ کتاب) نے جمع کیے ہیں۔ اسی سے ہمارے زمانے میں - آج

Marfat.com

کل - جلسۂ سیرت ' سیرت کانفرنس ' مقالاتِ سیرت ' اخبارات و رسائل کے سیرت نمبر - وغیرہ بکثرت الفاظ استعمال ہونے لگے ہیں۔ ان تمام تراکیب میں لفظ "سیرت" کے معنی ہمیشہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے بعض دفعہ - ادب و احترام کے اظہار کے لئے - اس لفظ کے ساتھ کسی صفت کا اظہار کر دیتے ہیں۔ مثلاً سیرت طیبہ ' سیرت پاک وغیرہ۔

اس یونٹ - بلکہ اس کتاب - میں بھی لفظ "سیرت" اپنے ان ہی معروف اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔ اب ہم جہاں بھی لفظ سیرت استعمال کریں گے اس سے مراد ہو گا "سیرتِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

مطالعۂ سیرت کی ضرورت و اہمیت :

مسلمانوں کے لئے تو مطالعۂ سیرت ایک اہم دینی فریضہ ہے لیکن غیر مسلم بھی مطالعۂ سیرت کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ البتہ ہر ایک کے لئے اس مطالعے کے لئے غرض و غایت جدا جدا ہے۔ غیر مسلم (اہل علم) کا سیرت نبوی پر توجہ دینا دو وجہ سے ہے:-

اولاً: اس لئے کہ وہ اس جلیل القدر داعیٔ دینؐ کے حالاتِ زندگی معلوم کرنا چاہتے ہیں جس کی تعلیم نے تیئس برس کی قلیل مدت کے اندر دنیا میں ایک ایسا انقلاب برپا کیا جس کی تاریخ میں کہیں نظیر نہیں ملتی۔ اور جس ہادیؐ نے عرب قوم کی ناگفتہ بہ حالت کی کایا ہی پلٹ دی۔ اور ایک ایسی امت تیار کر دی جس کے شاندار کارنامے مؤرخینِ عالم کے لئے نہایت دلچسپ اور موجبِ صد حیرت ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے مطالعۂ سیرت ایک علمی مشغلہ ہے۔

ثانیاً: بعض (بلکہ بیشتر) غیر مسلم ' اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنے بغض و عناد کے اظہار کے لیے بھی اپنے مطالعہ سیرت کو ایک ذریعہ بناتے اور واقعات کو توڑ مروڑ کے اپنے زہریلے ڈنگ چلانے کے مواقع تلاش کرتے

Marfat.com

ہیں۔ اس طرح وہ خود گمراہ ہوتے اور دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں۔

مسلمانوں کے لئے مطالعۂ سیرت محض ایک علمی مشغلہ نہیں بلکہ ایک اہم دینی ضرورت ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے نہ صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور فرماں برداری مسلمانوں پر واجب اور فرض قرار دی ہے بلکہ (مسلمانو! تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی میں ایک اچھا نمونہ موجود ہے) کہہ کر مسلمانوں کے لئے ضروری ٹھہرا دیا کہ وہ اس بات کو دریافت کریں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ معلوم کرنے کے لئے ہمیں لا محالہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کی طرف رجوع کرنا ہو گا۔

ایک مسلمان کے لئے مطالعۂ سیرت کی ضرورت و اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اسلام کو صحیح طور پر سمجھنے اور دوسروں کو سمجھانے کے لئے سیرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش نظر رکھنا اور پیش کرنا ضروری ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں (خصوصاً ابتدائی مکّی دور میں) لوگوں کو اسلام کی طرف کھینچنے کا باعث دو ہی چیزیں تھیں۔ قرآن اور شخصیتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم یعنی کلام پاک اور سیرت پاک کی تاثیر - آج بھی ٹھیک ٹھیک مسلمان بننے کے لئے اور دوسروں کو حقیقی اسلام سمجھانے کے لئے ان ہی دو چیزوں کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے - در اصل یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآنی تعلیمات کا بہترین عملی نمونہ ہیں۔ آپؐ نے کسی ایسی بات کی تعلیم نہیں دی جس پر خود عمل کر کے نہ دکھا دیا ہو۔

تالیفات سیرت کی کثرت

مطالعۂ سیرت کی ضرورت اور اہمیت کا نتیجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر بے حد و بیشمار کتابیں دنیا کی مختلف زبانوں میں لکھی جا چکی ہیں اور یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ سائنسی مضامین کے برعکس سیرت کا مواد ایک جامد مواد ہے یعنی اس میں اب - معلومات اور حالات کی حد تک - کسی مزید اضافے کی تو کوئی گنجائش

Marfat.com

نہیں - بس اندازِ بیان، طریقِ فکر، زاویۂ نگاہ اور اسلوبِ ترتیب کے فرق سے سینکڑوں تالیفات وجود میں آ چکی ہیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی (برطانیہ) کے پروفیسر مارگولیوتھ (D.S. Margoliouth) نے ۱۹۰۵ء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات پر اپنی کتاب "محمدؐ اور ظہور اسلام (Muhammad and the Rise of Islam) کے نام سے لکھی تو اس کا آغاز ان الفاظ سے کیا تھا (جن کا ترجمہ یہ ہے کہ)" حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سیرت نگاروں کا ایک طویل سلسلہ ہے جس کو ختم کرنا ناممکن ہے لیکن اس میں جگہ پانا باعث شرف ہے۔

تصنیف و تالیفاتِ سیرت کا یہ سلسلہ جس کی طرف پروفیسر موصوف نے اشارہ کیا بدستور جاری ہے اور جاری رہے گا۔ آج سے چند سال پہلے اقوام متحدہ کے ثقافت و تہذیب اور تعلیم و تمدن سے متعلق ایک ذیلی ادارہ یونیسکو UNESCO نے دنیا بھر کی مشہور شخصیتوں پر لکھی گئی کتابوں کا ایک جائزہ پیش کیا تھا۔ اس کی رپورٹ میں یہ لکھا گیا کہ جس قدر کتابیں نبیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لکھی جا چکی ہیں، اس کا عشر عشیر (یعنی دسواں بلکہ بیسواں - یا اس سے بھی کم حصہ) بھی کسی ایک شخصیت کے بارے میں نہیں لکھا گیا۔ اب تو کتب سیرت کی الگ فہرستیں اور کتابیات سیرت پر مستقل اور علیحدہ ضخیم کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں کتبِ سیرت کی ایک نمائش منعقد ہوئی تھی جس میں پیش کردہ کتب کی فہرست کالج نے شائع کی تھی اس میں دینا کی گیارہ زبانوں کی آٹھ سو سے زیادہ کتابیں مذکور ہیں۔۔ چند برس پہلے بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان نے "ارمغان حق" کے نام سے دو جلدوں میں کتب سیرت کی فہرست شائع کی ہے جس میں پندرہ زبانوں کی دو ہزار سے زائد کتابیں مذکور ہیں ۱۹۸۵ء - ۱۹۸۴ء میں اسلام آباد میں حکومتِ پاکستان نے جو نمائش کتب سیرت منعقد کرائی تھی (بر موقع سیرت کانفرنس) اس میں کتابوں کی تعداد تین ہزار سے متجاوز تھی۔ سال ۱۹۸۶ء -۱۹۸۵ میں حکومتِ پاکستان نے بین الاقوامی نمائش کتبِ سیرت منعقد کرائی جس میں نہ صرف چودھویں صدی ہجری میں لکھی جانے

Marfat.com

والی کتب سیرت رکھی گئی تھیں جن کی تعداد چار ہزار سے متجاوز تھی۔ ایسی نمائش یقیناً اہل علم و ایمان کے دیدہ و دل کے لئے سامان صد تجلی ہے۔

سیرت طیبہ کے مآخذ و مصادر

کسی علم - خصوصاً جس کا تعلق تاریخ سے ہو۔ اس کے مآخذ (واحد مأخذ) سے مراد وہ کتابیں (یا دیگر مواد مثلاً روایات' آثار قدیمہ وغیرہ) ہوتی ہیں جن میں اس علم کے متعلق سب سے پہلے بات کی گئی ہو۔ یا جن میں اس علم کے متعلق معلومات سب سے پہلے جمع کی گئی ہوں۔ کسی تاریخی شخصیت کے بارے میں معلومات کا اہم ماخذ وہ کتاب یا کتابیں ہوں گی جو اس کی زندگی میں لکھی گئی ہوں یا اس کے بعد قریب ترین زمانے میں لکھی گئی ہوں اور جن میں زیادہ سے زیادہ مواد یکجا جمع کیا گیا ہو یا اس مواد کے جمع کرنے میں علمی تگ و دو اور تحقیقی چھان بین سے کام لیا گیا ہو۔ اس لحاظ سے سیرتِ طیبہ کے اہم بنیادی مآخذ حسب ذیل بنتے ہیں :-

۱- قرآن مجید

۲- کتب حدیث

۳- تواریخ حرمین

۴- تاریخِ عالم یا تاریخ اسلام پر لکھی گئی اہم کتابیں

۵- مشاہیر واعلام کے طبقات(مشہور شخصیتوں کے حالات کی درجہ بندی کے لحاظ سے)

۶- خاص سیرت پر لکھی گئی اہم اور ابتدائی کتابیں۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ ان کتابوں (ماخذ) میں سے پہلی پانچ قسموں کا موضوع براہ راست سیرت اور صرف سیرت نہیں ہے یعنی ان کا بنیادی مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کے جملہ واقعات و حالات تفصیل کے ساتھ بیان کرنا نہیں ہے بلکہ سیرت کا کچھ نہ کچھ حصہ ان میں ضمناً بیان ہوا ہے لیکن جتنا بھی حصہ ان میں بیان ہوا ہے' اس کی صحت پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے اور مجموعی طور پر ان جملہ ماخذ و مصادر (واحد مصدر بمعنی منبع) سے حاصل ہونے والی معلومات کے ذریعے سے ہی کوئی

Marfat.com

جامع کتاب سیرت تیار ہو سکتی ہے۔ یہی کام ماخذ کی چھٹی قسم یعنی کتب سیرت میں کیا گیا ہے۔ البتہ صحیح معلومات کی فراہمی، علمی چھان بین، زمانۂ تالیف اور وسعتِ تفصیلات وغیرہ کی بناء پر کتبِ سیرت کی اہمیت کی درجہ بندی کی جا سکتی ہے۔ سیرتِ طیبہ کی ان مآخذ کی اہمیت اور ان کے تعارف سے متعلق حسبِ ذیل امور قابلِ توجہ ہیں۔

قرآنِ مجید

سیرت طیبہ کا اصل اور سب سے زیادہ صحیح اور مستند مأخذ قرآن مجید ہے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا وہ کلام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قریباً تئیس سال کے عرصے میں آہستہ آہستہ نازل ہوا۔ قرآنِ کریم جس طرح بذریعہ حفظ و کتابت محفوظ کر لیا گیا، وہ ایک الگ اور مستقل موضوع ہے۔ بہر حال مسلم اور غیر مسلم سب کے لئے سیرت طیبہ کا سب سے مستند اور سب سے اہم اور بلحاظ زمانۂ سیرت قریب ترین ماخذ قرآن کریم ہے۔ قرآن کریم دو طرح سے سیرت کے ماخذ کا کام دیتا ہے۔

(الف) اس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کے متعدد واقعات، غزوات اور بعض دیگر پیش آمدہ حالات کا ذکر ہے کہیں تفصیل موجود ہے اور کہیں اجمالی (مختصر) اشارات موجود ہیں۔ بعض لوگوں نے صرف قرآن کریم میں صراحۃً یا کنایۃً بیان کردہ واقعاتِ سیرت کی زبانی ترتیب و جمع سے سیرت پر کتابیں تالیف کی ہیں۔ مثلاً محمد عزت دروزہ کی کتاب سیرۃ الرسول (صورۃ مقتبسۃ من القرآن) جو دو جلدوں میں ہے۔

(ب) قرآن کریم میں وہ تمام تعلیمات ہیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً نافذ کیا۔ اسی طرح معاصر (ہم زمانہ) کفار کے بعض اعتراضات اور ان کے جوابات مذکور ہیں۔ قرآن کریم کی اس قسم کی آیات کی تفصیل اور زمانہ یا موقع نزول کے بارے میں سیرت طیبہ کے واقعات کی طرف رجوع کرنا ضروری ہو جاتا ہے (یہی کام مفسرین نے اہم تفاسیر میں سر انجام دیا ہے) گویا قرآن کریم سیرت طیبہ کے بارے

Marfat.com

میں کچھ تفصیلی معلومات بھی دیتا ہے اور اجمالی (عنوانات کی طرح) اشارات کے ذریعے سے واقعاتِ سیرت کی اصل کی نشاندہی کر کے اس کی تفصیلات جاننے پر آمادہ بھی کرتا ہے۔

کتبِ حدیث

قرآن کریم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح سمجھا اور اسے کس طرح نافذ کیا؟ اس کی تفصیل ہی کتبِ حدیث کا اصل موضوع ہے۔ کتبِ حدیث کی جمع و تدوین ایک الگ داستان ہے۔ اور اس پر کچھ بات ضمناً آگے آئے گی۔ یہاں جس بات کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے ' وہ یہ ہے کہ کتبِ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام تعلیمات ' خطبات ' مواعظ ' قضا یا (قانونی فیصلے) وغیرہ ہی بیان نہیں ہوئے بلکہ بعض نہایت اہم واقعاتِ سیرت بھی بیان ہوئے ہیں۔ چونکہ حدیث کی روایت اور نقل میں عام کتبِ تاریخ و سیرت کی نسبت زیادہ تحقیق و چھان بین سے کام لیا جاتا تھا ' اس لئے کتبِ حدیث میں بیان کردہ واقعاتِ سیرت ' قرآن کے بعد ' باقی تمام ماخذ سیرت سے زیادہ مستند اور زیادہ قابل اعتماد ہیں۔ یوں تو کتبِ حدیث کی تعداد زیادہ ہے لیکن ان میں سے زیادہ مشہور ' بلحاظِ صحت زیادہ قابلِ اعتماد اور بلحاظِ مواد زیادہ جامع کتب حسبِ ذیل شمار ہوتی ہیں:- (یہ نام کتابوں کے مؤلفین کے سنین وفات کی ترتیب سے لکھے گئے ہیں ' ان کی اہمیت کے درجے کے لحاظ سے نہیں)۔

نام کتاب / مشہور نام	مؤلف	سنہ وفات
۱- مؤطّا	امام مالک بن انسؒ	۱۷۹ ھ
۲- المسند یا مسند احمد	امام احمد بن حنبل شیبانی	۲۴۱ ھ
۳- الجامع الصحیح / بخاری شریف	امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ	۲۵۶ ھ
۴- صحیح مسلم / مسلم شریف	امام مسلم بن الحجاج نیشاپوریؒ	۲۶۱ ھ
۵- جامع ترمذی / ترمذی شریف	امام محمد بن عیسیٰ ترمذیؒ	۲۷۰ ھ

Marfat.com

۶- سنن ابن ماجہ | امام محمد بن یزید ابن ماجہؒ | ۲۷۳ھ

(امام ترمذی کی ایک خاص کتاب سیرت سے متعلق بھی ہے۔ اس کا نام "شمائل ترمذی" ہے۔ اس کا آگے پھر ذکر آئے گا)۔

۷- سنن ابی داؤد | امام سلیمان بن اشعث سجستانیؒ | ۲۷۵ھ

۸- سنن نسائی | امام احمد بن شعیب نسائیؒ | ۳۰۳ھ

۹- کتاب السنن / سنن دارمی | ابو محمد عبداللہ الدارمی | ۲۵۵ھ

۱۰- کتاب السنن / سنن دار قطنی | علی بن عمر دار قطنی | ۳۸۵ھ

۱۱- کتاب السنن الکبری | ابو بکر احمد بن حسین بیقہی | ۴۵۸ھ

ان کتب حدیث میں سے اکثر کی بڑی طویل اور ضخیم شرحیں بھی لکھی گئی ہیں اور ان سب کی مجموعی حدیثوں کو مضمون وار یکجا جمع کر کے بھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ایسی کتابوں میں سے جامع الاصول اور مشکوۃ المصابیح زیادہ مشہور ہیں۔

تواریخ حرمین

حرمین سے مراد ہے کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ - اسلام میں ان دونوں شہروں کو جو اہمیت حاصل ہوئی، اس کی بناء پر بعض علماء نے خاص ان شہروں کی تاریخ اور ان کے اہم تاریخی مقامات سے متعلق معلومات کو مستقل تالیفات کا موضوع بنایا۔ اس قسم کی کتابوں میں بعض مقامات کے ذکر کی مناسبت سے سیرت طیبہ کے بعض اہم واقعات بھی ملتے ہیں بلکہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے تواریخِ حرمین پر لکھی گئی کتابوں میں سیرت نبوی سے متعلق ایسی معلومات بھی مل جاتی ہیں جو عام کتبِ تاریخ و سیرت میں مذکور نہیں ہوتیں۔ اس قسم کی کتابیں (یعنی مکہ مکرمہ یا مدینہ منور یا ہر دو حرمین کی الگ الگ یا اکٹھی تاریخیں) اب تک لکھی جا رہی ہیں۔ تا ہم اس فن کی اہم بنیادی کتابیں (مآخذ) حسب ذیل ہیں۔

مکہ مکرمہ کی تاریخ ۔ اخبار مکہ المشرفتہ کے نام سے سب سے پہلے ابن الازرق

Marfat.com

(احمد بن محمد بن ولید بن عقبہ بن الارزق) نے لکھی جن کا سال وفات ۲۱۹ھ/۸۳۳م ہے۔ بعد میں مؤلف کے پوتے (محمد بن عبداللہ الارزقی) وفات ۲۳۴ھ/۸۵۸م) نے اس کو بہتر شکل دی۔

مدینہ منورہ کی تاریخ پر سب سے پہلی کتاب ابن زبالہ (محمد بن الحسین بن زبالہ) نے لکھی جو امام مالک بن انسؒ کے شاگردوں میں سے تھے) اس کتاب کا سال تالیف ۱۹۹ھ ۸۶۴م ہے۔ یہ کتاب ناپید ہو گئی ہے۔ لیکن تاریخ مدینہ پر بعد میں لکھی گئی کتابوں میں اس کے حوالے ملتے ہیں۔ جن میں السمھودی (علی بن احمد مصری وفات ۹۱۱ھ کی کتاب "دفاعا لوفاء ا باخبار دار المصطفی" قابل ذکر ہے۔ یہ کتاب تین جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس موضوع پر ہمارے زمانے میں لکھی گئی کتابوں میں سے ابراہیم رفعت پاشا کی "تاریخ الحرمین" (سفر نامہ) محمد حسین ہیکل کی "فی منزل الوحی" (سفرنامہ) اور عبدالقدوس انصاری کی "آثار المدینۃ المنورہ" قابلِ ذکر ہیں۔

تاریخ اسلام یا تاریخ عالم پر کتابیں

مسلمانوں نے فن تاریخ نویسی کو بڑی ترقی دی اور عالمی تاریخ کو عموماً اور اسلام کی پوری تاریخ کو خصوصاً بڑی بڑی ضخیم کتابوں میں جمع کیا۔ اس قسم کی کتابوں میں سیرت طیبہ کا مذکور ہونا لازمی تھا۔ اس قسم کی چند نمایاں اور بنیادی کتابیں (جو سیرت طیبہ کے لئے بھی ہم مآخذ و مصدر ہیں) مندرجہ ذیل ہیں۔

۱- امام ابن جریر (محمد بن جریر) طبری (وفات ۳۱۰ھ ۹۲۳ م) کی کتاب "تاریخ الرسل والملوک) جو عام طور پر تاریخِ طبری کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب اسلام کی ابتدائی تین صدیوں کی سب سے جامع تاریخ ہے۔ اس میں واقعات کی ترتیب سن وار ہے۔ یعنی ایک سال کے تمام واقعات ایک جگہ بیان کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یورپ سے بھی (پہلے اور بعد میں) مصر سے بھی مکمل کتاب آٹھ جلدوں میں ہے (مطبعہ استقامہ ۔ قاہرہ ایڈیشن) جن میں سے دوسری جلد سیرت

Marfat.com

کے متعلق ہے۔ تاریخ طبری کی اس جلد (حصہ سیرت) کا اردو ترجمہ بھی جامعہ عثمانیہ کے اہتمام سے حیدر آباد دکن سے شائع ہو چکا ہے۔

۲- ابن الاثیر (علی بن اثیر' وفات ۶۳۰ھ) کی " تاریخ الکامل جو مکمل کتاب نو (۹) جلدوں میں ہے (منیریہ - مصر) اس کی بھی دوسری جلد سیرت طیبہ پر مشتمل ہے۔

۳- حافظ ابن کثیر (اسماعیل بن عمر) دمشقی کی کتاب البدایۃ و النہایۃ تاریخ اسلام کی ایک اہم اور معتمد علیہ کتاب ہے۔ اس کتاب کی نو (۹) جلدوں میں سے (مطبعۃ السعادہ - مصر) دوسری سے چھٹی تک کی پانچ جلدیں سیرت سے متعلق ہیں۔ ابن کثیر کی کتاب کا یہ حصہ "سیرتِ ابن کثیر" کے نام سے چار جلدوں میں الگ بھی شائع ہو چکا ہے۔

۴- دیار بکری (حسین بن محمد - وفات ۹۶۶ھ) کی تاریخ الخمیس فی احوال انفس نفیس" بڑی مستند کتاب ہے جو مصنف نے ایک سو بائیس (۱۲۲) کتابوں سے ماخوذ کی ہے۔ اس کتاب کی مجموعی پانچ جلدوں میں سے جلد اوّل اور دوم کا بڑا حصہ سیرت طیبہ پر مشتمل ہے اس کتاب کا سال تالیف ۹۴۶ھ ہے۔

طبقاتِ مشاہیر

عام اور مسلسل تاریخ اسلام (سنہ وار) لکھنے کے علاوہ بعض مسلمان اہل علم نے مشہور شخصیتوں کی اقسام الگ الگ کر کے ہر گروہ یا طبقے کے مشاہیر کے حالات الگ کتابوں میں جمع کیے۔ مثلاً صحابہؓ' حفاظ و قراء' شعراء' علمائے لغت و نحو' اطباء وغیرہ۔ اس قسم کی کتابیں عموماً طبقات کے نام سے لکھی گئی ہیں۔ مثلاً طبقاتِ صحابہؓ' طبقات القراء' طبقات الاطباء وغیرہ ۔ اس قسم کی کتابوں میں سے جن کا تعلق خصوصاً صحابہ کرامؓ کے طبقات سے ہے' ان میں سیرتِ طیبہ پر بھی بہت کچھ مواد ملتا ہے۔ اس نوعیت کے مآخذ سیرت میں سے دو خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

بلاذری (محمد بن یحییٰ) کی " انساب الاشراف" (بلاذری کا سالِ وفات ۲۷۹ھ ہے) یہ عربوں کی ایک جامع تاریخ ہے جس کی ترتیب ان کے نامور خاندانوں کے اعتبار

Marfat.com

سے رکھی گئی ہیت سب سے پہلے بنو ہاشم کا ذکر ہے اور اس میں پوری سیرت آ گئی ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے خصوصاً اہم ہے کہ اس میں بعض روایات ان کتابوں کے حوالے سے لکھی گئی ہیں جو اب ناپید ہو چکی ہیں اور بعض دفعہ یہ روایات دوسری کتابوں میں بھی دیکھنے میں نہیں آتی ہیں۔ خود یہ کتاب بھی نایاب ہو چکی تھی۔ استنبول کے ایک نادر قلمی نسخے کی بناء پر ڈاکٹر حمیداللہ (پیرس) کی کوشش سے انساب الاشرف (قاہرہ سے) شائع ہو چکی ہے۔

۲- ابن سعد (محمد ابن سعد) کی کتاب الطبقات الکبیر" جو مختصراً " طبقات ابن سعد" کے نام سے مشہور ہے (ابنِ سعد کا سال وفات ۲۳۰ھ - ۸۶۵م ہے) یہ کتاب صحابہ کرامؓ اور تابعین کے حالات پر ہے اور مبسوط اور ضخیم ہونے کی وجہ سے اس کے نام کے ساتھ الکبیر کی صفت لگائی جاتی ہے۔ اس کتاب کے ابتدائی حصے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک کا بیان ہے مکمل کتاب کے آٹھ حصوں (بیروت ایڈیشن) میں سے پہلے دو حصے سیرت پر مشتمل ہیں۔ اس کتاب کے بیشتر حصوں کا اردو ترجمہ بھی جامعہ عثمانیہ حیدر آباد (دکن) کے اہتمام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ کتاب اسلام کی پہلی دو صدیوں کے مشاہیر کے حالات پر ایک بے مثال تالیف ہے اور سیرت نبویؐ کے نہایت قدیم اور قیمتی مصادر و مآخذ میں شمار ہوتی ہے۔

۳- الذہبی (محمد بن عثمان) سال وفات ۷۴۸ھ کی کتاب "طبقات المشاہیر والاعلام" کی متعدد جلدوں میں سے صرف جلد اوّل کا تعلق سیرت سے ہے۔

کتب سیرت

یعنی ایسی کتابیں کتابیں جن کے مؤلفین نے صرف سیرتِ طیبہ ہی سے متعلق واقعات کو الگ ایک تالیف میں جمع کیا۔ ہمارا اصل موضوع اس قسم کی کتابیں ہی ہیں۔ کتبِ سیرت کی جمع و تدوین کی مختصر کہانی اور اس فن کے ارتقاء کا تعارف ابھی آگے آ رہا ہے۔ یوں تو یہ داستان ایک مستقل ضخیم کتاب کا موضوع بن سکتا ہے۔ اس لئے

Marfat.com

کہ صرف عربی زبان میں آج تک لکھی گئی صرف اہم کتبِ سیرت کی تعداد بھی بیسیوں تک پہنچ جاتی ہے۔ دنیا کی باقی زبانوں کا سیرت لٹریچر اس کے علاوہ ہے۔ یہاں ہم صرف چند نہایت اہم کتبِ سیرت کا مختصر تعارف کراتے ہیں۔ یہ وہ کتابیں ہیں جو یا تو اوّلین دور میں لکھی گئیں اور آنے والوں کے لئے مآخذ و مصدر بنیں یا پہلی جامع کتبِ سیرت ہیں جن کے مؤلفین نے اپنے سے پہلے کے متعدد مصنفوں کی کتابوں سے مواد جمع کیا اور آنے والوں کے لئے ضخیم اور جامع کتبِ سیرت چھوڑ گئے۔ خیال رہے کہ ابتدائی دور کی لکھی ہوئی بہت سی کتبِ سیرت ناپید بھی ہو گئیں ' اگرچہ ان کا ذکر اور ان سے اخذ کردہ مواد کے حوالے بعد کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ اسی طرح بہت سی ایسی کتبِ سیرت ہیں جن کے قلمی نسخے بڑے کتب خانوں میں ملتے ہیں مگر وہ ابھی شائع نہیں ہو سکی ہیں۔ اس لئے یہاں ہم صرف ان کتبِ سیرت کا ذکر کریں گے جو زمانے کی دست برد سے محفوظ بھی رہیں اور اب چھپی ہوئی ملتی بھی ہیں۔ یا چھپ ضرور چکی ہیں۔ اگرچہ کمیاب یا نایاب ہو چکی ہوں۔ ان کتابوں کو ان کے مؤلفین کے سنین وفات کی ترتیب سے ذکر کیا گیا ہے۔

"کتاب المغازی"۔ مؤلفہ ۔ موسیٰ بن عقبہ (وفات ۱۴۱ھ) یہ تابعی تھے اور انہوں نے عہدِ رسالت کی اخبار و روایات کے جمع کرنے میں کمال جانفشانی کا ثبوت دیا۔ امام مالک ان کے بڑے مداح تھے۔ ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ کم عمر اور نا سمجھ لوگوں سے روایت نہیں لیتے تھے بلکہ ہمیشہ پختہ عمر اور پختہ فہم کے لوگوں سے روایت حاصل کرتے تھے۔ اسی احتیاط کی وجہ سے ان کی کتابِ مغازی دوسری کتبِ مغازی کے مقابلے میں مختصر ہے۔ یہ کتاب مدت تک رائج رہی۔ واقدی ' ابن سعد اور طبری کی کتابوں میں اس کے حوالے ملتے ہیں مگر آہستہ آہستہ یہ کتاب ناپید ہو گئی۔ ۱۹۰۴م میں جرمن پروفیسر زخاؤ نے اس کا کچھ حصہ (جو اسے کسی لائبریری میں ملا) شائع کیا تھا۔ گویا یہ کتاب اب نایاب ہے۔ ہم نے اس کا ذکر صرف اوّلیں کتبِ سیرت میں سے ہونے کی وجہ سے کر دیا ہے جس کا کچھ حصہ چھپ گیا ہے۔

Marfat.com

کتاب "سیرت" (صلی اللہ علیہ وسلم) مؤلفہ محمد بن اسحاق (وفات ۱۵۰ھ) محمد بن اسحاق بھی تابعی تھے ' اور انہوں نے سب سے پہلے "سیرت" کے عنوان سے کتاب لکھی جس کی جامعیت ' تفصیل اور معلومات کی فراوانی کی بناء پر اکثر اہلِ علم نے اسے قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا۔ بعد کے مؤرخوں اور مصنفوں نے سیرت نبوی کے بارے میں اس کتاب پر پورا پورا اعتماد کیا اور اسے اپنا ماخذ بنایا بلکہ بعد کے سیرت نگاروں کے لئے اس کی خوشہ چینی کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ طبری ' ابن خلدون اور دیگر مؤرخین نے ابنِ اسحاق سے بکثرت روایت کی ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں فارس کے حکمران ابو بکر سعد زنگی کی فرمائش پر "سیرت ابنِ اسحاق" کا فارسی ترجمہ بھی تیار ہوا تھا۔ جس کے قلمی نسخے دنیا کے بعض کتب خانوں میں موجود ہیں۔ مرورِ ایام کے ساتھ یہ کتاب بھی ناپید ہو گئی۔ چند برس پہلے مراکش میں اس کے کچھ اجزاء قلمی صورت میں ملے تھے جنہیں ڈاکٹر حمید اللہ (پیرس) نے شائع کرایا ہے۔ تاہم "سیرت ابن اسحاق" اس لحاظ سے موجود ہے کہ سیرت کی سب سے اہم کتاب "سیرت ابنِ ہشام" (جس کا ذکر آگے آ رہا ہے) کی بنیاد اور اصل یہی سیرت ابنِ اسحاق ہی ہے بلکہ ایک طرح سے یہ اسی کا ایک ترقی یافتہ ایڈیشن ہے۔ اسی لئے اصلی کتاب کے ناپید ہونے کے باوجود اس کا ذکر یہاں کیا گیا ہے۔

" کتاب المغازی "۔ مؤلفہ محمد بن عمر الواقدی (وفات ۲۰۷ھ - ۸۲۲م) واقدی بحیثیت مفسر اگرچہ غلط قصے سنانے میں بدنام رہے مگر بحیثیت مورخ سیرت و مغازی اسے سند مانا جاتا ہے۔ واقدی نے خصوصاً واقعات کی تاریخیں معین کرنے کا التزام کیا ہے۔ واقدی کی کتاب المغازی کا سب سے مکمل اور اچھا ایڈیشن ۱۹۶۴م میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا ہے جو تین جلدوں میں ہے۔ اس سے پہلے ۱۲۷۱ھ - ۱۸۵۸ء میں کلکتہ سے اس کا ایک ایڈیشن چھپا تھا مگر وہ ناقص اور نا مکمل تھا۔ واقدی کی کتاب المغازی- مغازی و سیر کی اوّلیں کتابوں میں سے پہلی کتاب ہے جو اپنی مکمل صورت میں، ہم تک پہنچی ہے ۔ طبری اور دوسرے مؤرخوں نے مغازی (سیرت) کے

Marfat.com

بارے میں واقدی سے بہت سے اقتباسات لیے ہیں۔

۴۔ "سیرۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" مؤلفہ عبدالملک بن ہشام (وفات ۲۱۳ھ یا ۲۱۸ھ) یہ کتاب جو زیادہ تر اپنے مصنف کے نام پر "سیرت ابن ھشام" کے نام سے مشہور ہے، در اصل سیرت ابن اسحاق ہی کی تلخیص اور تہذیب ہے۔ مثلاً اصل کتاب کا کچھ حصہ سیرت سے براہ راست متعلق نہ تھا۔ ابن ہشام نے اسے چھوڑ دیا۔ مشکل الفاظ کے معنی بیان کئے اور بعض واقعات کا اپنی طرف سے اضافہ کیا۔ اسی طرح "سیرت ابنِ اسحاق" کو جو شکل ابن ہشام نے دی وہ اتنی مقبول ہوئی کہ لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اصل کتاب کو فراموش ہی کر دیا۔ اب یہی کتاب "سیرت ابنِ ہشام" کے نام سے متداول ہے۔ اس کے متعدد ایڈیشن جرمنی اور مصر سے شائع ہو چکے ہیں۔

سیرت ابنِ ہشام کی اہمیت اور مقبولیت کی وجہ سے اس کی کئی شرحیں لکھی گئیں۔ ان میں سب سے مشہور شرح السہیلی (عبدالرحمٰن عبداللہ احمد السہیلی - وفات ۵۸۱ھ - ۱۱۸۵م) کی "الروض الانف" ہے۔ ابھی حال ہی میں عبدالرحمٰن الوکیلی نے "الروض الانف" کی مبسوط شرح لکھی ہے جو سات ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

سیرت ابن ہشام کی کئی تلخیصات بھی لوگوں نے لکھی ہیں۔ بعض علماء نے سیرت کے منظوم خلاصے بھی لکھے اور اس کے ترجمے تو دنیا کی کئی زبانوں خصوصاً فارسی، اردو، جرمن اور انگریزی میں ہو چکے ہیں۔ الغرض سیرت طیبہ کے مآخذ میں اس کتاب کہ سب سے زیادہ شہرت اور اعتماد حاصل ہے۔

۵۔ "الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ" مؤلفہ قاضی بن موسیٰ (وفات ۵۴۴ھ)مؤلف زیادہ تر "قاضی عیاض" کے نام سے مشہور ہے اور کتاب مختصراً "الشفاء" یا شفاء شریف کے نام سے مشہور ہے۔ ان کی یہ کتاب سیرت کی معروف اور مقبول عام کتاب ہے ۔ مصنف نے کتاب میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل، محاسن اور معجزات کو ایسے مؤثر اور دلپذیر پیرائے میں بیان کیا ہے کہ ان کے ایک ایک لفظ سے

Marfat.com

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی عقیدت اور محبت ٹپکتی ہے۔ "الشفاء" کے متعدد ایڈیشن استنبول ' قاہرہ ' ہندوستان اور پاکستان سے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک مصری عالم اور ادیب الخفاجی (احمد شہاب الدین الخفاجی - وفات ۱۰۶۹ھ - ۱۶۵۹م) نے شفاء قاضی عیاض کی ایک مبسوط شرح "نسیم الریاض" کے نام سے لکھی جو چار ضخیم جلدوں میں استنبول اور قاہرہ سے شائع ہو چکی ہے۔ " شفاء کی ایک "مختصر" شرح محمد علی القادری نے بھی لکھی ہے۔ یہ شرح بھی نسیم الریاض (خفاجی کے مصری ایڈیشن کے حاشیہ پر چھپی ہے۔ الشفاء کے دو اردو ترجمے لاہور سے شائع ہو چکے ہیں۔

۶- "الاکتفاء فی مغازی المصطفی والثلاثة الخلفاء"-مؤلفہ سلیمان بن سالم الکلاعی (وفات ۶۳۴ھ) کلاعی کی "الاکتفاء" سب سے پہلے پیرس سے ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی تھی' اب قاہرہ سے بھی اس کا ایک ایڈیشن کئی جلدوں میں شائع ہو رہا ہے - جو ابھی مکمل نہیں ہوا) الاکتفاء کا بیشتر حصہ سیرت طیبہ سے ہی متعلق ہے ' اگرچہ اس میں کچھ واقعات خلافتِ راشدہ کے بھی بیان ہوئے ہیں۔

۷- "عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل السید" ۔ مؤلفہ محمد بن یحیٰ ابن سید الناس۔ (وفات ۷۳۴ھ) مؤلف ابن سید الناس کے نام سے زیادہ مشہور ہیں- کتاب "عیون الاثر" بڑی جامع اور متین کتاب ہے اور معتبر و مستند روایات پر مشتمل ہے۔ مؤلف نے جو کچھ لکھا ہے ' وہ محدثین کے طریقے پر سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں قاہرہ اور بیروت سے شائع ہو چکی ہے۔ ایک عالم ابراہیم بن محمد نے عیون الاثر (جو سیرت ابن سید الناس کے نام سے بھی مشہور ہے) کی ایک شرح "نور النبراس" کے نام سے لکھی۔ اس کے قلمی نسخے استنبول اور ہندوستان میں ملتے ہیں مگر وہ ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔

۸- "زاد المعاد فی هدیِ خیر العباد "- مؤلفہ حافظ محمد ابن قیم الجوزیہ (وفات ۷۵۱ھ) اس کتاب کے مؤلف (ابن قیم) شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے شاگرد تھے۔ کتبِ سیرت میں "زاد المعاد" کی منفرد خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف حالات اور

Marfat.com

واقعات کے بیان پر اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ ہر موقع پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فلاں قول یا فلاں عمل سے کیا حکم مستنبط ہو سکتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور معمولات زندگی میں ہمارے لئے کیا کچھ سامانِ موعظت موجود ہے۔ گویا اس کتاب میں امت کے سامنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ اس طرح کھول کر رکھ دیا گیا ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں اس سے ہدایت حاصل کر سکتی ہے۔ یہ قابلِ قدر کتاب اپنی غیر معمولی دلچسپی اور افادیت کی وجہ سے مصر سے کئی دفعہ چھپ چکی ہے۔ اصل کتاب چار جلدوں میں ہے۔ اس کی ایک تلخیص (خلاصہ) بھی "ہدی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ "زاد المعاد" کا مکمل (چار جلدوں میں) اور ایک ملخص (خلاصہ) اردو ترجمہ بھی چھپ چکے ہیں۔

۹۔ "السیرۃ النبوۃ" مؤلفہ حافظ اسماعیل بن عمر المعروف بابن کثیر (وفات ۷۷۴ھ) یہ کتاب در اصل حافظ ابن کثیر کی مشہور تاریخ "البدایۃ والنہایۃ" کا ہی ایک حصہ ہے۔ جو علیحدہ بھی مستقل نام "السیرۃ النبویۃ" سے چار جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ سیرت ابن کثیر۔ نہایت جامع ' مبسوط اور مستند روایات پر مبنی کتاب ہے۔

۱۰۔ الخصائص الکبریٰ۔ تالیف امام جلال الدین السیوطی (وفات ۹۱۱ھ) علامہ سیوطی کی اس کتاب کا اصل موضوع فضائل و شمائل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں حیدر آباد دکن کے دائرۃ المعارف نے شائع کی تھی۔ اپنے موضوع پر جامع اور مفصل کتاب ہے۔

۱۱۔ "المواهب اللدنیہ بالمنح المحمدیہ ' تالیف احمد بن ابی بکر القسطلانی (وفات ۹۲۳ھ -۱۵۱۷ء)قسطلانی مصر کے ایک مشہور محدث اور فقیہہ تھے۔ یہ زیادہ تر اپنی شرح بخاری کے لئے مشہور ہیں جو "ارشاد الساری" کے نام سے شائع ہوئی۔ "المواهب" ان کی دوسری اہم کتاب ہے جو فن سیرت کی بڑی مشہور اور مقبول کتاب ہے۔ کتاب دو ضخیم جلدوں میں قاہرہ سے شائع ہو چکی ہے۔ "المواهب" کی مقبولیت کی

Marfat.com

وجہ سے اس کی شرحیں بھی لکھی گئیں۔ ان میں سب سے زیادہ مفصل شرح زرقانی (محمد بن عبدالباقی الزرقانی ۔ وفات ۱۱۲۳ھ) کی ہے۔ کتاب کا نام بھی مصنف کے نام پر "زرقانی شرح قسطلانی" ہے ۔ یہ کتاب آٹھ ضخیم جلدوں میں مصر سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب (زرقانی) کے صفحات کی مجموعی تعداد تین ہزار سے زائد ہے۔ یہ (شرح) سیرت نبویؐ کے متعلق ہر قسم کی معلومات کا ایک خزینہ ہے ۔ قسطلانی کی کتاب (المواہب) کا ایک خلاصہ بھی "الانور المحمدیه فی المواهب اللدینه" کے نام سے یوسف بن اسماعیل النبہانی نے لکھا تھا جو بیروت سے شائع ہو چکا ہے اور اصل کتاب (المواہب) کا قریباً تہائی بنتا ہے۔

۱۲۔ "انسان العیون فی سیرة الامین المامون" تالیف علی بن برہان الدین حلبی (وفات ۱۰۴۴ھ ۔ یہ کتاب اپنے مؤلف کے نام پر زیادہ تر "السیرة الحلبیته" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب جیسا کہ مؤلف نے ابتداء میں تصریح کر دی ہے۔ در اصل سیرت کی دو کتابوں سے ماخوذ ہے۔ ایک تو ابن سید الناس کی عیون الاثر اور دوسری شمس الدین شامی کی "سبل الهدی فی الارشاد فی سیرة خیر العباد" شامی کی کتاب جو زیادہ تر "سیرت شامی" کے نام سے مشہور ہے ابھی تک مکمل شائع نہیں ہوئی۔ ابتدائی چار پانچ حصے چھپے ہیں اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب تو زرقانی سے کم ضخیم نہیں ہو گی۔ "عیون الاثر" معتبر کتاب ہے مگر اسناد کے التزام نے اسے پیچیدہ بنا دیا ہے۔ سیرت حلبیہ کے مؤلف (حلبی) نے اپنی کتاب میں ان اسناد کو حذف کر دیا ہے۔ سیرت الشامی میں ہر قسم کی کمزور اور ضعیف روایات بھی شامل ہیں۔ حلبی نے ان کے بارے میں تنقید اور احتیاط سے کام لیا ہے۔ سیرت حلبیہ قاہرہ سے تین ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکی ہے جس کے صفحات کی مجموعی تعداد بارہ سو کے قریب ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو سیرت کی مذکورہ بالا بارہ کتابوں میں سے اصل مآخذ اور مصدر کا درجہ صرف پہلی چار کتابوں کی ہی حاصل ہے۔ باقی کتابیں سیرت کی نہایت اہم کتابیں ہیں کیونکہ ان میں سیرت کے تمام مآخذ (قرآن ' حدیث ' تاریخ وغیرہ) سے

Marfat.com

مواد حاصل کر کے کسی خاص اسلوب اور خاص ترتیب سے یکجا کر دیا گیا ہے۔

مشمولاتِ سیرتؐ اور انداز ہائے تالیف (کتبِ سیرتؐ):

کتاب کی طوالت یا اختصار ' اسلوب نگاری یا کسی غالب رجحان وغیرہ سے قطع نظر کتبِ سیرت کے عام مشمولات یعنی جن امور سے بحث کی جاتی ہے ' وہ بالعموم حسب ذیل ہوتے ہیں:-

۱- عرب کی حالت قبل اسلام (عربوں کی مذہبی ' معاشرتی حالت یا عادات ' اس کی تاریخ مع جغرافیہ عرب)۔

۲- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان اور قبیلہ کا ذکر اور ان کے بعض واقعات۔

۳- آپ کی ولادت مبارک اور بعض ارہاصات (بعض ایسی باتیں جو کسی نہ کسی طرح پہلے ہی آپ کی نبوت کا پتہ دے رہی تھیں) کا بیان۔

۴- آپ ﷺ کا بچپن ' پرورش ' جوانی ' تجارت ' شادی اور اس کے بعد قبل اعلان نبوت یعنی چالیس سال تک کی عمر کے حالات

۵- وحی کی ابتداء ' مکے میں تبلیغ ' ابتدائی مسلمان ' کفار کی مخالفت اور اذیت اور مکی دور کی مشکلات کا بیان۔ ان میں ہجرت حبشہ ' مقاطعہ ' قریش ' سفر طائف اور بیعت ہائے عقبہ و ہجرت از مکہ وغیرہ کی تفصیلات آتی ہیں۔

۶- ہجرت مدینہ کے بعد کے واقعات ' مسجد نبوی ' مواخات ' غزوات ' اور وفود۔

۷- تبلیغی اور تنظیمی امور ' غلبۂ اسلام۔

۸- آپؐ کی بیماری اور وفات کے واقعات۔ اسلامی فتوحات کی ابتداء۔

۹- آپؐ کے فضائل و محاسن ' معجزات ' خصوصیات وغیرہ کی تفصیل۔

سیرتؐ کی کتاب چھوٹی ہو یا بڑی اس کا بنیادی ڈھانچہ یہی ہوتا ہے۔ تفصیلات کے اخذ یا ترک (لینا یا چھوڑ دینا) کے علاوہ تعلیماتِ نبویؐ کا سیرتؐ کے ساتھ تفصیلی یا

Marfat.com

اجمالی بیان وغیرہ۔ یہ چیزیں مؤلف کے مقصدِ تالیف پر منحصر ہوتی ہیں۔ دراصل سیرت پاکؐ اتنا وسیع موضوع ہے کہ اگر اس کے تمام یا بہت زیادہ گوشوں کو شامل کتاب کرنے کی کوشش کی جائے تو کتاب بے حد ضخیم ہو جاتی ہے اور فی الواقع عربی میں (بلکہ اردو میں بھی) ایسی کتُب سیرت موجود ہیں جو متعدد جلدوں پر مشتمل ہیں۔

۱- صرف فضائل و خصائص النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان

۲- صرف میلاد یا معجزات کا ذکر

۳- صرف غزوات بلکہ بعض دفعہ کسی ایک ہی غزوہ کی تفصیلات

۴- آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے دلائل

۵- غیر مسلموں کی طرف سے آپؐ پر کئے گئے اعتراضات کے جواب

۶- بچوں کے لئے آسان اور مختصراً انداز میں بیانِ سیرت

۷- اسوۂ حسنہ کے طور پر آپؐ کی مختلف حیثیتوں (مثلاً سربراہ خاندان، تاجر، معلم، سپہ سالار کا بیان وغیرہ۔

الغرض سیرت نگاروں کے اپنے رجحانات اور مختلف زمانوں کی ضروریات اور دیگر علمی مقتضیات ہی کتب سیرت کی بکثرت تالیف کا سبب بنے ہیں۔ اب ہمارے زمانے میں جدید ترین رجحان یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے کسی ایک ہی پہلو پر مختلف اہل علم سے مقالات لکھوا کر یکجا کر دئے جائیں یا مختلف علماء سے سیرتؐ کے الگ الگ پہلوؤں پر مقالات لکھوا کر ان کو یکجا شائع کر دیا جائے۔ تاہم صرف واقعات و حالات پر مبنی کتبِ سیرت کی تالیف کا کام بھی اپنے تنوعات اور الگ الگ خصوصیات کے ساتھ جاری ہے اور (ان شاء اللہ) تا قیامت جاری رہے گا۔ اور یہ کام نظم اور نثر دونوں میں کیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ زیادہ تر کتبِ سیرت نثر میں ہی ہیں تاہم منظوم کتبِ سیرت کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے اور اگر صرف نعت و صلوات کی کتابوں ہی کو لیا جائے تو ان کی فہرست پر بھی ایک رسالہ تیار ہو سکتا ہے۔

Marfat.com

جمع و تدوین سیرت کی مختصر تاریخ

تمام بنیادی اسلامی علوم مثلاً تفسیر و قراء ت، حدیث و فقہ اور سیرت یا تاریخ اسلام کی تدوین کا قصہ یکساں ہے۔ یہ سب چیزیں عہد رسالت میں شروع ہوئیں لیکن ایک ایک موضوع پر مستقل اور الگ الگ چھوٹی کتابیں لکھنے کا رواج پہلی اور دوسری صدی ہجری میں ہوا۔ پھر ان چھوٹی تالیفات اور مختصر رسائل وغیرہ سے مواد کو لے کر اسے یکجا کر کے ایک ایک موضوع پر بڑی اور جامع کتابیں لکھنے کا کام تیسری اور چوتھی صدی میں مکمل ہوا۔ اس تاخیر کی ایک معقول وجہ ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و تعلیمات کی تفصیلات (حدیث) یا آپؐ کی زندگی کے حالات کی تفصیلات (سیرت) کے بارے میں کوئی بھی ہر طرح سے جامع کتاب تیار کرنا آپؐ کی وفات کے بعد کم از کم تین یا چار نسلیں گزر جانے سے پہلے ممکن ہی نہ تھا۔ وجہ؟ سنیئے اور غور کیجئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات، آپ کی تعلیمات، آپ کے حالات وغیرہ کے بارے میں جملہ معلومات آپؐ کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں صحابہؓ کے اندر منتشر طور پر موجود تھیں کسی صحابی کی معلومات زیادہ تھیں کسی کی کم۔ بعض کو ایک یا چند باتیں معلوم تھیں تو بعض کو دوسری۔ کسی بھی ایک صحابی کے پاس آپؐ سے متعلق ہر طرح کی جامع معلومات نہیں تھیں اور نہ ایسا ہونا ممکن تھا۔ اس لئے کوئی ایک آدمی ایسا نہیں ہو سکتا جو پورے تیئس سال ہر روز کے پورے چوبیس گھنٹے آپؐ کے ساتھ رہا ہو۔ کسی کو یہ موقع کم ملا کسی کو زیادہ۔ آپؐ کے گھر کے اندر کے پیش آنے والے واقعات کی آپ کی ازواج مطہرات ہی بہتر معلومات رکھتی تھیں۔ کسی خاص جنگ کے واقعات کو اس جنگ میں شامل ہونے والے بہتر جانتے تھے اس تمام علم کو یکجا کرنے کی ایک ہی صورت تھی کہ تمام صحابہ سے حاصل ہونے والی جملہ معلومات ایک جگہ جمع کر دی جائیں۔

Marfat.com

رسول پاکؐ کی ذات گرامی ابتدائے نبوت سے صحابہ کرام کی غیر معمولی توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔ خود صحابہ کرامؓ بھی باہم ایک دوسرے کے ذریعے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اپنی معلومات میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی یہ دستور شروع ہو چکا تھا کہ جب بھی ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے ملتا تو وہ اس سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات دریافت کرتا۔ وہ اس کے جواب میں کسی تازہ وحی یا آپ کے کسی تازہ فرمان یا کسی تازہ واقعے کا ذکر کرتا۔

آپؐ کی وفات کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا۔ آپ کے پیروؤں کے دل میں اپنے ہادی اور پیشوا کی ذات مبارک آپؐ کے اخلاق و عادات اور آپؐ کی زندگی سے متعلق باتیں دریافت کرنے کا شوق بڑھتا چلا گیا۔ اس شوق و جستجو سے رفتہ رفتہ روایات کا ایک وسیع ذخیرہ جمع ہونا شروع ہوگیا۔ صحابہ کرامؓ کے بعد آگے آنے والی نسل (تابعین) کے دور میں صحابہؓ کے ذریعے سے حاصل ہونے والی معلومات اکٹھی کرنے کا کام تو شروع ہوا ہی تھا۔ آپ اس کے ساتھ علوم میں مہارت کی تقسیم (Specialization) کا کام بھی شروع ہو گیا۔ مثلاً ایک تابعی مختلف صحابہؓ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف عام احادیث (وعظ ' تقریر ' نصائح) سن کر لکھ لیتا یا یاد کر لیتا۔ دوسرا تابعی مختلف صحابہؓ سے آپؐ کی جنگوں کے حالات اور دیگر واقعات دریافت کر کے لکھ لیتا۔ اس طرح ایک ایک تابعی کے پاس دس بیس یا پچاس صحابہؓ کے ذریعے سے حاصل ہونے والی معلومات جمع ہوتی گئیں۔ فتوحات کے باعث صحابہ کرامؓ ایران ' عراق ' شام اور مصر وغیرہ میں پھیل گئے تھے۔ چنانچہ صحابہؓ سے معلومات جمع کرنے کا کام ان تمام علاقوں اور ان کے اہم مقامات پر بھی شروع رہا۔

تابعین کے بعد اگلی آنے والی نسل (تبع تابعین) کو اب یہ موقع ملا کہ وہ متعدد تابعین سے ان کے پاس جمع شدہ اور متعدد صحابہؓ سے حاصل کردہ معلومات یکجا کر سکتے تھے آپ یوں سمجھئے کہ مثلاً ایک تابعی کے پاس بیس صحابہؓ سے حاصل شدہ معلومات

Marfat.com

ہیں۔ دوسرے کے پاس تیس صحابہؓ سے حاصل کردہ ذخیرہ معلومات ہے اور تیسرے کے پاس پچاس صحابہؓ سے حاصل کردہ علم ہے۔ اگر ایک تبع تابعی ان تینوں تابعین سے یہ علم حاصل کر لے تو گویا اس کے پاس ایک سو صحابہؓ سے حاصل ہونے والا علم جمع ہو گیا۔

اسی طرح ہزاروں صحابہؓ کا علم سینکڑوں تابعین ہیں۔ اور سینکڑوں تابعین کا علم بیسیوں تبع تابعین کے پاس جمع ہوتا گیا۔ اس طرح تبع تابعین بلکہ ان کے بعد آنے والی نسل اس پوزیشن میں تھی کہ اب ایک ایک موضوع پر جمع شدہ معلومات کی مناسب تقسیم اور ترتیب کے ساتھ ایک ایک جامع کتاب مرتب کر لی جائے۔ تبع تابعین کے بعد کے دور میں کسی ایک شخص سے کوئی نئی بات معلوم ہونے کا امکان ختم ہو گیا۔ اب تو درجنوں اور بیسیوں چھوٹی چھوٹی کتابوں میں جمع شدہ ذخیرۂ معلومات سے بڑی اور جامع کتابیں تیار کرنے کا کام ہی رہ گیا تھا۔ یوں اس چوتھی نسل کے زمانے میں حدیث، تفسیر، سیرت وغیرہ سب کی اہم ابتدائی چھوٹی کتابیں اور پھر بعد میں بڑی اور جامع کتابیں تیار کرنے کا کام قریباً ایک ہی زمانے میں ساتھ ساتھ جاری رہا۔ حدیث، تفسیر، تاریخ، مغازی سیرت کے چھوٹے مجموعے جب بڑے مجموعوں میں شامل ہوتے گئے تو آہستہ آہستہ چھوٹے مجموعے متروک ہو گئے البتہ بڑے مجموعوں اور جامع کتابوں میں ان چھوٹے مجموعوں کے حوالے بکثرت ملتے ہیں جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس بڑی کتاب کے تدوین کے زمانے تک یہ چھوٹے، مختصر مگر اصل مآخذ پڑھے پڑھائے جاتے تھے۔

اب اسی انداز پر تدوینِ سیرت کا کام بھی کچھ یوں شروع ہوا کہ جب مسلمانوں نے اپنے ہادی برحقؐ کے اقوال اور احوال کو اختیار کیا اور تفصیل سے جمع اور محفوظ کرنے کا کام شروع کیا تو بعض بزرگوں نے صرف واقعاتِ سیرت سے متعلق مواد جمع کرنے کو ہی اپنا دینی اور علمی مشغلہ اور میدان اختصاص بنا لیا اور اس فن میں خاصی شہرت پائی۔ تابعین اور تبع تابعین میں سے جن لوگوں نے سیرت و مغازی پر مواد جمع کیا اور ابتدائی کتابیں لکھیں جنکا ذکر بعد کی لکھی ہوئی بڑی کتابوں میں ملتا ہے، ان میں

Marfat.com

سے چند ایک مشہور لوگوں کے نام ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ یہ نام سنینِ وفات کی ترتیب سے ہیں جو ہر ایک نام کے ساتھ لکھ دئے گئے ہیں: -

۱- عروہ بن الزبیر ۹۳ ھ

۲- ابان بن عثمانؓ بن عفان ۱۰۵ھ

۳- شعبی ۱۰۹ھ

۴- وہب بن منبہ ۱۱۴ھ

۵- عاصم بن عمر بن قتادہ ۱۲۱ھ

۶- شرحبیل بن سعد ۱۲۳ھ

۷- ابن شہاب الزہری ۱۲۵ھ

۸- یعقوب بن عتبہ ثقفی ۱۲۸ھ

۹- عبداللہ بن ابی بکر بن حزم ۱۳۵ھ

۱۰- موسیٰ بن عقبہ ۱۴۱ھ

۱۱- ہشام بن عروہ بن الزبیر ۱۴۶ھ

۱۲- محمد بن اسحاق ۱۵۰ھ

۱۳- معمر بن راشد ۱۵۲ھ

۱۴- عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز ۱۶۲ھ

۱۵- محمد بن صالح بن دینار ۱۶۸ھ

۱۶- ابو معشر نجیح المدنی ۱۷۰ھ

۱۷- عبداللہ بن جعفر مخزومی ۱۷۰ھ

۱۸- عبدالملک بن محمد انصاری ۱۷۶ھ

۱۹- زیاد بن عبداللہ البکائی ۱۸۳ھ

۲۰- سلمہ بن الفضل ۱۹۱ھ

۲۱- یحییٰ بن سعید بن ابان ۱۹۴ھ

Marfat.com

۲۲- ولید بن مسلم القرشی ۱۹۵ھ

۲۳- یونس بن بکیر ۱۹۹ھ

۲۴- محمد بن عمر الواقدی ۲۰۷ھ

۲۵- یعقوب بن ابراہیم زہری ۲۰۸ھ

۲۶- عبدالملک بن ہشام ۱۸/۲۱۳ھ

۲۷- علی بن محمد المدائنی ۲۲۵ھ

۲۸- محمد بن سعد ۲۳۰ھ

۲۹- ابراہیم بن اسحاق ۲۸۵ھ

۳۰- ابو بکر احمد البغدادی ۲۷۷ھ

ہم نے ناموں کی یہ فہرست اس لئے نہیں دی کہ آپ انہیں رٹتے پھریں بلکہ اس میں جو بات خاص طور پر قابلِ غور ہے' وہ یہ ہے کہ آپ ذرا سنین وفات پر نظر ڈالئے۔ ۹۳ھ سے ۲۹۹ھ تک یعنی پہلی صدی ہجری سے تیسری صدی ہجری تک کا زمانہ اس میں شامل ہے۔ آپ اس سے دیکھ سکتے ہیں کہ سیرت نگاری کا عمل کس طرح تسلسل سے جاری رہا۔ بعض دفعہ ایک ہی خاندان میں یہ کام ایک طرح موروثی علم بن گیا۔ مندرجہ بالا فہرست پر غور کریں تو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ نمبر ۱۱ نمبر ۱ کا بیٹا ہے اور نمبر ۲۱ نمبر ۲ کا پوتا ہے۔ آپ پہلے پڑھ آئے ہیں کہ مندرجہ بالا فہرست میں سے نمبر ۱۰ (موسیٰ بن عقبہ) نمبر ۱۲ (محمد بن اسحاق) نمبر ۲۴ (واقدی) نمبر ۲۶ (ابن ہشام) اور نمبر ۱۸ (ابن سعد) کی کتابیں ہم تک پہنچی ہیں بلکہ موخر الذکر تین کتابیں تو کئی بار شائع ہوئی ہیں۔

سیرت کی جمع و تدوین کا کام تیسری صدی کے آخر تک مکمل ہوا۔ ٹھیک اسی طرح اس زمانے تک تفسیر' حدیث اور تاریخ کی تدوین بھی مکمل ہوئی۔ (البتہ تاریخ تو ایک مسلسل عمل ہے۔ اس کی تدوین تو جاری رہنا ہی تھی مگر چوتھی صدی کی ابتداء تک کی مکمل تاریخ لکھ لی گئی)۔

Marfat.com

اس کے بعد اگلی دو تین صدیوں (پانچویں یا نویں صدی) میں اہل علم کو موقع ملا کہ وہ تفسیر' حدیث' سیرت' تاریخ وغیرہ مختلف علوم کی کتابوں سے استفادہ کر کے زیادہ بڑی کتابیں لکھ سکتے تھے۔ آپ سیرت کے مآخذ میں بیان کردہ کتابوں کی فہرست پر ایک نظر ڈالیے تو آپ کو بعد کی تصانیف کے ضخیم ہونے کی وجہ سمجھ میں آ جائے گی اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ لوگوں نے بعض اہم کتابوں (مثلاً سیرت ابن ہشام) کی شرحیں کیوں لکھیں اور ان شارحین کے سامنے مواد حاصل کرنے کے ذرائع اور وسائل کتنے وسیع ہو چکے تھے۔

اس کے بعد (یعنی نویں صدی ہجری کے بعد سے) اب تک سیرت پر تالیف و تصنیف کا کام مسلسل جاری ہے۔ عربی میں بھی اور دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی۔ بعض لوگ (مثلاً ڈاکٹر حمید اللہ) سیرت کے نایاب قلمی اجزاء ڈھونڈ کر شائع کروانے کا کام کر رہے ہیں۔ بعض نے جامع کتابیں لکھی ہیں اور بعض نے مشہور ضخیم کتابوں کے خلاصے تیار کئے ہیں۔ بعض مشہور کتبِ سیرت کے ترجمے ایک زبان سے دوسری زبانوں میں کر رہے ہیں۔ ہمارے زمانے کی تالیفاتِ سیرت کی ایک بڑی خصوصیت بچوں کے لئے کتبِ سیرت اور اسوہ حسنہ کے مختلف پہلوؤں پر مقالات کی اشاعت ہے۔

عربی کے علاوہ دوسری زبانوں میں کتب سیرت

سیرت پاک پر دنیا بھر کی مختلف زبانوں میں اتنی کتب لکھی جا چکی ہیں (اور لکھی جا رہی ہیں) کہ ان سب کا شمار بھی دشوار ہے۔ دنیا کی جو زبان بھی مسلمان بولتے اور سمجھتے ہیں' ان سب میں سیرت طیبہ پر - ایک آدھ نہیں بلکہ - متعدد کتابیں موجود ہیں۔ مسلمانوں کے علاوہ اس ذخیرے میں اضافے کا سبب خصوصاً گزشتہ دو صدیوں میں غیر مسلم بھی بنے ہیں اس کی وجہ آپ شروع میں پڑھ آئے ہیں۔

ابتدائی کتب سیرت میں عربی میں ہی تھیں۔ اگرچہ عربی میں سیرتِ پاک پر تالیفات کا سلسلہ ختم نہیں ہو گیا بلکہ سیرت کے مختلف پہلوؤں پر اور مختلف مقاصد کے

Marfat.com

لئے تالیفات کا سلسلہ جاری ہے۔

دوسری زبانوں میں لکھی گئی کتبِ سیرت کے مآخذ تو ظاہر ہے کہ اصل عربی تصانیف ہی ہیں۔ بعض (غیر عربی کتابیں) کسی عربی کتاب کا ترجمہ ہوتی ہیں اور اکثر مستقل تالیف بھی ہوتی ہیں۔ عربی زبان کے بعد سب سے پہلے۔ دوسرے اسلامی ادب کی طرح۔ سیرت کی کتابیں بھی فارسی میں لکھی گئیں۔ ابتداء تراجم سے ہی ہوئی۔ ابو بکر سعد زنگی کے زمانے میں سیرت ابنِ اسحاق کے فارسی میں ترجمہ ہونے کا ذکر آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔ فارسی زبان میں کتبِ سیرت کے مؤلفین میں صرف ایران و افغانستان کے لوگ نہیں بلکہ برصغیر پاک و ہند کے بڑے بڑے نامور اہل علم کا بھی اس میں بڑا حصہ ہے۔ مثلاً شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (۱۰۵۲ھ - ۱۶۴۲م) کی مدارج النبوۃ غالباً فارسی زبان کی سب سے ضخیم اور جامع کتابِ سیرت ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ (وفات ۱۱۷۶ھ) کی سرور المحزون اور اطیب النغم مختصر مگر وقیع کتابیں ہیں۔

عربی فارسی کے علاوہ دنیائے اسلام کی معروف زبانوں میں سے ترکی اور اردو قابلِ ذکر ہیں۔ گزشتہ دو صدیوں میں خصوصاً یورپی زبانوں (انگریزی' فرانسیسی' جرمن' اطالوی اور اسپینی وغیرہ) افریقیائی زبانوں (سواحلی' حوسا' بربایا وغیرہ) اور دیگر ایشیائی زبانوں (چینی' جاپانی' انڈونیشی اور ہندی گجراتی وغیرہ) ان سب زبانوں میں بھی کتبِ سیرت لکھی گئی ہیں اور یہ کام جاری ہے۔

پاکستانی زبانوں میں تالیفاتِ سیرتؐ

پاکستان کی قومی زبان - اردو - کے علاوہ پاکستان کی قریباً تمام علاقائی زبانوں خصوصاً پنجابی' پشتو' سندھی اور کشمیری میں سیرت پاکؐ پر کتابیں موجود ہیں۔ ذیل میں ان کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

اردو

اردو میں اب اتنا زیادہ اور ہر قسم کا اسلامی لٹریچر موجود ہے کہ بلاشبہ اسے عربی

Marfat.com

کے بعد دنیائے اسلام کی سب سے بڑی علمی زبان قرار دیا جا سکتا ہے۔ سیرتؐ پر سب سے زیادہ جامع علمی اور تحقیقی کام بھی اردو زبان میں ہی ہوا ہے اور بہت سی عربی کتبِ سیرتؐ کے ترجمے بھی ہوئے ہیں۔

تراجم کتبِ سیرت میں سے سیرتؐ ابنِ ہشام ' طبقات ابنِ سعد ' تاریخ طبری (حصہ سیرتؐ) الشفاء اور زادالمعاد کے تراجم قابلِ ذکر ہیں۔

اردو زبان کی مستقل تالیفاتِ سیرتؐ کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ صرف علمی اور تحقیقی کتابوں کی تعداد بھی اتنی ہے کہ سب کا ذکر کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے صرف چند نہایت نمایاں ' اہم اور مقبول کتابوں کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱- اردو زبان کی سب سے زیادہ مایہ ناز کتابِ سیرت (سیرت النبیؐ) ہے جو علامہ شبلی نعمانیؒ اور علامہ سید سلمان ندویؒ کی مشترک تالیف ہے۔ سیرت النبیؐ کو - جو چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے ' بلاشبہ نہ صرف اردو زبان کی بلکہ دنیا بھر کی مختلف زبانوں میں لکھی گئی بہترین کتبِ سیرتؐ میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کی تالیف کا منصوبہ علامہ شبلی نعمانیؒ نے شروع کیا۔ انہوں نے پہلی جو جلدیں لکھی تھیں کہ فوت ہو گئے۔ باقی چار جلدوں کو ان کے بہترین شاگرد اور ساتھی سید سلمان ندویؒ نے مکمل کیا۔ سیرت النبیؐ کی پہلی جلد کا پہلا ایڈیشن ۱۳۳۶ھ - ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا تھا اور آخری (چھٹی) جلد ' ۱۳۵۷ھ - ۱۹۳۸ء میں مکمل ہوئی۔ اس طرح مکمل سیرت النبیؐ کی تالیف پر کم و بیش ایک چوتھائی صدی یعنی بیس پچیس سال صرف ہوئے۔ کتاب سیرتؐ کی مختلف جلدوں کے مشمولات یوں ہیں:

پہلی جلد : ولادت تا ختم سلسلۂ غزوات

دوسری جلد : عام الوفود تا وفات

تیسری جلد: دلائل و معجزات

چوتھی جلد: منصب نبوت

پانچویں جلد: عبادات

Marfat.com

چھٹی جلد: اخلاقی تعلیمات

۲- اردو میں سیرتؐ کی دوسری بہترین، مقبول ترین اور منفرد خصوصیات کی حامل کتاب قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی "رحمت للعلمینؐ" ہے جو دو جلدوں میں ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

۳- ان دو کتابوں کے علاوہ اردو کی کتبِ سیرتؐ میں سے محمد ادریس صاحب کاندھلوی کی "سیرت المصطفیٰؐ" بھی علمی انداز میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب بھی تین جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

۴- ڈاکٹر حمیداللہ کی تین کتابیں اردو میں مطالعۂ سیرتؐ کا اہم مواد پیش کرتی ہیں۔ یعنی رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی، عہد نبویؐ کے میدان جنگ اور عہد نبویؐ میں نظام حکمرانی۔

۵- اردو میں سیرتِ طیبہؐ پر ایک اور بہترین کتاب ابوالحسن ندوی کی "نبی رحمتؐ" ہے۔

اردو کے علاوہ دوسری پاکستانی زبانوں کی چند اہم کتبِ سیرتؐ کا تعارف درج ذیل ہے۔

پنجابی

پنجابی زبان میں کتبِ سیرتؐ کی ابتداء منظوم قصوں، نعت، میلاد، معراج ناموں اور معجزات کے رسائل سے ہوئی۔ ابتدائی کتابیں بیشتر منظوم ہی تھیں، اگرچہ بعد میں چند کتابیں نثر میں بھی لکھی گئیں تاہم پنجابی زبان کا بہترین ادبِ سیرت نظم کی صورت میں ہی ملتا ہے۔ پنجابی کتبِ سیرتؐ میں سے حسب ذیل قابلِ ذکر ہیں۔

۱- اکرام محمدیؐ (سیرت المصطفیٰ فی تفسیر سورۃ الضحیٰ) سورہ "الضحیٰ" (قرآن کریم کی ۹۳ ویں سورۃ) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علوّ مرتبت کے

Marfat.com

علاوہ آپؐ کی سیرت کے بعض قبل نبوت واقعات کی طرف اشارات بھی ہیں۔ ان کی بناء پر ضلع گوجرانوالہ کے ایک شاعر عبدالستار نے آج سے ستّر اسّی سال پہلے اکرام محمدیؐ کے نام سے یہ ضخیم کتاب پنجابی نظم میں لکھی تھی۔ کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ غالباً اس کتاب کی مقبولیت کی بناء پر ٹھیک اسی نام اور اسی عنوان سے ایک پنجابی منظوم کتاب دلپذیر بھیروی نے بھی لکھی۔ بھیرہ ہی کے ایک اور صاحب محمد ازہر نے بھی پنجابی نظم ہی میں "گلزارِ محمدیؐ" کے نام سے کتاب شائع کی تھی جس کا دوسرا نام " تحفہ ازھر بحضور خیر البشر" رکھا تھا۔ مولوی حبیب اللہ قادری نے بھی تفسیر والضحیٰ پر مبنی ایک منظوم کتاب سیرت " اکرام مصطفیٰؐ" کے نام سے لکھی تھی۔

۲- شاہ نامہ اسلام کے نام سے غلام سرور کنجاہی نے بھی ایک منظوم کتاب لکھی جو لاہور سے شائع ہوئی ہے۔

۳- شانِ حضور خیر البشر المعروف کملی والا ۔ اس کتاب کے مؤلف حکیم عبداللطیف عارف تھے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۳۴۳ھ میں امرتسر سے "خیر البشر" کے تاریخی نام سے شائع ہوا تھا۔ یہ کتاب خاصی ضخیم ہے اور پنجابی نظم و نثر کا مجموعہ ہے۔ آجکل یہ کتاب ایم اے پنجابی کے نصاب میں بھی شامل ہے۔

۴- پنجابی نثر میں لکھی گئی کتبِ سیرت میں سے دو کتابیں قابل ذکر ہیں:

۵- "نبیاں دا سردارؐ" ۔ اس کے مؤلف حبیب اللہ فاروقی ہیں۔ کتاب ولادت تا وفات کے واقعات پر مشتمل ہے اور جیسا کہ خود مؤلف نے لکھا ہے زیادہ تر قاضی سلیمانؒ کی کتاب " رحمت للعالمین" پر مبنی ہے۔

"سچّی سرکارؐ" یہ مختصر سی کتاب ہے اور حکیم عبدالکریم ثمر (اچھرہ لاہور) کی تالیف ہے۔

Marfat.com

پشتو

پشتو زبان میں بھی زیادہ ترکتبِ سیرت معجزات کے بیان پر ہیں۔ (ان میں سے اخوند عبدالکبیر کی "معجزات کلاں" ذرا جامع کتاب ہے۔

پشتو میں بعض مشہور کتب سیرت کے ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ مثلاً سیرت النبیؐ (شبلی) کا ایک تلخیص شدہ ترجمہ عبدالکریم خان مظلوم نے کیا ہے جو "آخری پیغمبر" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ دوسرا ترجمہ مولوی محمد اسماعیل صاحب نے کیا ہے جسے "سیرت النبیؐ" ہی کے نام سے پشتو اکیڈیمی پشاور نے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ یہ بھی تلخیص (خلاصہ) ہی ہے۔ پشتو نثر میں لکھی گئی کتابوں میں سے ایک قابلِ ذکر کتاب "نبکلی رسول) ہے جو محمد خان میں ہلالی کی تالیف ہے۔ اس میں سیرت کے واقعات چار ادوار میں تقسیم کر کے بیان کئے گئے ہیں۔

بلوچی اور براہوی

بلوچی اور براہوی زبانوں میں بھی عوامی سطح کی منظوم کتبِ معجزات معراج نامہ اور وفات نامہ وغیرہ کی شکل میں ملتی ہیں۔ بلوچی زبان میں "الکیرلین" کی "دو جھانءِ سردار" اور براہوی میں مولوی عبدالعزیز کی "قصص الانبیاء عرف کان جوھر" قابلِ ذکر ہیں۔

سندھی

پاکستانی زبانوں میں سندھی سب سے پہلی زبان ہے جو اسلام سے آشنا ہوئی۔ سندھی زبان میں بہت عمدہ اور اچھی خاصی مقدار میں دینی ادب موجود ہے۔ ان میں سے نعت، معجزات اور صلوات کے موضوع پر بہت سے لوگوں کا کلام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے چار مجموعوں میں ۔ معجزا، مناقبا، مولود اور مداحوں ءِ مناجاتوں کے ناموں سے شائع کیا ہے۔ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی کی کتاب "قوت العاشقین" جو فضائل اور معجزاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر مشتمل ہے۔ یہ برصغیر کی زبانوں میں لکھی گئی اوّلین کتبِ سیرت میں شمار ہوتی ہے (کتاب کا سنہ تالیف ۱۱۲۰ھ ہے)۔

Marfat.com

دوسری زبانوں میں لکھی گئی کتبِ سیرتؐ کے کچھ ترجمے بھی سندھی میں کیئے گئے ہیں۔ ان میں سے حسبِ ذیل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

شمائل ترمذی (جو مشہور محدث امام ترمذی کی تالیف ہے اور شمائل و فضائل النبیؐ پر مشتمل ہے) کے متعدد ترجمے سندھی میں ہوئے ہیں۔ مثلاً مخدوم عبدالسلام تتولی نے ۱۱۹۷ھ میں شمائل ترمذی کا منظوم ترجمہ کیا۔ یہ بمبئی سے شائع بھی ہوا تھا۔ دوسرا ترجمہ عبدالکریم قریشی گوٹھ پیر (تعلقہ قنبر علی خان) نے کیا اور ایک تیسرا ترجمہ قاضی محمد عثمان (پنو عاقل) نے بھی کیا ہے۔

اردو کی مشہور کتاب سیرتؐ شبلی و سلیمان کی "سیرت النبیؐ" کا سندھی ترجمہ مولوی فضل احمد غزنوی نے کیا ہے۔ اور قاضی سلیمان کی "رحمت اللعالمین" کا ملخص (خلاصہ) ترجمہ "حالات نبویؐ عرف حیات النبیؐ کے نام سے علی خان ابڑو نے کیا ہے۔ فقیر وحید الدین کی مرتب کردہ مختصر مگر جامع اور بلحاظ حسنِ طباعت مشہور کتاب کا سندھی ترجمہ بھی "محسنِ اعظم ءِ محسنین" کے ہی نام سے اپنی روایتی خوبصورتی کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

سندھی زبان میں لکھی گئی مستقل کتبِ سیرت میں سے خصوصاً قابلِ ذکر نام تین ہیں۔ ایک تو حکیم مولوی فتح محمد سیوستانی کی "حیات النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے جو سندھی کی مقبول کتابوں میں سے ہے۔ اسے سندھی ادبی بورڈ نے شائع کیا ہے۔ دوسری کتاب "نیهی جهانن جو سردار" ہے جو امیر احمد مخدوم کی تالیف ہے۔ تیسری کتاب "سیرت مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم ہے جس کے مؤلف مولوی محمد عظیم شیدا ہیں۔ اس (تیسری) کتاب کو بھی سندھی ادبی بورڈ نے شائع کیا ہے اور اس کتاب کو ۱۹۸۰ء کے مقابلہ "کتب سیرتؐ" میں حکومتِ پاکستان کی طرف سے دس ہزار روپے کا انعام بھی مل چکا ہے۔ یہ سندھی کی پہلی انعام یافتہ کتاب سیرتؐ ہے۔

Marfat.com

کشمیری

کشمیری میں بھی سیرتؐ کے موضوع پر خاصا کام ہوا ہے۔ مثال کے طور پر "مغازی النبیؐ" کے نام سے شیخ یعقوب صرفی نے فارسی میں کتاب لکھی تھی جس کا کشمیری زبان میں ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ اسی طرح یوسف بخاری نے "سیرت النبیؐ" کے نام سے کشمیری میں کتاب لکھی جو لاہور سے چھپی ہے۔

آنند رام اور ستہ رام بٹ کا نعتیہ کلام کشمیری میں موجود ہے۔ مہدی ترالی (سال وفات ۱۸۹۸ء/۱۳۱۶ھ) نے جنگِ خیبر پر ایک مثنوی لکھی واعظ حیدر بابا نے (جو ۱۸۵۸ء میں زندہ تھے) کشمیری میں نعت و مناجات پر "شمائل نبویؐ" اور "مشک نامہ نبویؐ" کے نام سے کتابیں لکھی ہیں۔

امیر الدین کریری نے "معراج احمدی" اور "انوارِ محمدیؐ" کے نام سے نعتیہ کلام مرتب کیا۔ اسی طرح احد بٹ (وفات ۱۹۲۴ء /۱۳۲۰ھ) اور عبدالاحد ناظم کا نعتیہ کلام بھی دستیاب ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

عصرِ حاضر میں سیرت طیبہ کی اہمیّت

عصرِ حاضر کا لغوی معنیٰ

لفظ " عصر" کے معنیٰ ہیں زمانہ ' وقت ' مدت ' دور ' عہد اور تیسرا پہر (جیسے نمازِ عصر میں)۔ اول لفظ " حاضر " کے معنیٰ ہیں ' موجود ' حال (جیسے گرامر میں زمانۂ حال)۔ اس طرح " عصرِ حاضر" کا مطلب ہوا عہدِ حاضر ' موجودہ زمانہ ' موجودہ دور ' وغیرہ آج کل عصر کا لفظ زیادہ تر زمانہ اور دور یا عہد کی طرح - وقت کے ایک خاصے لمبے عرصے کے لئے بولا جاتا ہے' جو کئی برسوں سے لے کر صدیوں تک ہو سکتا ہے۔ جب بہت ہی لمبا زمانہ یا کئی دور مدت ہائے دراز مراد لینا ہو تو عصر کی جمع (عصور) بھی استعمال ہوتی ہے۔

عصرِ حاضر کا تاریخی مفہوم

اس طرح عصرِ حاضر کا سیدھا سادہ مطلب تو یہ بنا - یہ دور یا زمانہ جس میں ہم رہ رہے ہیں۔ مگر دن ' رات ' مہینہ ' سال یا صدی کے برعکس "عصر" کی کوئی مقدار یا مدت مقرر نہیں ہے۔ تاریخ کے کسی حکمران خاندان کی طرف نسبت (اضافت) کے ذریعے سے کسی عصر کی ابتداء یا انتہاء کو بھی متعین کیا جا سکتا ہے مثلاً عصرِ عباسی یا غزنوی عہد وغیرہ۔ تاہم جب ہم صرف موجودہ دور یا عہد حاضر کہتے ہیں تو اس سے "دور" یا " عہد" یا عصر کی ابتداء کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس سے زمانہ حال سے ماضی کی طرف کے کئی (بلکہ بیسیوں) برس ضرور مراد ہوتے ہیں۔ عصر یا عہد یا دور کے الفاظ ہمیشہ لمبے عرصے اور مدت کے ایک طویل یونٹ پر بولے جاتے ہیں۔ یوں عصر حاضر کا مطلب ہوا ہمارا زمانہ یا موجودہ دور جب سے شروع

Marfat.com

ہوا ہے' اس وقت سے لے کر آج تک - بلکہ آج سے بھی کچھ عرصہ بعد تک کا زمانہ۔

تاریخ عالم کا مطالعہ کرنے کے لئے اسے کئی ادوار یا زمانوں (کے وقفوں) میں تقسیم کیا جاتا ہے اور اس تقسیم میں ہر دور یا عہد کا نام اس دور کی بعض نمایاں اور مشترک خصوصیات کی بناء پر رکھا جاتا ہے۔ مثلاً پتھر کا زمانہ ' دھات کا زمانہ ' ایٹمی دور وغیرہ۔ انسانی معاشرہ جب سے وجود میں آیا ہے مسلسل ارتقاء پذیر رہا ہے۔ ارتقاء کی یہ داستان سمجھنے کے لئے کبھی تاریخی ادوار کو ترتیب (زمانی) کے لحاظ سے بھی چند ایک ادوار میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ مثلاً زمانۂ قبل از تاریخ ' زمانۂ قدیم ' قرونِ وسطیٰ اور عہدِ حاضر۔ اس تقسیم میں ہر دور یا عہد کی مدت یا عرصہ کی مقدار یکساں (مثلاً ایک ایک ہزار سال) نہیں ہوتی۔ بعض دور بہت طویل اور بعض نسبتاً کم مدت پر مشتمل ہوتے ہیں۔ برسوں یا صدیوں کے برعکس ان کے آغاز اور اختتام کی کوئی قطعی تاریخ مقرر نہیں ہوتی ' بلکہ اندازے سے کسی خاص صدی کو اس دور کی ابتداء یا انتہاء تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ اس زمانی تقسیم کے لحاظ سے بھی ہر تاریخی دور اپنی کچھ مشترک خصوصیات رکھتا ہے جس سے وہ اپنے سے پہلے کے اور بعد کے ادوار سے نمایاں اور ممتاز ہو جاتا ہے - یوں آپ دیکھتے ہیں کہ تاریخی لحاظ سے "عصر حاضر" سے مراد طویل انسانی تاریخ کا جدید یا موجودہ دور ہے' جس میں ہم رہ رہے ہیں۔ یہ دور کہاں سے شروع ہوا ؟ اور اس کی اہم خصوصیات کیا ہیں ؟ اس پر اگلے حصے میں بات ہو گی۔

عصرِ حاضر کا آغاز

آپ نے ابھی پڑھا کہ ہر تاریخی دور کی کچھ نمایاں خصوصیات ہوتی ہیں بلکہ بعض دفعہ ان خصوصیات کی ایک اصلی اور سب خصوصیات پر مشتمل ایک بڑی خصوصیات ہی اس دور کی نمایاں خصوصیت ہوتی ہے ۔ یہی بڑی خصوصیت اس دور کو اس سے پہلے اور بعد کے ادوار سے ممتاز کرتی ہے ۔ اس لئے اس خصوصیت کی بنا پر مؤرخین اس عہد یا دور کے آغاز اور اختتام کا عرصہ مقرر کر لیتے ہیں۔

Marfat.com

اس پہلو سے دیکھا جائے تو عصر حاضر یا ہمارے زمانے کی سب سے بڑی اور امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ سائنسی اور صنعتی ترقی کا دور یا فنی اور مشینی دور ہے۔ (Age of Technology) سائنس اور صنعت کا وجود یوں تو ہر زمانے اور ہر معاشرے میں کسی نہ کسی درجے میں رہا ہے۔ انسانی تاریخ کے طویل ادوار میں مختلف تہذیبیں اور قومیں اس میدان میں ایجادات اور انکشافات کا اضافہ کرتی رہی ہیں - مگر جس تیزی اور وسعت کے ساتھ سائنس، مشینی صنعت اور فنی مہارت (ٹیکنالوجی) نے ہمارے زمانے میں ترقی کی ہے، اس کی پچھلے ادوار میں کہیں مثال نہیں ملتی۔ بجا طور پر یہ دور "سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور" ہے۔ یہی سائنس اور ٹیکنالوجی ہی تاریخِ انسانی کے اس دور کی اصل بڑی اور جامع خصوصیّت ہے - باقی خصوصیات جن کا ہم ابھی ذکر کریں گے، وہ در اصل سب اسی کے اثرات اور نتائج ہیں۔

سائنسی دور کا آغاز - یورپ سے

اس سائنسی اور فنی دور کا آغاز یورپ سے ہوا اور اس کے بڑے مرکز برطانیہ اور فرانس تھے جہاں سے "صنعتی انقلاب" پورے یورپ اور امریکہ میں پہنچا۔ یوں تو صنعتی مشینوں کی ایجاد کی سلسلہ (خصوصاً کپڑے کی صنعت میں) اٹھارہویں صدی عیسوی میں شروع ہو گیا تھا۔ تا ہم اس انقلاب میں سرعت اس وقت آئی جب اسی صدی کے آخر پر سٹیم انجن ایجاد ہوا اور خصوصاً انیسویں صدی کے آغاز میں، جب سب سے پہلے سٹیم انجن کا استعمال ریلوے میں ہونے لگا۔ اس کے بعد سے مختلف صنعتوں کے لئے بڑے کارخانوں (فیکٹریوں) کے قیام اور پھر نت نئی مشینوں اور آلات کی ایجادات کا ایک روز افزوں سلسلہ شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔ روز مرہ کی عام استعمال کی اشیاء سے لے کر جدید ترین فوجی اسلحہ اور خلائی جہاز تک سب میں اسی دور کے سائنسی کرشمے نظر آتے ہیں۔

Marfat.com

سائنسی ترقی کی دوڑ میں دوسرے ممالک کی شمولیت

اس طرح "عصرِ حاضر" کو صحیح معنوں میں گزشتہ دو صدیوں انیسویں اور بیسویں صدی پر مشتمل زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے اس دور کا آغاز یورپی اقوام (خصوصاً برطانیہ ' فرانس اور امریکہ) سے ہوا اور شروع سے ہی سائنسی اور صنعتی ترقی کے لیڈر بلکہ اس پر اجارہ دار بھی وہی تھے۔ اب بھی اس میدان میں برتری ان (یورپی اقوام) کو ہی حاصل ہے' تاہم ان کی تقلید ' امداد اور شاگردی کی بدولت ایشیائی اور افریقی ممالک سے بھی بیشتر اب صنعتی اور سائنسی ترقی کی اس دوڑ میں شامل ہو گئے ہیں بعض تو اس میدان میں کئی لحاظ سے یورپ کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ (مثلاً جاپان) اور بعض ممالک ابھی گھٹنوں کے بل چل رہے ہیں۔

عصرِ حاضر کی یہ نمایاں خصوصیت - سائنسی ' صنعتی اور. مشینی دور ہونا - اور اس کے اثرات اور نتائج کسی ایک خطہ ارضی تک محدود نہیں بلکہ قریباً عالمگیر ہیں۔

عصر حاضر کی چند دیگر خصوصیات

عصرِ حاضر کی اس سائنسی اور صنعتی ترقی ' مشینی ایجادات اور اس میدان میں شروع سے ہی یورپی اقوام کی علمبرداری کے باعث ' اس دور کو چند مزید تاریخی ' سیاسی ' مذہبی ' معاشی ' معاشرتی ' تعلیمی اور ثقافتی خصوصیات بھی حاصل ہو گئی ہیں۔ ذیل میں ان خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

یورپی اقوام کی سیاسی توسیع اور برتری

مجموعی طور پر یہ دور یورپ کے غلبے اور برتری کا دور ہے۔ سائنسی اور صنعتی برتری خصوصاً مشینی مواصلات اور جدید اسلحہ کی ایجاد نے یورپی اقوام کے سیاسی غلبے کی راہ ہموار کی۔ یہ عمل یوں تو سترھویں اٹھارھویں صدی میں شروع ہو چکا تھا مگر انیسویں اور بیسویں (گزشتہ دو) صدی میں اس کی رفتار تیز تر ہو گئی اور بیسویں صدی کے قریباً نصفِ اول (دوسری عالمگیر جنگ) تک امریکہ ' ایشیا اور افریقہ کے بیشتر علاقے مختلف

Marfat.com

یورپی اقوام (برطانیہ ' فرانس ' سپین ' بلجیم ' پرتگال ' روس ' جرمنی ' ہالینڈ اور اٹلی وغیرہ) کے زیر نگین آ گئے۔ اس عرصے میں صرف شمالی امریکہ کی چند نو آبادیوں نے اپنے (سابقہ وطن) یورپی آقاؤں کے خلاف بغاوت کر کے اپنی الگ خودمختار حکومت "ریاستہائے متحدہ امریکہ" کے نام سے قائم کر لی۔

جسے اب مختصراً امریکہ ہی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ شمالی اور جنوبی امریکہ متعدد خودمختار ممالک پر مشتمل ہیں۔ اس نئی ریاست کا حکمران طبقہ اور بیشتر ترقی یافتہ آبادی بھی نسلاً یورپی ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے یہ خود بھی اپنی آزادی کے فوراً ہی یورپی طاقتوں کی طرح اپنے استعماری اور نو آبادیاتی پروگرام (مثلاً افریقہ سے غلاموں کی درآمد) میں لگ گئے۔

جرمنی کے سمندر پار مقبوضات پہلی جنگ عظیم (۱۸ - ۱۹۱۴ء) کے خاتمے پر اور اٹلی کی نو آبادیات یا مقبوضہ علاقے دوسری جنگ عظیم (۴۵ - ۱۹۳۹ء) کے بعد فاتح اقوام نے آپس میں تقسیم کر لیے۔

یورپی اقوام کے سیاسی انحطاط کی آغاز

ہم نے ابھی بیان کیا ہے کہ مجموعی طور پر "عصر حاضر" یورپی اقوام کی سیاسی برتری کا دور ہے۔ تاہم اسی دور میں ہی بیشتر یورپی اقوام کا سیاسی زوال بھی شروع ہو گیا ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد قریب قریب تمام یورپی نو آبادیات اور مقبوضات اب خودمختار اور آزاد ممالک بن چکے ہیں۔

یورپی طاقتوں میں سے اب تک روس ہی ہے جو ابھی تک نہ صرف اپنے مقبوضات پر مسلط ہے بلکہ فوجی طاقت کے بل بوتے پر اب بھی اپنی توسیع پسندی کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ البتہ ریاستہائے متحدہ (امریکہ) اپنی سیاسی اور سائنسی و صنعتی قوت کی بنا پر روس کا ہم پلہ ' حریف اور مد مقابل ہے۔ بظاہر ان دو کا انحطاط ابھی شروع نہیں ہوا لیکن غالباً اس کے بھی اسباب جمع ہونے شروع ہو گئے ہیں۔

Marfat.com

مسیحیت کی اشاعت کا دور

اس دور میں جن یورپی اقوام نے سائنسی اور صنعتی ترقی کے ساتھ اور اس کی بناء پر سیاسی غلبہ حاصل کیا' وہ سب بلحاظ مذہب مسیحی اقوام تھیں۔ اس لیے وہ جہاں بھی گئے' وہاں انہوں نے بڑے جوش' ولولے اور تدبّر کے ساتھ مسیحی مشنریوں کی بڑی سرپرستی کی مقبوضہ علاقوں میں مسیحی مشنوں کو بڑی بڑی جائیدادیں دی گئیں۔ مقبوضہ ممالک کے تمام اہم شہروں میں (خصوصاً جہاں چھاؤنیاں تھیں) حکومتوں کی امداد اور سرپرستی سے مسیحی ہسپتال اور مسیحی تعلیمی ادارے قائم کیے گئے جو تبلیغ و اشاعت مسیحیت کے جذبے کے ساتھ کام کرتے رہے اور کر رہے ہیں۔ یورپی مسیحی حکومتوں کی پشت پناہی کے علاوہ مغرب کی بے قید و بے حجاب طرز معاشرت کی دلکشی بھی مسیحیت کے فروغ کا باعث بنی ہے۔ حالانکہ یہ مسیحیت کی دی ہوئی معاشرت نہیں بلکہ مسیحی یورپ کی یونان اور روم سے لی ہوئی معاشرت ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا عروج

سائنس اور صنعتی انقلاب کی وجہ سے جو بڑے بڑے کارخانے اور فیکٹریاں قائم ہوئیں' ان کی قوت پیداوار مشینی دور سے پہلے کے کارخانوں کے مقابلے پر کئی سو بلکہ کئی ہزار گنا زیادہ تھی۔ پیداوار کی کثرت اور حکومتوں کی طرف سے خصوصاً نو آبادیاتی منڈیوں میں حاصل شدہ تجارتی مراعات اور تحفظات - سب مل کر کارخانوں کے مالکوں کے لیے بے پناہ دولت کے حصول کا باعث بنے۔ اس کے نتیجے میں سائنسی اور صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ ممالک کے اندر ایک صنعتی امپریلزم (شہنشاہیت) کی بنیاد پڑی۔ بعض قارون صفت صنعت کاروں کی ذاتی دولت - جو شاہی خاندان کی دولت سے تو زیادہ ہوتی ہی ہے - بعض دفعہ تو حکومتِ وقت کے خزانے سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔

سوشلزم اور کمیونزم کا ظہور

صنعتی انقلاب کے نتیجے میں پیدا ہونے والی حد سے بڑھی ہوئی سرمایہ داری اور

Marfat.com

سرمایہ دار کی بڑھتی ہوئی اخلاقی بے راہ روی ' اخلاقی پستی ' بے دردی اور خود غرضی - اور مزدور و سرمایہ دار کے درمیان اتنا معاشی بعد جس کی پہلے تاریخ میں مثال نہیں ملتی- یہ تھے وہ عوامل جنہوں نے مزدور اور کارکن طبقے میں ایک احساس محرومی پیدا کیا اور اس کے رد عمل نے ' انتہا پسندانہ سرمایہ داری کے مقابلے پر ایک انتہا پسندانہ معاشی فکر کو جنم دیا جسے سوشلزم اور جس کی انتہائی شکل کو کمیونزم کہا جاتا ہے۔ اسی عصرِ حاضر میں کمیونزم اپنی سیاسی فتوحات اور انقلابات کی بنا پر مذہب اور سرمایہ داری کے خلاف ایک بہت بڑی قوت بن کر دنیا پر چھایا نظر آتا ہے۔

بنیادی انسانی حقوق کی طلب - حق رائے دہی اور جمہوریت

جس طرح صنعتی امپریلزم کے خلاف رد عمل سوشلزم اور کمیونزم کی شکل میں ظاہر ہوا ' اسی طرح سیاسی امپریلزم کے بے لگام اختیارات کے مقابلے پر اور رد عمل کے طور پر عوام میں کم از کم بنیادی حقوق ' شخصی آزادی ' حریّت اور مساوات کے طلب پیدا ہو گئی۔ بعض یورپی ممالک میں جمہوری پارلیمانی حکو متوں کا قیام اسی رد عمل اور طلب مساوات کا نتیجہ تھا اور عوام کو رائے دہی (ووٹ) کا حق ملنا اسی کا ایک مظہر ہے - عصرِ حاضر کی سیاسی فکر میں جمہوریت کو ایک مسلمہ حیثیت حاصل ہو گئی ہے - حتی کہ روس امریکہ ایسے دو متضاد نظام ہائے معشیت (اشتراکیت اور سرمایہ داری) بھی کم از کم نظریاتی طور پر تو--- جمہوریت ہی کے مدعی ہیں - جمہو ریت ' حریت اور مساوات کی کوشش اور طلب ہی محکوم ملکوں میں آزادی کی تحریکوں کا باعث بنی ہے اور یہ عصر حاضر کی ایک خصوصیت ہے -

نیشنلزم : وطن پرستی اور نسل پرستی

یورپ میں صنعتی انقلاب کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بعض معاشی اور معاشر تی بحر انوں پر قابو پانے اور ملکی سیاست کو استحکام دینے کے لئے نسل اور وطن پر مبنی قومیت کا تصور ابھرا۔ اس کا نتیجہ بعض ملکوں میں ڈکٹیٹر شپ (جمہوریت کی ضد)

Marfat.com

کی صورت میں نکلا --- نسل ' زبان یا وطن پر مبنی قومیت کا تصور بھی عصر حاضر کی ایک اہم خصوصیت یا اس دور کا ایک اہم مسئلہ ہے جس کے اسباب و نتائج پر بحث ہمارے مو ضوع سے خارج ہے لیکن جس کا تعلق ہمارے اصل مو ضوع مطالعہ سیرت سے بھی بنتا ہے جیسا کہ آپ آگے چل کر پڑھیں گے۔

عالم اسلام کا سیاسی انحطاط اور زوال

یو رپی اقوام نے جن علاقوں پر تسلط جمایا ' اس میں سے ایشیا اور افریقہ کے بیشتر علاقے ایسے تھے جہاں مسلمان بلحاظ آبادی اکثریت میں تھے (مثلاً انڈونیشیا) یا وہ علاقے پہلے مسلمانوں کی حکومت میں شامل تھے (مثلاً بر صغیر پاک وہند اور شمالی افریقہ کے ممالک)۔ انیسویں صدی کے آخر پر روس نے وسط ایشیا کی مسلمان ریاستوں کو ہڑپ کر لیا اور پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر یورپی فاتحین نے عثمانی سلطنت کے حصے بخرے کر لیے ۔ مسلمانوں کے سیاسی زوال کی انتہا تھی کہ ایک آدھ ملک کو چھوڑ کر تمام اسلامی مما لک یورپی اقوام کی محکومی میں چلے گئے اور اپنی سیاسی آزادی کھو بیٹھے ۔

عالم اسلام میں بیداری کی لہر

ہم نے ابھی بیان کیا ہے کہ عصرِ حاضر نے جہاں ایک طرف یورپی اقوام کا سیاسی عروج دیکھا ' وہاں اسی دور میں ان کے زوال و انحطاط کا آغاز بھی محسوس کیا جانے لگا ہے۔اسی طرح عہد حاضر میں سیا سی انحطاط کی انتہا تک پہنچ جانے کے بعد عالم اسلام میں سیاسی اور دینی بیداری کی ایک لہر بھی پیدا ہوگئی ہے ۔ قریباً تمام مسلم علاقے' ما سوائے روسی مقبوضات کے 'اب یورپی تسلط سے آزاد ہو کر خود مختار ہو گئے ہیں ۔ اگرچہ یورپی حکمران جاتے جاتے بھی کوشش کر کے بعض علاقوں مثلاً کشمیر ' قبرص اور فلسطین --- میں مسلمان آبادی کے لئے ' اور ملحقہ مسلمان ملکوں کے لئے کچھ مسائل پیدا کر گئے ہیں ۔

Marfat.com

دو عالمی جنگیں اور تیسری تباہ کن جنگ کا خطرہ

عصر حاضر کی ایک خصوصیت -- جس نے انسانی ذہن کو سب سے زیادہ مضطرب کیا ہے --- یہ بھی ہے کہ تاریخ انسانی کی دو سب سے زیادہ خوفناک اور وسیع جنگیں اس دور میں لڑی گئیں۔ ان کا میدان جنگ کوئی ایک علاقہ نہیں تھا سائنسی اور صنعتی ترقی نے اسلحہ سازی کے میدان میں انسان کو ایٹم بم ایسی تباہ کن ایجاد تک پہنچا دیا جس کی تباہ کاری دوسری جنگ عظیم میں دنیا مشاہدہ کر چکی ہے۔ اس کے بعد سے اتنا خوفناک اسلحہ ایجاد اور تیار ہو چکا ہے جس کی تباہ کاری اور ہلاکت خیزی کے مقابلے پر ایٹم بم بھی کھلونے کی حیثیت رکھتا ہے اور جو پورے کرۂ ارض سے زندگی کا نام ونشان مٹادینے کے لئے کافی ہے۔ دوسری طرف یہ خطرہ کہ بڑی طاقتوں کی حق دشمن سیاست کسی وقت پوری دنیا کی تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہیں "عصر حاضر" نسل انسانی کا "عصر آخر" ہی ثابت نہ ہو یہاں تک جو کچھ بیان ہوا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عصر حاضر کی سب سے بڑی خصوصیت تو سائنسی، علمی اور صنعتی ترقی ہے اس ترقی کے نتیجے میں سامنے آنے والی بعض دیگر خصوصیات حسب ذیل ہیں (۱) یورپی اقوام کے سیاسی عروج کی انتہاء اور زوال کا آغاز (۲) مسیحیت کی اشاعت اور مغربی طرز معاشرت کا فروغ (۳) سرمایہ دارانہ انتظام کا عروج اور سوشلزم اور کمیونزم کا ظہور (۴) نیشنلزم اور جمہورت کا ارتقاء (۵) عالم اسلام کی سیاسی انحطاط کی انتہا اور ایک نئی سیاسی و دینی بیداری کی لہر (٦) تاریخ کی دو خوفناک جنگوں کا مشاہدہ اور تیسری خوفناک ترین جنگ کے خطرات کا سر پر منڈلانا۔

عصر حاضر کی خصوصیات کے مثبت اور منفی اثرات

عصرِ حاضر کی نت نئی سائنسی اور صنعتی "ترقیاں" اور روز افزوں مشینی سہولتیں تاریخ کے اس دور کے انسان کے لئے جہاں کئی منافع اور برکات کا باعث بنی ہیں، وہاں وہ اپنے ساتھ کئی برائیاں اور نقصانات بھی لائی ہیں۔ ہم یہاں ان کی برکات اور مفسدات

Marfat.com

کے صرف چند ایسے گوشوں کی نشاندہی کرتے ہیں جن کا ہمارے اس یونٹ کے موضوع کے اگلے حصے کے ساتھ کچھ تعلق بنتا ہے ۔ (جیسا کہ آپ آگے پڑھیں گے)۔

مثبت اثرات ۔ مواصلاتی انقلاب۔

مشینی ذرائع آمدو رفت اور تیز رفتاری برّی بحری اور فضائی مواصلاتی وسائل نے اس دور میں یورپی دنیا کو ایک گھر بنا دیا ہے۔ سفر کی اغراض کئی ہو سکتی ہیں ۔ مثلاً معاشی تجارتی سیاسی ' تبلیغی یا تعلیمی وغیرہ -- کوئی بھی ایسی غرض یا مقصد جس کا حصول ما تکمیل ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر پر منحصر ہے یا سفر اس میں مدد و معاون ثابت ہو سکتا ہے اس کے لیے تیزی اور حفاظت کے ساتھ سفر کرنے کی جو سہولتیں آج کے انسان کو میسر ہیں زمانۂ قدیم در کنار' آج سے دو صدی پہلے کے انسان کے لیے ان کا تصور بھی ممکن نہ تھا۔ مختلف اقوام و ممالک کے انسانوں کے باہمی ارتباط و اختلاط کے یہ امکا نات اپنا ایک روشن اور مثبت پہلو بھی رکھتے ہیں ۔ اسی طرح ذرائع ابلاغ و اطلاع اور پیغام رسانی کی سمعی و بصری (بذریعہ ریڈیو ٹیلی ویژن ' ٹیپ وغیرہ) طلسماتی سرعت اس دور کا ایک -- بلکہ سب سے بڑا --اعجو بہ ہے ۔ ان ذرائع اور رسائل کا تعلیمی ' تدریسی اور اخلاقی و تبلیغی مقاصد کے لیے استعمال یقیناً بے شمار مثبت نتائج کا حامل ہو سکتا ہے۔

تعلیمی انقلاب

طباعت کی ایجاد اگرچہ عصر حاضر (گزشتہ دو صدی) سے پہلے ہو چکی تھی ' تاہم اس فن سے متعلق عجیب و غریب ایجا دات اور اس کے انقلاب انگیز ممکنات عصرِ حاضر ہی میں ظاہر ہوئے ۔ سرعت ' صحت اور لطافت کے تقاضے بدرجۂ احسن پورے کرنے والی ایجادات نے کتاب سازی اور مطالعاتی مواد کی تیاری کو ایک صنعتی سائنس اور فنِ جمیل بنا دیا ہے ۔ دنیا بھر میں مجموعی طور پر فیصد تناسب خواندگی گزشتہ ادوار کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ ہو گیا ہے ۔ آج سے چند صدیاں پہلے بعض اقوام و مذاہب میں

Marfat.com

تعلیم و تعلم کو ایک خاص مراعات یافتہ طبقے کی اجارہ داری سمجھا جاتا تھا ۔ آج تعلیم و تدریس کی ' خواہ وہ سائنسی اور فنی ہو یا ادبی و لسانی -- نہ صرف اشاعت عام ہو گئی ہے بلکہ مشینی طباعت کے جدید طریقوں نے اسے بے حد دلکش بھی بنا دیا ہے ۔

شوقِ تحقیق

سفر ' مواصلات اور نشر و اشاعت کی جدید مشینی سہولتوں نے عصر حاضر میں قوموں اور ملکوں کے تعاون باہمی کی جو راہیں کھولی ہیں ' اس کے نتیجے میں تقابلی مطالعہ ادیان کا ایک نیا میدانِ عمل بھی سامنے آیا ہے ' یعنی تمام ادیان و مذاہب کی تاریخ اور تعلیم سے واقف اور اس کا مطالعہ اب ایک مستقل مضمون اور موضوع علم بن گیا ہے ۔ اس مطالعے کے محرکات اگرچہ کئی قسم کے ہو سکتے ہیں ' مثلاً کوئی سیاسی غرض ' کوئی ذہنی تعصب ' یا محض تجسس اور اعجوبہ پسندی بھی اس کا محرک ہو سکتی ہے ۔ تاہم تلاش حق ' ناقدانہ نقطہ نظر اور معقولیت پسندی کے پنپنے کے روشن امکانات بھی موجود ہیں ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دنیا کے عام حالات نے امن و سکون کی تلاش کی تڑپ پیدا کر دی ہے ۔

امن کی تلاش

دو عالمی جنگوں کی خوفناک تباہی کے تجربے اور تیسری مہلک ترین جنگ کے خوف نے آج کے انسان کے اندر امن و سلامتی کی طلب اور تلاش سکون کی ایک تڑپ پیدا کر دی ہے ۔ اس مقصد کے لیے وہ ہر " راہ رو " کے ساتھ تھوڑی دور تک چلنے پر آمادہ بھی ہو جاتا ہے مگر وہ صحیح " رہبر " کی پہچان کے لیے بے چین بھی ضرور ہے ۔ اس نقطہ نظر سے سیرت کے مطالعے اور اس کی اشاعت کی اہمیت پر آپ یونٹ کے آخر میں کچھ مزید بھی پڑھینگے۔

سیاسی اور دینی بیداری

یورپی اقوام کے سیاسی تسلط کے خلاف رد عمل کے طور پر اور محکومی و انحطاط

Marfat.com

کی پستی کا مزہ چکھ لینے کے بعد اب عالم اسلام میں سیاسی اور دینی بیداری کی ایک لہر بھی پیدا ہو گئی ہے اور اسلام کے غلبۂ ثانی کے لیے ایک تاریخی عمل کی ابتدا ہو چکی ہے۔ اگرچہ اس کی راہ میں ابھی بہت سی رکاوٹیں موجود ہیں جو ان شاء اللہ آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی جائیں گی۔

عصر حاضر کی سائنسی اور صنعتی ترقیات اور اس عہد کے بعض تاریخی واقعات اور تغیرات سے ظہور پذیر ہونے والے یہ چند مثبت اثرات ہیں جو اس وقت پوری دنیا میں عموماً اور عالم اسلام میں خصوصاً محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ عصر حاضر کی ان ترقیات اور تاریخی تغیرات نے انسانی معاشرہ پر عموماً اور عالم اسلام پر خصوصاً اپنے کچھ منفی (اور مضر) اثرات بھی ڈالے ہیں۔ ان پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنا ہمارے مقصد کے لیے ضروری اور مفید ہے۔

منفی اثرات - یورپ سے ذہنی مرعوبیت

علوم و فنون میں برتری نے یورپ کو سیاسی غلبہ دیا تو محکوم اور غلام قوموں کے ایک طبقے نے پوری طرز معاشرت اور ثقافت کو بھی سرمایہ افتخار اور معیار تہذیب سمجھ کر اختیار کرنا شروع کیا۔ اس "مغرب گزیدہ" طبقے کو یورپ اور امریکہ کی ساری ترقی کا راز ان کے علوم و فنون کی بجائے وہاں کے طرز معاشرت اور ثقافت میں ہی نظر آنے لگا۔

آج یورپ کی سیاسی برتری کا طلسم ٹوٹ جانے کے بعد بھی اور خود سیاسی مختاری اور آزادی حاصل کر چکنے کے بعد بھی یورپ کی سابقہ محکوم قومیں (یا کم از کم ان کا کھاتا پیتا طبقہ) بدستور یورپ کی چمک دمک سے مرعوب اور اہل یورپ کی معاشرتی ثقافت اور ذہنی غلامی میں مبتلا ہیں۔ مغربی طرز معاشرت، تعیش پسندی، تبرج (نمائش حسن) اور ان چیزوں کی خاطر بے پناہ حب جاہ و مال ان لوگوں کی نمایاں

Marfat.com

خصوصیات ہیں ۔" کالے صاحبوں " اور " کالی میموں " کا یہ طبقہ دین اور مذہب کو زندگی میں کوئی عملی اہمیت دینے کو تیار نہیں ۔ زیادہ سے زیادہ اسے انسان کا ذاتی معاملہ سمجھتا ہے ۔ بظاہر یہی طبقہ ہر جگہ " معزز " سمجھا جاتا ہے ۔ لیکن الحمدللہ کہ عوام کے دلوں میں ان کے لیے کوئی حقیقی " عزت " موجود نہیں ہے ۔

دین بیزاری

یورپ اور امریکہ کے صنعتی اور (فرانس ' امریکہ ' اور روس وغیرہ کے) سیاسی انقلابات کے نتیجے میں وہاں متضاد اور متعارض ' انتہا پسندانہ معاشی اور سیاسی افکار نے جنم لیا ہے۔ علمی اور فکری میدان میں یورپ نے اپنی سابقہ محکوم قوموں کو مادہ پرستی تشکیک اور لادینیت بلکہ دین بیزاری کی میراث بھی دی ہے جن پر تجدد پسندی ' روشن خیالی ' حریت فکر اور عقلیت کے خوبصورت لیبل لگالیے گئے ہیں ۔ ان افکار و خیالات سے متاثر اور اپنے دین کی صحیح تعلیمات سے بے خبر مسلمان عموماً ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے ۔ اسے اس نفسیاتی دلدل سے نکلنے کی طلب بھی ہے اور اس کو اس سے نکالنے کی ضرورت بھی ہے ۔

☆☆☆

Marfat.com

عصر حاضر میں سیرت طیبہ کا مطالعہ - اس کی ضرورت و اہمیت اور اس کی اشاعت کے ممکنات اور رجحانات

عصر حاضر کی صنعتی اور مشینی ترقی ' سائنسی اور علمی انداز فکر ' یورپ کے سیاسی غلبے اور مسیحیت کے فروغ کی مساعی نے اہل مشرق (جن میں مسلمانوں کی خاصی اکثریت ہے) کی زندگی کے تمام شعبوں پر اپنے مثبت اور منفی اثرات چھوڑتے ہیں ۔ سیاست معاشرت ' ثقافت ' تعلیم و تحقیق ' معیشت ' تجارت ' صنعت و حرفت ' زراعت اور ریاضت (کھیل) تک ہر چیز پر مغرب کے اثرات کی چھاپ ہے ۔ ہمارا موضوع اس وقت مطالعہ سیرت ہے جس کا زیادہ اور براہ راست تعلق تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف کے میدان سے ہے ۔ تاہم اس کے کچھ اور پہلو بھی ہیں ۔ آیئے ! ہم عصر حاضر میں مطالعہ سیرت طیبہ کی اہمیت اور اس کے مختلف رجحانات پر نظر ڈالتے ہیں۔

ماضی میں کتب سیرت کی کم یابی

آپ پہلے یونٹ میں کتب سیرت کی تدوین اور اہم کتب سیرت کے بارے میں پڑھ چکے ہیں ۔ طباعت کی ایجاد سے پہلے کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں ۔ اس لیے ان بڑی اور ضخیم کتب سیرت کی موجود تعداد بہت زیادہ نہیں ہوتی تھی اور وہ بھی قرآن کریم کے (برعکس کہ اس کی ضرورت ہر مسلمان مرد و عورت اور کم از کم ہر مسلمان کنبے کو ہوتی ہے) زیادہ تر بڑے کتب خانوں تک محدود رہتی تھی ۔ مسلمان جب سیاسی لحاظ سے یورپ کے ہاتھوں پٹ گئے تو وہ علمی لحاظ سے بھی لٹ گئے ۔ مسلمانوں کے بے شمار علمی خزانے (قلمی کتابیں) بعض دفعہ خود ان کی باہم خانہ جنگیوں کے نتیجے میں اور بعض دفعہ دشمن کے ہاتھوں آگ اور پانی (دریا) کی نذر ہوئے ۔ یورپ والے بھی مسلمانوں کے ملکوں سے حاصل ہو سکنے والی قلمی کتابیں خواہ لوٹ کر ' خواہ خرید کر اپنے ملکوں میں لے گئے اور یوں مسلمانوں کا بیشتر علمی سرمایہ ' جس میں کتب سیرت بھی

Marfat.com

شامل تھیں ، فرانس ، جرمنی ، برطانیہ ، ہالینڈ اور سپین وغیرہ کے کتب خانوں کی زینت بنا۔ اسی کے متعلق علامہ اقبال نے کہا تھا۔

مگر وہ علم کے موتی ، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

اگرچہ مسلمانوں کے اہم اور بڑے کتب خانے بھی ان کتابوں کے وجود سے یکسر خالی کبھی نہیں ہوئے ۔

سیرت طیبہ کے بارے میں قدیم یورپی علماء کا انداز فکر

یورپی مسیحی اقوام نے جب اپنی سائنسی اور صنعتی ترقی کی بدولت اپنی عالمی فتوحات کا دور شروع کیا تو اس وقت ان کے ذہنوں میں صلیبی جنگوں کا زہر کچھ زیادہ مقدار میں موجود تھا (اور ختم تو یہ اب تک بھی نہیں ہوا) اس وقت کے یورپی پادریوں اور مصنفوں نے تحریر و تقریر کے ذریعے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں عجیب و غریب خرافات پھیلائیں مثلاً (نقل کفر کفر نباشد) یہ " کہ محمدؐ ڈاکوؤں کے ایک گروہ کا سردار اور مشہور اونٹ چور تھا "۔

یا یہ کہ وہ رومانیہ کا ایک کارڈینل تھا (بڑا پادری اور پوپ کونسل کا رکن) ۔ وہ پوپ (بننے) کے لیے انتخاب ہار گیا اور یوں اس نے انتقامی طور پر مسیحیت کے مقابلے میں ایک نیا دین نکال لیا۔"

یا یہ کہ " وہ (محمدؐ) سونے کا ایک بت ہے جسے مسلمان پوجتے ہیں ۔"

یا یہ کہ " مسلمان سور اس لیے حرام سمجھتے ہیں کہ محمدؐ کی لاش کو سور کھا گئے تھے " وغیر ذلک من الخرافات ۔

الغرض اندلس (سپین) کے مسلمانوں کے خلاف اپنے ہم مذہبوں کے اندر شدید نفرت پیدا کرنے کے لئے ان مسیحی " علماء " نے ایسی ایسی یا وہ گوئی کہ کہ آج کے یورپی اہل علم کی گردنیں اپنے ان " بڑوں " کی اس قسم کی جاہلانہ اور معاندانہ

Marfat.com

خرافات کے سامنے شرم سے جھک جاتی ہیں۔

یورپی انداز فکر میں تبدیلی

عصر حاضر کے سائنسی اور علمی انداز فکر و تحقیق کا ایک اہم نتیجہ یہ بھی نکلا کہ آنحضرتؐ کے خلاف یورپی پادریوں کی اس قسم کی بکواس کا طلسم ٹوٹ گیا - ذہنی تعصّبات کے باوجود اب انداز تحریر علمی اور تحقیقی ہو گیا ہے اور کتابوں کے حوالے سے بات ہونے لگی ہے۔ اس وجہ سے اب ان کے مغالطوں کی تردید اور غلط فہمیوں کا ازالہ نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ خود یورپی مستشرقین اور مؤلفین میں متعدد ایسے آدمی، اس دور میں، سامنے آتے ہیں جنہوں نے آنحضرت ﷺ کے خلاف اپنے ہم مذہبوں کی خرافات کی تردید کی اور بڑی حد تک آنحضور ﷺ کے بارے میں انصاف اور حقیقت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ مثلاً کار لائل، ہجنز، اور امیل در منغم وغیرہ . اسی طرح مسلمانوں میں بھی سیرت طیبہ سے متعلق یورپی تعصّبات کا پردہ چاک کرنے کے لیے تالیفات سیرت کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔

عصر حاضر سے پہلے سیرت نبوی کے بارے میں یورپ کے مسیحی اور یہودی مؤلفین کا انداز مطلق جاہلانہ تھا۔ پھر اس عہد کے شروع میں سیاسی غلبے کے بھروسے پر یہ انداز جارحانہ بھی ہو گیا۔ اب یہ عموماً ایک مکارانہ غیر جانبداری کا رنگ اختیار کر گیا ہے (مثلاً منٹگمری واٹ اور کلیوم وغیرہ)- اہل علم مسلمان تو ان کو ہر رنگ میں پہچان لیتے ہیں - البتہ جدید تعلیم یافتہ اور یورپ سے مرعوب مسلمان نوجوان جو اپنے دین کی تاریخ اور اپنے نبیؐ کی سیرت سے بے خبر ہوتا ہے، وہ بآسانی ان کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ بھی مطالہ سیرت کا ایک محاذ ہے۔

سیرت نگاری میں عصر حاضر کا ایک بہت بڑا چیلنج

مسلمانوں کے سیاسی زوال کا دور ان کے علمی انحطاط کا دور بھی تھا۔ اگر ایک طرف دشمن نے بغض اور حسد کی بناء پر سیرتِ نبویؐ کو مسخ کر کے پیش کرنے کی

Marfat.com

کوشش کی، تو دوسری طرف عشق و محبت اور تعظیم و عقیدت کے نام پر خود مسلمانوں نے سیرت طیبہ میں ان امور کو داخل کر دیا جو عقلاً نقلاً مردود ہیں۔ اس کے نتیجے میں سیرت طیبہ کے اصل تابدار پہلو اور حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے نمایاں اور واجب الاتباع گوشے نظر انداز ہو گئے۔ اس افراط و تفریط سے بچ کر اور اس سے بچانے کے لئے سیرت طیبہ کا اس کے اصل مآخذ سے مگر جدید علمی اور تحقیقی انداز میں مطالعہ کرنا اور اس کی اشاعت کرنا مسلمان اہلِ علم کے لئے عصرِ حاضر کا ایک بہت بڑا چیلنج ہے اور الحمدللہ کہ گزشتہ صدی میں اس نقطہ نظر سے سیرتِ طیبہ پر مختلف زبانوں میں بہت اچھا کام ہوا ہے۔

نادر کتبِ سیرت کی طباعت و تراجم

یورپ کی سائنسی اور علمی ترقی کو وسعت دینے میں طباعت کی ایجاد اور اس کے فنی ارتقاء کا بھی بڑا دخل ہے۔ اہلِ یورپ نے اپنے اس دورِ عروج میں اقوامِ عالم اور خصوصاً مذاہبِ عالم کی زبانوں کی تعلیم میں بھی نام پیدا کیا۔ اس کے اسباب سیاسی بھی تھے اور علمی بھی۔ جرمنی، فرانس، ہالینڈ اور برطانیہ میں عربی زبان و ادب کی بھی کئی ماہرین پیدا ہوئے۔ اہل یورپ کی اس علمی خدمت کا اعتراف نہ کرنا بے انصافی بلکہ ناشکر گزاری ہو گی کہ ان لوگوں نے اپنے ان علمی خزانوں میں سے، جن کو وہ قلمی کتابوں کی صورت میں عالمِ اسلام سے ہی لے گئے تھے اہم کتابوں کو شائع کرنے کا کام بھی شروع کیا۔ ہماری بے شمار علمی کتابیں سب سے پہلے یورپ سے ہی شائع ہوئیں۔ ان میں اہم کتبِ سیرت بھی شامل تھیں مثلاً:

سیرت ابن ہشام کو سب سے پہلے ایک جرمن مستشرق فرڈی عینڈوسٹن فیلڈ نے گوٹنجن (جرمنی) سے ۱۲۷۶ھ/۱۸۵۸ء میں شائع کیا۔ اسی طرح طبقات ابن سعد کی تصحیح اور اشاعت کا کام چار جرمن مستشرقین نے کیا اور یہ کام ۱۹۰۵ء اور ۱۹۱۲ء کے درمیان قریباً آٹھ سال میں مکمل ہوا۔ بعد میں مصر اور شام سے بھی ان اور دیگر کتبِ

Marfat.com

سیرت کے اچھے اور بہتر ایڈیشن شائع ہوئے مگر ابتداء بہرحال یورپ سے ہوئی تھی۔

سیرت سے متعلق قدیم قلمی کتابوں کی تحقیق اور اشاعت اور پھر اس کے نتیجے میں اعلیٰ پایہ کی علمی اور تحقیقی کتب سیرت کی تالیف اور تصنیف کا کام عصرِ حاضر کی ایک نمایاں خصوصیت بھی ہے اور ضرورت بھی۔ اردو زبان میں سیرت پر اس پہلو سے اور اس پایے کی تحقیق کا بہترین نمونہ علامہ شبلیؒ اور سید سلیمان ندویؒ کی سیرت النبیؐ کی چھ جلدیں ہیں۔

عصرِ حاضر میں مطالعہ و اشاعتِ سیرت کا ایک خاص پہلو یہ بھی سامنے آیا ہے کہ اس دور میں سیرتِ طیبہ کی متعدد اور اہم کتابوں کے ترجمے بھی مختلف یورپی اور ایشیائی زبانوں میں ہو گئے ہیں۔ (مثلاً سیرت ابن ہشام کا انگریزی اور اردو ترجمہ)۔ ان تراجم کی اشاعت سے مطالعہ سیرت کو ایک وسعت حاصل ہو گئی ہے جو مسلمان یا غیر مسلم براہ راست عربی مصادر سے استفادہ نہیں کر سکتے' ان کے لئے تراجم بھی حصولِ علم کی حد تک بے حد فائدہ مند ہیں۔

اور یہ تراجم مصادر مآخذ اور کلاسیکل کتابوں تک محدود نہیں بلکہ دنیا کی کسی زبان میں بھی شائع شدہ اچھی کتب سیرت کے مسلمانوں کی دوسری زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں۔ مثلاً عربی سے فارسی اردو اور انگریزی میں - یا انگریزی فرانسیسی سے عربی' فارسی' اردو وغیرہ میں ۔ اصل مصادر و مآخذ سے علمی تحقیق کا مقام اپنی جگہ ہے' تاہم ان ترجموں کے ذریعے سے سیرتِ طیبہ کے بارے میں بنیادی معلومات کے علاوہ ان معلومات کو پیش کرنے یا ان سے نتائج نکالنے کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر نسبتاً کم علم لوگوں کے سامنے بھی آ جاتے ہیں۔

سیرتِ طیبہ کے مختلف پہلوؤں پر تالیفات کا رجحان

مشینی دور کی سہولتوں نے آج کے انسان کو وقت اور محنت کی بچت کا عادی بنا دیا ہے جس طرح وہ دنوں کا سفر گھنٹوں میں کرنا چاہتا ہے اور کر سکتا ہے - اسی طرح آج کے انسان کے پاس بڑی ضخیم کتابوں کے پڑھنے کا وقت نہیں ہے اور پھر سیرت

Marfat.com

پاک تو ایسا وسیع مضمون ہے کہ جس پر بالتفصیل لکھنے کے لئے کئی کئی جلدیں درکار ہیں۔

اس کے ساتھ دوسری طرف سائنسی اور علمی اندازِ تحقیق نے کسی بھی علم میں وسعت اور جامعیت سے زیادہ امتیازی ماہرانہ انفرادیت اور گہری خصوصی مہارت (Specialization) کو معیارِ کمال قرار دے لیا ہے۔ ڈاکٹری اور انجینئرنگ کو ہی لیجئے ' ایک ایک انسانی عضو اور ایک ایک مشنی پرزے کے لئے مخصوص ڈاکٹر اور مخصوص انجینئر درکار ہوتا ہے۔ سیرت نبویؐ کے مطالعے اور اس سے متعلق تالیفات اور نگارشات پر بھی ان دو نئے عصری رجحانات - یعنی "اختصار" اور "تخصص" کے اثرات مختلف سورتوں میں ظاہر ہوئے ہیں۔ پوری سیرت - واقعات اور تعلیمات - کی بجائے سیرتِ طیبہ کے کسی خاص گوشے ' خاص پہلو یا کسی واقعے اور کسی خاص "دورِ سیرت" کے واقعات کو موضوع بحث بنانا - آج کل کا ایک عام رجحان ہے۔ مثلاً آنحضرتؐ کی صرف فوجی زندگی کے متعلق فوجی ماہرین مستقل کتابیں لکھ چکے ہیں (جن میں پاکستان کے جنرل محمد اکبر ' عراق کے سابق وزیر دفاع محمود شیت خطاب اور شام کے جرنیل مصطفیٰ طلاس کی کتابیں قابلِ ذکر ہیں)۔ یہی نہیں بلکہ حضورؐ کے ایک ایک غزوہ کے تحقیقی مطالعے پر مبنی الگ الگ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مثلاً عہدِ نبویؐ کا نظامِ حکمرانی یا نظام تعلیم یا آپؐ کے بچپن ' آپؐ کی ازدواجی زندگی ' آپؐ کے قضا یا (مقدموں کے فیصلے) وغیرہ الگ الگ موضوعات پر مستقل تالیفات موجود ہیں۔ آپؐ کی سیرت کے کسی ایک پہلو پر مختلف علماء کے لکھے ہوئے "مقالاتِ سیرت" کی اشاعت بھی اسی رجحان کا مظہر ہے۔

علم (اور معلومات) کی اشاعت اور ترویج کے لئے ہمارے دور میں صحافت کا بھی بڑا کردار ہے۔ اخبارات اور رسائل مختلف موضوعات پر اپنے قارئین کے علم میں اضافہ کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ اخبارات و رسائل وقتاً فوقتاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے مختلف گوشوں پر مختصر مضامین شائع کر کے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات کے بہم پہنچانے کا کام سر انجام دیتے ہیں۔ پھر مسلمان ملکوں میں

Marfat.com

خصوصاً اس موجودہ صدی سے میلاد النبیؐ کے موقع پر اخبارات اور رسائل کے خاص نمبر شائع ہونے لگے ہیں۔ چونکہ یہ خاص شمارے کسی ایک آدمی کی تالیف نہیں ہوتے بلکہ مختلف موضوعاتِ سیرت پر مختلف آدمیوں کی تحریریں ہوتی ہیں، اس لئے اس میں تنوع سے دلچسپی بھی برقرار رہتی ہے۔

اخبارات و رسائل کے عید میلاد النبیؐ نمبر، پیغمبرؐ نمبر، رسول نمبرؐ، تذکرۂ جمیل نمبر، میلاد نمبر، سیرت نمبر، رحمۃللعالمین نمبر، ختم نبوت نمبر وغیرہ وغیرہ ناموں سے شائع ہونے والے خاص شمارے عصرِ حاضر میں مطالعہ سیرت کا ایک اہم ذریعہ بھی ہیں اور اس دور کی سیرت نگاری کی ایک خصوصیت بھی۔

سیرت کانفرنسیں

علوم و فنون کی اشاعت کے سمعی و بصری ذرائع کی ترقی اور وسائل سفر کی آسانیوں نے اب ماہرین کی کانفرنسوں، سیمیناروں اور مجالسِ مذاکرہ کا انعقاد ضروری بھی بنا دیا ہے اور آسان بھی۔ اب ایک نہیں، مختلف شہروں، علاقوں بلکہ ملکوں کے نامور ماہرین بھی بیک وقت کسی ایک موضوع کے مختلف گوشوں پر اپنی عالمانہ تحقیق پیش کر سکتے ہیں۔ اب سیرت کانفرنس محض "محفل میلاد" نہیں رہیں بلکہ ان میں علم اور تخصص کا رنگ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ تعلیمی اداروں، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں، شہروں کی مساجد اور دینی مدارس میں، ثقافتی اور علمی مراکز میں جلسہ ہائے سیرت کے علاوہ اب تو (پاکستان میں) صوبائی اور قومی سطح تک سیرت کانفرنسوں کا سالانہ بلکہ کبھی کبھی کسی بین الاقوامی سیرت کانفرنس کا انعقاد (جیسا کہ ۱۴۰۶ھ کی اسلام آباد سیرت کانفرنس) - یہ سب مطالعہ سیرت طیبہ کی ترویج کا ایک نہایت عمدہ ذریعہ بھی ہیں اور اس کا مظہر بھی - ایسی کانفرنسوں کے اختتام کے بعد ان میں پڑھے گئے یا پیش کئے گئے مقالات کی کتابی صورت میں اشاعت سے کانفرنس میں شرکت نہ کر سکنے والوں کے لئے مطالعہ سیرت کا بہترین اور عصری ضروریات کا مواد مہیا ہوتا ہے۔ مطالعہ سیرت کا یہ

Marfat.com

انداز بھی ہمارے اس دور کی خصوصیات میں سے ہے اور یہ عصر حاضر کی سائنسی و صنعتی ترقی کا مرہون منت بھی ہے اور اس کا ایک اچھا استعمال بھی۔

بچوں کے لئے کتبِ سیرت

تعلیم کی عام اشاعت اور طباعت کی سہولتوں نے اب بچوں کے لئے الگ کتب اور الگ رسائل کی طباعت و اشاعت کو ایک مستقل کاروبار بنا دیا ہے۔ بچوں کے لئے کتابیں اور رسائل آج کل کی کتابی صنعت اور جدید فن تعلیم و تربیت کا ایک نہایت اہم حصہ ہیں۔ بچوں کے لئے سیرتِ طیبہ پر مشتمل ایسے کتابچے اور حکایات کے مجموعے جو بلحاظ زبان بچوں کے لئے قابلِ فہم اور بلحاظ حسنِ طباعت بچوں کے لئے جاذبِ توجہ اور دلکش ہوں' یہ بھی ہمارے زمانے کی ایک ایسی خصوصیت ہے جس کا غالباً پہلے وجود نہ تھا۔ پاکستان میں اگرچہ ناشرین نے اس طرف کماحقہ توجہ نہیں دی' تاہم بہت کچھ ملنے لگا ہے۔ حکومت پاکستان بچوں کے لئے کتبِ سیرت کی تالیف اور اشاعت کی حوصلہ افزائی بھی کر رہی ہے۔

کتابیاتِ سیرت

مختلف علوم و فنون پر لکھی گئی کتابوں کے ذکر (کتابیات) پر مشتمل کتابوں کی تالیف کا رواج اگرچہ مسلمانوں کے ہاں تو آج سے ہزار سال پہلے شروع ہو گیا تھا' تاہم صرف کتب سیرت پر توجہ دے کر سیرت سے متعلق مستقل تالیفات - یعنی صرف کتابیاتِ سیرت یا فہرست کتبِ سیرت کی شکل نہیں دی گئی تھی۔

ہمارے زمانے میں اب اس اہم کام پر توجہ دی جانے لگی ہے اور سیرتِ پاک پر دنیا کی مختلف زبانوں میں لکھی گئی کتابوں کی کچھ فہرستیں الگ اور مستقل کتابوں کی شکل میں شائع کی گئی ہیں۔

سیرت طیبہ پر دنیا بھی کی مختلف زبانوں میں اب تک جو کتابیں لکھی جا چکی ہیں ان کا شمار بھی کارِ دشوار ہے۔ آپ پہلے پڑھ آئے ہیں کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے اقوام

Marfat.com

متحدہ کے ایک ادارے کی طرف سے لئے گئے جائزے کے مطابق جتنی کتابیں پیغمبر اسلامؐ کے متعلق لکھی گئی ہیں۔ اس کا عشرِ عشیر یعنی دسواں بلکہ اس سے کم حصہ بھی دنیا کی کسی دوسری شخصیت کے بارے میں نہیں لکھا گیا۔ کتابوں کی فہرست کے ساتھ اگر سیرت طیبہ پر ان مقالات اور مضامین کا بھی ایک اشاریہ (انڈیکس) تیار کیا جائے جو دنیا کے اخبارات اور رسائل میں شائع ہوئے ہیں' تو یہ غالباً دنیا کی سب سے بڑی کتاب کتابیات بن جائے مگر ایسی کتاب کی تیاری کسی ایک آدمی تو کیا ایک حکومت کے بس کی چیز بھی نہیں ہے۔ اس کے مختلف ملکوں اور مختلف زبانوں کے علماء کے باہمی تعاون کی ضرورت ہو گی۔

نمائش کتب سیرت

عصرِ حاضر میں کسی علم یا فن سے متعلق اشیاء یا کتب وغیرہ کی "نمائش" بھی معلومات میں اضافے کا باعث اور مزید مطالعے کے لئے محرک ثابت ہوتی ہیں۔ پاکستان میں ثقافتی اور تعلیمی اداروں (مثلاً کالجوں) کی سطح پر اور اب تو گزشتہ دو برس سے حکومت کے زیرِ اہتمام قومی بلکہ بین الاقوامی سطح کی "نمائش کتب سیرتؐ" منعقد ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ اس قسم کی نمائشیں اہل علم اور عوام' سب کے لئے یکساں مفید اور نفع بخش ثابت ہوتی ہیں۔ اگر اس قسم کی نمائش میں پیش کردہ کتبِ سیرت کی فہرست بھی شائع کر دی جائے تو یہ سیرت پر کام کرنے والوں کے لئے ایک بہترین "کتابیاتِ سیرت" کا کام دے سکتی ہے۔

دورِ حاضر کی مشکلات کا حل

مطالعۂ سیرتِ طیبہ کے یہ چند انداز اور کچھ ممکنات اور نئے رجحانات ہیں جو ہمارے زمانے کی مشینی و صنعتی ترقی اور اس کے نتائج و خصوصیات سے وجود میں آئے ہیں اور جن کا ہم نے گزشتہ صفحات میں کچھ خاکہ اور مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔

اس کے ساتھ آخر پر یہ بات بھی خصوصاً قابلِ توجہ ہے کہ آج انسان مسلمان

Marfat.com

ہو یا غیر مسلمان - ایک طرف تو متضاد و متعارض انتہا پسندانہ سیاسی اور معاشی افکار مثلاً سرمایہ داریت اور اشتراکیت ' قومیت اور جمہوریت وغیرہ کے درمیان ذہنی خلفشار کا شکار ہو رہا ہے۔ دوسری طرف مشینی اور صنعتی آسائشوں نے اسے مادی لذت کا پرستار بنا دیا ہے۔ تیسری طرف بڑی طاقتوں کے تباہ کن اسلحہ اور اپنی اپنی طاقت کے نشے نے پوری دنیا کو تباہی کے دہانے پر کھڑا کر رکھا ہے اور ان سب چیزوں نے مل کر آج کے انسان کو ذہنی سکون اور قلبی اطمینان سے محروم کر رکھا ہے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات اور آپؐ کی عملی سیرت کے مطالعے میں ان تمام عوارض کا علاج اور انسان کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کا حل موجود ہے۔ آج دنیا جس امن و سکون اور نجات و سلامتی کے حصول کے لئے مضطرب ہے ' وہ اسلام میں - قرآن کے پیغام اور صاحبِ قرآنؐ کے عملی نمونے میں - موجود ہے۔

جس مسلمان کو نہ صرف خود اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو سمجھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی ضرورت ہے بلکہ انکا یہ فرض ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور ان تعلیمات کے عملی نمونے - یعنی سیرت النبیؐ کو دنیا کے سامنے پیش کریں۔ انگریزی کے مشہور نوبل انعام یافتہ ادیب و نقاد جارج برنارڈ شا کے بقول: محمدؐ کو انسانیت کا نجات دہندہ کہنا چاہیے۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر آج کی دنیا کی لیڈری اور رہنمائی محمدؐ کے ہاتھ میں ہوتی تو وہ ضرور دنیا کو اس کی مشکلات سے نکال کر امن و سلامتی سے دو چار کر دیتے۔ صرف یہی نہیں کہ ماضی اور حال میں محمدؐ جیسے کامل انسان کی مثال نہیں ملتی بلکہ مستقبل میں بھی اس قسم کے انسان کا تصور دشوار ہے"۔

دنیا کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام اور عملی کام سے متعارف ہونے کی اور متعارف کرانے کی ضرورت ہے۔ اب یہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے تمام وسائل کے ساتھ اور جدید ترین علمی و تحقیقی اسلوب میں دنیا کو سیرتِ رسولؐ سے روشناس

Marfat.com

تھے۔ قرآن سن کر یا نبیؐ کی سیرت دیکھ کر - آج بھی صحیح اور حقیقی اسلام کو سمجھنے اور دنیا کو اسلام کا اصلی روپ دکھانے کے لئے - ان ہی دو چیزوں اور صرف ان ہی دو چیزوں - قرآن اور سنت (سیرت) - پر انحصار کافی بھی ہے اور ضروری بھی۔

☆☆☆

Marfat.com

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ

مضامینِ قرآن

قلمی تخلیقات

پروفیسر حافظ احمد یارؒ

ترتیب و تدوین

ڈاکٹر جمیلہ شوکت

الائیڈ بک سنٹر

34- اردو بازار- لاہور

Marfat.com